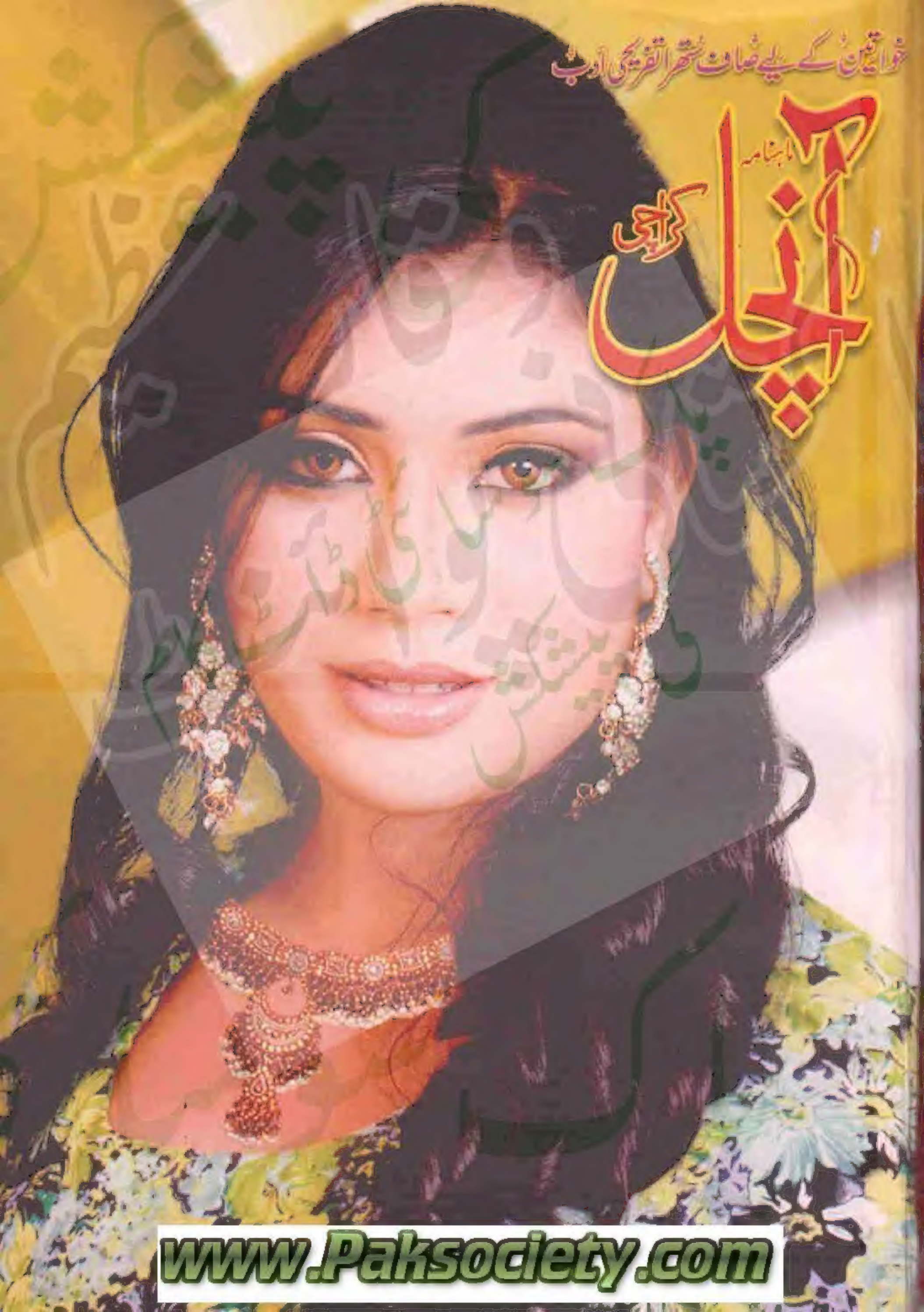


خواتین کے لیے صاف ستھرا قرمزی آؤٹ

پہلا کراچی



www.Paksociety.com



سرورق: ناز چوہدری... آرائش: ماہ روز بیونی پارلر... عکاسی: امجد صدیقی

مستقل سلسلے

234	جویریہ طاہر	213	یادگار لمحے	حاجی مسائل کا حل	حافظ شبیر احمد
238	شہلا عامر	217	آئینہ	آپ کی شخصیت	ایس صدیقی
245	ہما احمد	219	دوست کا پیغام آئے	آپ کی صحت	ہومیوڈاکٹر ہاشم مرزا
250	زہرہ جیس	223	آپ کی پسند	دش مقابلہ	طلعت آغاز
252	شائلہ کاشف	226	ہم سے پوچھے	بیونی گائیڈ	روبین احمد
255	حناء احمد	228	کام کی باتیں	غزلیں نظمیں	ایمان وقار
257	لبابہ احمد	232	تندرستی نعمت	بیاض دل	میمونہ تاج

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ انجیل پوسٹ بک نمبر 75 کراچی 74200 فون نمبرز 021-35620771/2

فیکس 021-35620773 کے لیے مطبوعات نے افق پبلی کیشنز پرائیویٹ لیمیٹڈ



ابتداء

10	مدیر	سرگوشیاں
11	حکیم خان حکیم	حمد و نعت
12	مدیر	درجہ اول آس

دانش کلا

17	مشتاق احمد قریشی	شیطان کی حقیقت قرآن کی روشنی میں
----	------------------	----------------------------------

یادگار محنت جانے

42	سیر اشرف طور	ذروں موسم کے دکھ
----	--------------	------------------

21	ملیحہ احمد	فرحت آرا کے نام
----	------------	-----------------

سورے

98	سلمیٰ فہیم گل	ایک اور عنایت
----	---------------	---------------

37	انتظار کا موسم	آپنل کے ہمراہ
182	نسیم ارشد	ادارہ

سلسلہ واقعات

افسانہ

144	صبا جاوید	76	ایک لمحہ آگہی کا	اقرا صغیر احمد	بھگی پلکوں پر
152	جویریہ سلیم	120	نوائے سحر	عشنا کوثر سردار	اور کچھ خواب
204	اریشہ غزل	160	صبا ٹھہر جائے	نانیہ کنول نازی	پتھروں کی پلکوں پر

پبلشر مشتاق احمد پرنٹرز جمیل حسن مطبوعہ امین حسن پرنٹنگ پرس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

دفتر کا پتہ: 7-منیر چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تم اس وقت تک جنت میں نہیں جاسکتے جب تک مومن نہ ہو اور اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے جب تک آپس میں ایک دوسرے سے محبت نہ ہو اور کیا میں تمہیں ایک ایسا طریقہ نہ بتاؤں کہ اس پر عمل کرنے سے تم میں باہمی محبت پیدا ہو؟ (وہ طریقہ یہ ہے کہ تم ایک دوسرے کو سلام واضح طریقے سے کیا کرو۔“ (مسلم، ترمذی، غیب)

سلاطین

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
دسمبر ۲۰۱۱ء کا آنچل حاضر مطالعہ ہے۔

ذرا سی دیر دسمبر کی دھوپ میں بیٹھیں یہ فرصتیں ہمیں شاید نہ اگلے سال ملیں ماہ دسمبر ایک بار پھر اپنی حشر سامانیوں کے ساتھ آن موجود ہے۔ اس ماہ سے مجوزی وہ یادیں اور واقعات ایک بار پھر نظر کے سامنے سے گزر رہے ہیں جیسے کہ یہ سب ابھی ابھی رونما ہوئے ہوں۔ فریضہ حج اور سنت ابراہیمی سے یہ حسن و خوبی نمٹ جانے کے بعد اب نئے ہجری اور عیسوی سال کی آمد آمد ہے۔ ہم امت مسلمہ اپنی اقدار کو تہہ کر کے کہیں اونچے طاقتوں میں رکھ کر بھول گئے ہیں اور غیر مسلموں کے وہ تمام طور طریقے اپنانے میں فخر محسوس کر رہے ہیں جو ہمارے لیے ممنوع ہیں۔ سبھی تو ہمارا رب ہم سے ناراض و خفا ہے جو اپنے غضب سے ڈرانے کے لیے چھوٹی چھوٹی آزمائشوں میں ہماری قوم کو مبتلا کر رہا ہے مگر ہم ہیں کہ نہ کچھ سمجھ رہے ہیں اور نہ اپنی ڈگر سے ہٹنے کو تیار ہیں۔ اس وقت صورت حال اور جید علماء کرام کے مطابق پوری قوم کو اجتماعی توبہ و استغفار کی ضرورت ہے مگر ہم ہیں کہ ہمارے کان پر جوں تک نہیں رینگ رہی ہے۔ خدا را سوچیں! جاگیں اور اپنے رب کو راضی کریں۔

سال کا اختتام ہے۔ ہم ان تمام قلم کار بہنوں اور تمام آنچل فیملی اور قارئین کرام کے تہہ دل سے مشکور ہیں جن کی آراء اور قلمی تعاون سے ہم نے آنچل کو اسی کے بام و عروج پر قائم رکھا ہوا ہے جس پر فخرت آرا چھوڑ کر گئی تھیں اور یہ سب آپ سب کے تعاون اور مشاورت کے بغیر ناممکن تھا اسی طرح ہم آئندہ بھی تمام قلم کار بہنوں اور قارئین کرام سے بھرپور تعاون و مشاورت کی امید رکھتے ہیں۔

﴿اس ماہ کے ستارے﴾

- ☆ ایک اور عنایت
- ☆ ایک لمحہ آگہی کا
- ☆ نوائے سحر
- ☆ انتظار کا موسم
- ☆ صبا ٹھہر جائے
- ☆ اگلے ماہ تک کے لیے اللہ حافظ۔
- ☆ سگنی فہیم گل اپنی ایک نئی عنایت کے ساتھ حاضر ہیں۔
- ☆ صبا جاوید لکھنوی سے روشناس کرا رہی ہیں۔
- ☆ جویریہ سلیم اپنی پہلی کاوش کے ہمراہ شرکت کر رہی ہیں۔
- ☆ نسیم ارشد پہلی بار انتظار کا موسم لے کر حاضر ہوئی ہیں۔
- ☆ اریشہ غزل طویل عرصے کے بعد ایک بار پھر شریک محفل ہیں۔

دعا گو

قیصر آرا

حکیم خان

نعتیں

وہ جس کو نورِ نظر سے نواز دیتا ہے

اُسی کو کسبِ ہنر سے نواز دیتا ہے

کبھی وہ شب کی سیاہی میں قید رکھتا ہے

کبھی وہ رنگِ سحر سے نواز دیتا ہے

کسی کا وقت گزرتا ہے آزمائش میں

کسی کو لعل و گہر سے نواز دیتا ہے

جو پور ہو کے بھی کرتا نہیں تھکن محسوس

اُسے وہ اذنِ سفر سے نواز دیتا ہے

طلب میں اُس کی جو کرتا ہے روز و شب محنت

اُسے ضرور ثمر سے نواز دیتا ہے

اُسی کے ہاتھ ہے سب کچھ جسے وہ چاہے حکیم

کمالِ علم و ہنر سے نواز دیتا ہے

اداس چہرے پہ اپنے نکھار آجائے

نظر جب آئے وہ چہرہ قرار آجائے

نگاہ اٹھا میں محبت سے جس طرف آقا ﷺ

خزاں رسیدہ چمن میں بہار آجائے

تمام عمر اسیری میں کاٹ دے اُن ﷺ کی

درِ رسول ﷺ پہ جو ایک بار آجائے

نواز دیں اُسے دنیا کی وہ شہنشاہی

پناہ میں کوئی گر خاکسار آجائے

ذرا سی دیر میں اُس کے گناہ دھل جائیں

زہے نصیب! کوئی اشک بار آجائے

ادب سے اپنی نگاہیں حکیم جھک جائیں

جب اپنے سامنے اُن ﷺ کا دیار آجائے

(حکیم خان حکیم)

انعم خان..... ہری پور ہزارہ

جہنڈا بردار جیتی! جیتی رہو خوش رہو۔ اتنی مایوسی اچھی نہیں ہوتی۔ فرحت آیا سے آپ کی محبت دیگانگت سے ہم واقف ہیں۔ مگر آنجل ان کا لگایا ہوا وہ شجر ہے جس کی ہم سب نے مل کر آبیاری کرنی ہے۔ لہذا لکھنا چھوڑنے کا آپ سوچے بھی نہیں..... آپ بہتر کھیتی ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ آنجل کی مصنفات میں بہترین اضافہ ثابت ہوں گی۔ ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ ”کنواری بے چاری“ شائع ہو جائے گی۔ مگر کچھ انتظار کے بعد امید ہے اب آپ کی ناراضگی دور ہو جائے گی۔

راحت وفا..... ملتان

عزیزی راحت! خوش رہو۔ آنجل سے آپ کی دیرینہ رفاقت سے ہم خوب واقف ہیں۔ آنجل کے صفحات آپ جیسی مصنفات کے سبب ہی چمکتے دیکتے ہیں۔ دعاؤں کے لیے جزاک اللہ۔ امید ہے خلوص و محبت کا یہ سفر یوں ہی جاری رہے گا۔

حمیرا نگاہ..... منڈی بھٹو الدین

حمیرا ڈیر! سلامت رہو۔ فرحت آپا کے لیے آپ کے جذبات قابل قدر ہیں۔ ان کی خاطر متواتر دعاؤں کے سلسلے پر اللہ آپ کو جزائے خیر

دے آمین۔ آپ کا تازہ ترین ناول مل گیا ہے مزید کے لیے پوچھنے کی کیوں ضرورت پیش آئی؟ آپ اچھا لکھتی ہیں اور اچھی تحریروں کے ہم خود دل سے منتظر رہتے ہیں۔ گزشتہ ناول موضوعاتی ہے۔ لہذا مارچ میں امید رکھ سکتی ہیں۔ یہ جان کر از حد خوش ہوئی کہ آپ پیا کے دیس سدھار چکی ہیں۔ بے حد مبارک باد۔ اللہ تعالیٰ آپ کو زندگی کے اس نئے سفر میں کامیابی و کامرانی عطا فرمائے آمین ثم آمین۔

عالیہ حرا..... کراچی

عالیہ! سدا خوش رہو۔ آپ کے فرائض منصبی اور گھریلو مصروفیات کی بابت ہمیں خوب اندازہ ہے۔ رہی لوڈ شیڈنگ تو اس سے تو ہر خاص و عام عاجز ہے۔ پھر آپ سے کیا شکوہ۔ ان تمام مصروفیات میں آپ آنجل کے لیے وقت نکالتی ہیں تو یہ آپ کی اس سے محبت کا ثبوت ہے۔ تازہ ترین ناول مل گیا ہے۔ ابھی پڑھا نہیں گیا۔ آپ جیسی دل کش مصنفات آنجل کا حسن ہیں۔ اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو۔ آمین

سلمیٰ اکبر شیرازی..... اوچ شریف

سلمیٰ! جیتی رہو۔ فرحت آپا کے لیے ہمارا اور آپ کا دکھ یکساں ہے۔ مگر رب کی مشیت پر سوائے صبر کے کوئی چارہ نہیں۔ البتہ ہم آپ کی امیدوں پر پورا اترنے کی کوشش ضرور کریں گے۔ آپ سب بہنیں ہماری اپنی ہو ہم سے جو رشتہ بنائیں ہمیں دل و جان سے منظور ہے۔ جان کر

خوشی ہوئی کہ آپ ایم اے اردو کا ارادہ رکھتی ہیں۔ ہم آپ کی کامیابی کے لیے صدق دل سے دعا گو ہیں۔ اللہ آپ کو زندگی کے ہر میدان میں ہر امتحان میں کامیابی و سرفرازی عطا فرمائے۔ آمین

ام ثمامہ..... سندھ

ام ثمامہ! سلامت رہو۔ آپ کے دونوں افسانے مل گئے ہیں۔ ان شاء اللہ باری آنے پر ضرور شامل اشاعت ہوں گے۔ سیلاب کی تباہ کاریوں کے بعد آپ کو درپیش مسائل کا ہمیں خوب اندازہ ہے۔ دعا ہے رب کریم سے کہ آپ سب شہریوں پر رحمت خاص نازل فرمائے۔ زندگی تو خیر اپنی ڈگر پر لوٹ ہی آئے گی مگر جو جانی نقصان ہوا۔ اس کا ازالہ ناممکن ہے۔ ہم صدق دل سے آپ سب کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ صبر کا دامن تھامے رکھیں اور یہ یاد رکھیں کہ اللہ پاک اپنے نیک بندوں کو ہی آزمائش کے لیے منتخب کرتا ہے۔ آپ کی خالہ کے لیے خصوصی دعائے مغفرت کی تمام قارئین سے التماس ہے۔ گرامر کی غلطیوں کی بابت بے فکر رہیں۔ اس ضمن میں کاٹ چھانٹ اور درستگی ہمارا ذمہ ہے۔

تحسین انجم انصاری..... اسلام آباد

تحسین! سدا سلامت رہو۔ فرحت آپا کے لیے آپ کے جذبات قابل قدر ہیں اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اپنی دعاؤں میں ان کا خاص الحاح حصہ رکھنا۔ آپ کا افسانہ ”نئی کوئٹہ“ نظر سے گزرا تھا جو فرحت آپا کے لیے آپ کی محبت کا

مظہر ہے۔ فرحت آپا کی خواہش ”الفت دیوتا“ کے نام سے ناول لکھ کر آپ نے پوری کی ہے۔ تو ہم بھی آپ کی اس خواہش کو سر آنکھوں پر رکھتے ہیں مگر اس کے لیے آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔ آپ جیسی کہنہ مشق مصنفات کا قلمی تعاون اور آنجل سے دلی لگاؤ ہمارے سفر کو سہل اور رواں رکھنے میں معاون و مددگار ثابت ہوتا ہے۔ اللہ آپ کو زندگی کے ہر قدم پر کامیابی و کامرانی عطا فرمائے۔ آمین

مہوش ملک..... فیصل آباد

مہوش! جیتی رہو! آپ کی قلمی کاوش ”روشنی“ موصول ہو کر انتخاب کی سند پا چکی ہے۔ عنقریب شامل اشاعت ہوگی اگرچہ آپ نے موضوع بہت حساس چنا ہے نو آموز مصنفات کو مذہبی موضوعات پر قلم اٹھانے سے گریز ہی کرنا چاہیے۔ امید ہے تحریر کی کاٹ چھانٹ آپ کو بہت کچھ سیکھنے میں مدد دے گی۔ اپنا مطالعہ وسیع رکھیں۔ ہمیں امید ہے کہ آپ کا نام مستقبل کی بہترین لکھاریوں میں شامل ہوگا۔

شمع حفیظ..... کراچی

شمع ڈیر! آنجل میں خوش آمدید اور آنجل مصنفات کی صف میں شامل ہونے پر مبارک باد۔ یقیناً آپ کا نام کسی لکھنے اور پڑھنے والے کے لیے نیا نہیں ہے۔ آپ ایک کہنہ مشق لکھاری ہیں۔ ان شاء اللہ جلد آپ کی تحریر شامل اشاعت کی جائے گی۔ آپ کی طبیعت کے بارے میں دلی دعا ہے

کہ اللہ پاک آپ کو صحت کاملہ عطا فرمائے آمین۔
تعریف کے لیے بے حد شکریہ۔ آپ کا سلام ان
سطور کے ذریعے تمام مصنفات و قارئین بہنوں
تک پہنچایا جا رہا ہے۔ امید ہے آنچل کے لیے
آپ ایک خوش گوار اضافہ ثابت ہوں گی۔ دعاؤں
کے لیے اللہ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین

فصیحہ آصف خان ملتان

عزیزی فصیحہ! خوش رہو! آباد رہو۔ آپ کی
طویل غیر حاضری کے بعد آمد پر دل شاد ہوا اور
دعاؤں کے لیے اللہ پاک آپ کو جزائے خیر دے
آمین۔ آنچل کی پسندیدگی پر تہہ دل سے مشکور
ہیں۔ آپ جیسے مخلص چاہنے والوں کے طفیل ہی
آنچل کا معیار قائم و دائم ہے۔ ناولٹ کا انتظار
رہے گا۔ اللہ آپ کی تمام جائز دلی مرادیں پوری
کرے۔ آمین

مصباح کنول مقام نامعلوم

مصباح ڈیر! خوش رہو! سب سے پہلے تو ایک
بات اچھی طرح جان لیں کہ تمام مصنفات و
قارئین ہمیں دل سے عزیز ہیں۔ آنچل کے لیے
موصول ہونے والی ہر تحریر کا بغور مطالعہ کرنے کے
بعد ہی اسے منتخب یا رد کیا جاتا ہے۔ بات اگر معیار
کی نہ ہو تو یقین رکھیں کہ ہم کبھی بھی کسی لکھاری کو رد
نہ کریں کیونکہ کسی بھی قاری یا مصنفہ کی دل شکنی کے
ہم قائل نہیں ہیں۔ اسی لیے کالم کے آخر میں نا
قابل اشاعت کی فہرست میں مصنفہ کا نام عیاں
نہیں کیا جاتا ہے۔ آپ نے از خود اصلاح کی

خاطر اپنی تحریر رد ہونے کی صورت میں غلطیوں کی
نشاندہی کے لیے کہا ہے۔ تو جواب دیا جا رہا ہے۔
نوآزموز مصنفات کو ہم اسی لیے پہلے افسانہ پر طبع
آزمائی کے لیے کہتے ہیں۔ ناولٹ یا ناول رد
ہونے کی صورت میں ان کی زیادہ محنت کا نقصان
نہ ہو۔ آپ کو بہت زیادہ محنت وسیع مطالعہ و مشاہدہ
کی ضرورت ہے۔ زیر نظر تحریر میں کچا پن ہے۔
موضوع بہت پرانا ہے۔ کزنز کا انبار ان کے
درمیان محبت و رنجش پر کئی بار لکھا جا چکا ہے۔
ناولٹ میں کردار سازی کے ساتھ کہانی تشکیل دینی
پڑتی ہے اور کرداروں کا پس منظر اس کہانی میں
بیان کرنا پڑتا ہے۔ جب کہ آپ کی تحریر میں پس
منظر نہیں ہے۔ یہ ناول نگاری کی اسلوب کے
خلاف بات ہے۔ لفظ پختہ اور مکالمے مضبوط
ہونے چاہئیں۔ جن سے صورت حال واضح
ہو۔۔۔۔۔ تا پسندیدہ رشتے پر لڑکی کا گھر چھوڑنا قطعی نا
مناسب فعل ہے۔ اسے پرنٹ نہیں کیا جاسکتا۔
کہانی میں مرکزی کردار عموماً مثبت ہوا کرتا ہے۔
منفی ہو تو وہ مثبت کی جانب سفر ضرور کرتا ہے۔ تحریر
میں کمی بیشی یا اغلاط کے سبب مناسب رد و بدل
ضرور کیا جاتا ہے۔ مگر سرے سے ساری تحریر کو
تبدیل کر دینا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔ امید
ہے آپ کی تسلی ہوگئی ہوگی۔

شمع مسکان جام پور

شمع! سدا خوش رہو۔ آپ کی تحریر ”قربانی“
موصول ہوگئی ہے۔ موضوعاتی کہانیاں ایک ماہ قبل

تیار کر لی جاتی ہیں۔ لہذا آپ کا خیال درست ہے
کہ تاخیر ہوگئی ہے۔ گزشتہ افسانے کے بارے میں
”در جواب آں“ میں بتایا جا چکا ہے۔ شاید آپ کی
نظر سے نہیں گزرا۔ دیگر نگارشات یقیناً باری آنے
پر شائع ہوں گی۔ اس لیے صبر کا دامن تھامے
رکھیں۔ اگر آپ پہلے مختصر افسانہ پر طبع آزمائی
کریں تو بہتر ہے کیونکہ ہمارے خیال میں آپ
کو لکھنے کے لیے انتہائی مشق اور وسیع مطالعہ کی
ضرورت ہے۔ دعاؤں کے لیے جزاک اللہ۔

عابدہ نسیم چیچہ وطنی

عابدہ! سلامت رہو! آنچل کی پسندیدگی کا بے
حد شکریہ اور دعاؤں کے لیے جزاک اللہ۔ ناراضگی
کی دھمکی ٹھیک نہیں۔ آپ سب بہنیں ہمیں دل
سے عزیز ہیں۔ ہماری مجبوری ہے کہ آپ سب کا
خیال رکھنا ہے اور ہر معیاری چیز کو جگہ دینی ہے۔
لہذا آپ بھی معیار کا خاص خیال رکھیں اور باری کا
انتظار بھی کیا کریں۔ افسانہ ضرور بھیجیں۔ اس کے
لیے اجازت کی ضرورت نہیں۔ آنچل آپ کا اپنا
رسالہ ہے۔

سعیدہ نواز سلوی مقام نامعلوم

سعیدہ! جیتی رہو! پہلی بار شرکت پر خوش آمدید
آنچل کی پسندیدگی کا بے حد شکریہ۔ تحریر کے لیے
شرائط آپ کو ان صفحات کے آخر میں مل جائیں
گی۔ تحریر کی کاٹ چھانٹ اور درستگی کے لیے سطر
چھوڑنا لازمی ہوتا ہے۔ ورنہ مسودہ قابل قبول نہیں
ہوتا اور مصنفین کی محنت ضائع ہو جاتی ہے۔ افسانہ

مل گیا ہے۔ ابھی پڑھا نہیں گیا۔ مصنفات کی صف
میں شامل ہونے کے لیے مطالعہ وسیع رکھیں اور
پہلے افسانہ پر طبع آزمائی کریں۔ ماہنامہ آنچل میں
شائع ہونے والی تحاریر کا مناسب اعزاز یہ دیا جاتا
ہے۔ آپ بے فکر رہیں۔ لکھنے کے لیے اجازت کی
ضرورت نہیں آنچل آپ سب کا اپنا رسالہ ہے۔

مشترکہ جوابات

زہرہ عبدالحق! خوش آمدید۔ افسانہ مل گیا
ہے۔ ابھی پڑھا نہیں گیا۔ عائشہ نور محمد تک آپ کی
تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔
شہر بانو! سرگودھا۔ افسانہ معیاری رہا تو ضرور شائع
ہوگا۔ ابھی پڑھا نہیں گیا۔ یہی جواب حصہ راجا
گجرات کے لیے بھی ہے۔ رضوانہ محمد علی! نکانہ
صاحب۔ تعارف باری آنے پر شائع ہو جائے
گا۔ پاکیزہ سحر سکھر۔ آپ کا انداز تحریر بہتر ہے مگر
زیادتی ہر چیز کی بری ہوتی ہے۔ فلسفہ کمال کا ہوتا
مگر اس کے ساتھ موضوع کو بھرپور توجہ کے ساتھ
اٹھانا بھی پڑتا ہے۔ افسانے میں موضوع نہ ہو تو
افسانہ نہیں ہوتا۔ بس لفاظی بن کے رہ جاتا ہے۔
آپ کی دیگر تحاریر کی طرح ”نجانے کیوں“ میں
بھی یہی خامی ہے۔ نعت بھیج سکتی ہیں۔ میرب!
چوٹالہ۔ آنچل کی مستقل قاری ہونے کے باوجود
آپ نے نگارشات کے لیے سرخ قلم استعمال
کیا.....؟ اب ہم آپ کو کیا کہیں۔ سویرا فلک!
کراچی۔ آنچل میں خوش آمدید۔ دیگر پرچوں
میں آپ کی تحریریں بار بار ہا نظر سے گزری ہیں! امید

شیطان کی حقیقت

مؤلف: مشتاق احمد قریشی

دانش کدہ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

ترجمہ:- اور جب فیصلہ چکا دیا جائے گا تو شیطان کہے گا ”حقیقت تو یہ ہے کہ اللہ نے جو وعدے تم سے کئے تھے وہ سب سچ تھے اور میں نے جتنے وعدے کئے ان میں سے کوئی بھی پورا نہ کیا۔ میرا تم پر کوئی زور تھا ہی نہیں میں نے اس کے سوا کچھ نہیں کیا کہ اپنے راستے کی طرف تمہیں دعوت دی اور تم نے میری دعوت پر لبیک کہا۔ اب مجھے الزام نہ دو خود اپنے آپ کو ملامت کرو یہاں نہ میں تمہاری فریادری کر سکتا ہوں اور نہ تم میری فریادری کر سکتے ہو۔ اس سے پہلے جو تم نے مجھے اللہ کا شریک بنا رکھا تھا اس سے میں بری الذمہ ہوں ایسے ظالموں کے لئے دردناک عذاب کی سزا یقینی ہے۔ (ابراہیم ۲۲)

آیت مبارکہ میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے روزِ محشر کا نقشہ کھینچا ہے جب سب کی سب مخلوقات کو زندہ کر کے اللہ تعالیٰ کی عدالت میں پیش کیا جائے گا اور ہر ایک کا حساب ہو رہا ہوگا۔ جب راہ حق پر چلنے والے اہل ایمان کو جنت کی طرف بھیج دیا جائے گا تو اہل دوزخ کا حساب کتاب شروع ہوگا تب اللہ تبارک و تعالیٰ اہل دوزخ جنہوں نے اپنی دنیا کی زندگی اپنے حساب سے عیش و آرام میں شیطان کے بہکائے میں آ کر اس کی پیروی کرتے گزاری ہوگی دریافت کرے گا کہ تم نے راہ حق کیوں نہیں اپنائی جبکہ تمہیں ہر قسم کی ہدایت و رہنمائی پہنچا دی گئی تھی جیسا کہ اس سورہ کی آیت ۲۱ میں ارشاد باری ہے وہ جواب دیں گے اگر اللہ نے ہمیں نجات کی کوئی راہ دکھائی ہوتی تو ہم ضرور تمہیں دکھاتے اب تو سب یکساں ہے چاہے بے قراری کریں یا صبر دونوں ہی برابر ہیں ہمارے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ اہل جہنم آپس میں ہی باتیں کریں گے کہ جنتیوں کو جنت اس لئے ملی ہے کہ وہ اللہ کے سامنے روتے اور گڑ گڑاتے تھے۔ آؤ ہم بھی اللہ کی بارگاہ میں آہ و زاری کریں شاید اللہ ہمیں بھی معاف کر دے۔ پھر وہ خوب روئیں گے آہ و زاری کریں گے لیکن انہیں اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا پھر وہ باہم مشورہ کریں گے کہ جنتیوں کو جنت ان کے صبر کی وجہ سے ملی ہے آؤ ہم بھی صبر کرتے ہیں پھر وہ صبر کا بھرپور مظاہرہ کریں گے لیکن انہیں اس کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا پھر وہ سب کے سب کہیں گے اب ہم چاہے کچھ بھی کر لیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا اب چھٹکارے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ ان اہل دوزخ کی یہ گفتگو و مکالمے قرآن حکیم میں کئی جگہ بیان ہوئے ہیں۔ مثلاً سورہ مومن ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷

پیغمبروں کے ذریعے کئے تھے کہ نجات میرے پیغمبروں پر ایمان لانے میں ہے وہ حق تھے ان کے مقابلے میں میرے تمام وعدے تو سراسر دھوکہ اور فریب تھے میں نے تمہیں جو امیدیں دلائیں جن فائدوں کے لالچ تمہیں دیئے جن خوش نما توقعات کے جال میں تم کو پھنسا اور سب سے بڑھ کر تمہیں یہ یقین دلایا کہ اول تو آخرت کچھ نہیں ہے بس یہ دنیا ہی دنیا ہے وہ سب تو میرا ڈھکوسلا تھا اور یہ بھی کہ جب میں نے تمہیں سمجھایا کہ فلاں حضرت بڑے پکچھے ہوئے ہیں ان کی تصدیق سے تم صاف بچ نکلو گے بس ان کی خدمت میں نذر و نیاز کی رشوت پیش کرتے رہو پھر جو جی چاہے کرتے پھر تمہیں فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں حضرت جی ہیں نا نجات کا ذمہ ان کا ہے یہ ساری باتیں تو میرا وہ حربہ تھیں جن میں پھنسا کر میں نے تمہیں راہ حق سے ہٹایا میں نے تو تمہیں صرف مشورہ ہی دیا تھا عمل تو تم نے خود کیا تھا قصور تو سراسر تمہارا ہے کہ تم نے کیوں میری بات مانی۔

وہ اپنی صفائی میں کہے گا کیا تم یہ ثابت کر سکتے ہو کہ تم خود راہ راست پر چلنا چاہتے تھے اور میں نے زبردستی تمہارا ہاتھ پکڑ کر تمہیں راہ حق سے ہٹایا تو ضرور ثابت کرو پھر جو چاہو مجھے سزا دو میں مان لوں گا تم خود اگر چاہتے اور کوشش کرتے تو دعوت حق کو قبول کرتے میں نے تو صرف اتنا کیا ہے کہ حق کے مقابلے میں تمہیں باطل کی دعوت دی سچائی کے مقابلے میں جھوٹ و فریب کی طرف تمہیں بلایا، نیکی کے مقابلے میں بدی کی طرف تمہیں پکارا اس کی سزا مجھے ملی ہے میں بھی تمہارے ساتھ جہنم واصل ہو چکا ہوں لیکن تمہیں جو سزا ملی ہے اس کے ذمہ دار تم خود ہو اپنے غلط انتخاب اور اپنے اختیار کے غلط استعمال کی ذمہ داری تمہاری اپنی ہے۔ میری باتوں میں نہ کوئی دلیل تھی نہ ہی کوئی حجت۔ نہ میرا کوئی تم پر دباؤ تھا میری بے دلیل پکار کو تم نے مان لیا اور اللہ کے پیغمبروں کی دلیل و حجت سے بھرپور باتوں کو تم نے رد کیا تھا۔ سورۃ النساء آیت ۱۳۰ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ”شیطان ان سے وعدے کرتا اور آرزو میں دلاتا ہے لیکن شیطان کے یہ وعدے محض دھوکہ ہیں۔“

ترجمہ:- اور جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ تم آدم کو سجدہ کرو تو ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کیا وہ جنوں میں سے تھا اس نے اپنے پروردگار کی نافرمانی کی پھر بھی تم اسے اور اس کی اولاد کو مجھے چھوڑ کر اپنا دوست بنا رہے ہو؟ حالانکہ وہ تم سب کا دشمن ہے ایسے ظالموں کا کیا ہی برابر ہے۔ (الکھف: ۵۰)

آیت مبارکہ میں جہاں فرشتوں کا حکم الہی سے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کے بارے میں ذکر فرمایا گیا ہے وہیں اس بات کی خبر بھی دی جا رہی ہے کہ ابلیس فرشتوں میں سے نہیں بلکہ وہ جنوں میں سے تھا اس کا مطلب ہے کہ ابلیس جن تھا فرشتہ نہیں تھا چونکہ وہ فرشتوں کے ساتھ موجود تھا اس لئے وہ بھی اس حکم میں شامل تھا لیکن جن اللہ کی صاحب اختیار مخلوق ہیں اس لئے اس نے اپنے اختیار سے کام لے کر اللہ کی نافرمانی کی۔ آیت مبارکہ میں اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے ایسے تمام بندوں کو آگاہ فرما رہا ہے جو یہ جانتے بوجھتے ہوئے کہ ابلیس بارگاہ الہی کا مردود و لعین اور رائدہ درگاہ ہے اور اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں بھی بار بار ارشاد فرما رہا ہے کہ ابلیس تمہارا کھلا دشمن ہے اس لئے جو بھی اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر شیطان اور اس کی ذریت کو دوست بنائے گا یعنی احکام الہی سے انحراف کرے گا اور شیطان کی پیروی کرے گا وہ درحقیقت خود پر بڑا ہی ظلم کرے گا ایسے لوگوں کو اور اہل ایمان کو یہ اطلاع بھی دی جا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے نافرمان ظالموں کو ان کے برے اعمال کا بڑا ہی برابر دے گا اللہ تعالیٰ تو اپنے بندوں کی بہتری اور فلاح چاہتا ہے اس لئے اس نے بار بار ہر قوم قبیلے میں اپنی ہدایت و رہنمائی کے لئے اپنے پیغمبر بھیجے

تاکہ اس کے بندے باخبر رہیں کہ شیطان جس کی وہ پیروی کر رہے ہیں وہ نہ صرف ان کا دشمن ہے بلکہ وہ تو روز اول سے تمام انسانوں کے باپ حضرت آدم علیہ السلام کا بھی دشمن چلا آ رہا ہے انسان سے اس کی دشمنی میں کمی کے بجائے روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ اس سخت ترین تنبیہ اور ہدایت و تاکید کے باوجود بھی انسان اپنے اختیار سے اگر کام لے کر اللہ کی راہ نہ اپنائے اور احکام الہی پر عمل پیرا نہ ہو تو یقناً وہ خود اپنے آپ سے دشمنی کرے گا اور اللہ کے نزدیک اس کا شمار ظالموں میں ہوگا اور ظالموں کو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم اپنے رحم کے سائے سے بھی دور کر دیتا ہے اور روز آخرت انہیں ان کو بد اعمالی کی پوری پوری سزا ملے گی یہی نصیحت و خبر اس آیت مبارکہ میں دی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ جو بڑا ہی رحیم و کریم اور پروردگار ہے وہ اپنے بندوں پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا بلکہ جو لوگ خود اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں انہیں سمجھانے اور راہ راست پر لانے کیلئے قرآن حکیم میں ہر قسم کی ہدایت ارشاد فرمادی ہے جیسا کہ الکھف کی آیت ۵۴ میں ارشاد ہوا ہے۔

ترجمہ:- ہم نے اس قرآن میں ہر طریقے سے تمام کی تمام مثالیں لوگوں کو (سمجھانے) کیلئے بیان کر دی ہیں لیکن انسان سب سے زیادہ جھگڑالو ہے۔ (الکھف: ۵۴)

آیت مبارکہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ہم نے انسان کو حق کا راستہ سمجھانے کے لئے قرآن میں ہر وہ طریقہ استعمال کیا جس سے انسان کو سمجھایا جاسکتا ہے۔ یعنی وعظ تذکرہ امثال واقعات و دلائل و براہین اس کے علاوہ بھی انہیں بار بار اور مختلف انداز بیان سے سمجھایا گیا ہے یعنی جہاں تک دلیل و حجت کا تعلق ہے قرآن نے حق واضح کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی دل و دماغ کو متاثر کرنے کے جتنے موثر طریقے ممکن ہیں اختیار کئے گئے لیکن انسان سخت نادان اور جھگڑالو ہے اس لئے اس پر نہ تو وعظ و نصیحت کا اثر ہوتا ہے نہ ہی دلائل و براہین کا اور اگر انسان اس کے باوجود بھی نہ سمجھے اور اللہ کی اور اس کے احکام کی تکذیب و نافرمانی کرے تو پھر ان کے لئے اللہ کی وعید ہے کہ وہ اللہ کے عذاب کا انتظار کریں ایسے لوگ بغیر سزا کے سیدھے نہیں ہوتے یعنی جب کوئی شخص یا گروہ ذلیل و حجت اور تمام خیر خواہانہ نصیحت کے مقابلے میں جھگڑالو پن پر اتر آتا ہے اور انحراف کرتے ہوئے حق کا مقابلہ جھوٹ اور کفر و فریب سے کرنے لگتا ہے اور اپنے کړتوتوں کا برا انجام دیکھنے سے پہلے کسی کے سمجھانے سے اپنی غلطی ماننے پر تیار نہیں ہوتا تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے دل پر مہر لگا دیتے ہیں فقل چڑھا دیتے ہیں اور وہ ہلاکت کے گڑھے میں گرتے چلے جاتے ہیں۔

اللہ تبارک و تعالیٰ جو بڑا ہی رحیم و کریم ہے وہ اپنے تمام ہی بندوں سے بڑے رحم کا معاملہ فرماتا ہے بندہ چاہے کتنا ہی نافرمان کیوں نہ ہو اللہ تعالیٰ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ جس وقت کسی سے کوئی خطا کوئی قصور سرزد ہوا ہے اسی وقت پکڑ کر سزا دے ڈالے۔ وہ مالک و خالق جس کی شان کری می و رحیمی بے پناہ ہے وہ مجرموں کو پکڑنے میں جلد بازی سے کام نہیں لیتا مدتوں انہیں سنہلنے سدھرنے کا موقع دیتا رہتا ہے مگر سخت نادان ہیں وہ لوگ جو اللہ کی اس ذہیل اس کرم کو غلط سمجھتے ہیں اور یہ گمان کرتے ہیں کہ کچھ بھی کرتے رہو کچھ نہیں ہوگا۔ ان سے کبھی باز پرس نہیں ہوگی لیکن جب اس کو پکڑا جاتی ہے تو پھر انسان کو کوئی راستہ نہیں ملتا اللہ کی گرفت سے بچنے کا اور کوئی دوسرا ایسا راستہ ہے ہی نہیں جو کسی بندے کو اللہ کی پکڑ سے بچا سکے۔

ترجمہ:- پس وہ تمام کے تمام سب گمراہ لوگ جہنم میں اوندھے منہ ڈال دیئے جائیں گے۔ اور ابلیس کے

تمام کے تمام لشکر بھی وہاں آپس میں لڑتے جھگڑتے ہوئے کہیں گے۔ کہ قسم اللہ کی! یقیناً ہم تو کھلی غلطی پر تھے۔
(اشعر ۹۳-۹۷)

آیات مبارکہ میں ارشاد باری تعالیٰ کے ذریعے ایسے تمام لوگوں کو خبردار اور ہوشیار کیا جا رہا ہے جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت و بندگی چھوڑ کر دوسروں کی اطاعت و فرمانبرداری کرتے اور احکام الہی سے ان کے کہنے سے انحراف کرتے یا انہیں نظر انداز کرتے ہیں ان کے بارے میں اطلاع دی جا رہی ہے کہ نہ صرف ایسے تمام افراد جو لوگوں کو بہکاتے اور اللہ کی راہ سے ہٹاتے ہیں اور شیطان کی ذریت کا کردار ادا کرتے ہیں وہ تو جہنم رسید ہوں گے ہی ان کے ساتھ ان کی بات ماننے والے ان کی فرمانبرداری و اطاعت کرنے والے بھی جہنم میں داخل کر دیئے جائیں گے اور اس طرح اوپر تلے ڈال دیئے جائیں گے جیسے کوڑا کرکٹ ڈال دیا جاتا ہے۔

آیت مبارکہ میں ایسے تمام لوگوں کو ہدایت و نصیحت کی جا رہی ہے جو اللہ کو چھوڑ کر کسی بھی طرح اللہ کی نافرمانی کرتے اور کراتے ہیں ان کو حشر کی تصویر دکھا کر سمجھایا جا رہا ہے کہ صرف اطاعت الہی میں ہی تمہاری عافیت و بھلائی ہے اللہ کی راہ چھوڑ کر جو بھی راہ اختیار کرو گے وہ تمہیں صرف جہنم ہی میں لے جائے گی۔ اللہ کا تو ایک ہی سیدھا اور سچا راستہ ہے کہ احکام الہی پر ان طریقوں سے عمل پیرا ہو جاؤ جن کی تاکید و ہدایت اس کے آخری نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ہے۔ صرف اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا بتایا ہوا راستہ ہی انسان کو سیدھا جنت کے باغوں میں لے جاتا ہے اس کے علاوہ تمام راستے شیطان کے بنائے اور بتائے ہوئے ہیں انسان کو اپنے اختیار سے ہی ان بڑے اور جہنم کے راستوں سے بچنا اور سیدھے راستے پر چلنا ہے۔ آیات میں اللہ کے باغی اور سرکش لوگوں کی حالت زار کا ذکر کیا گیا ہے جو ابلیس کے بہکائے میں آ کر اور اپنی عقل ارادے سے کام نہ لے کر اپنے اختیار کا غلط استعمال کر کے شیطان کے بنائے ہوئے راستوں پر چلتے ہیں ان کے بارے میں بتایا جا رہا ہے کہ آخرت میں ان کا کیا حشر ہونے والا ہے۔ صاحب قاموس لکھتے ہیں کہ رکب اکب اور کبک سب کے معنی ہیں سر کے بل اوندھا کر کے نیچے پھینک دینا اور کبک کی ترکیب استعمال کرنے کا مطلب ہے کہ اہل دوزخ کو اس طرح سر کے بل پھینکا جائے گا کہ وہ لڑھکیاں کھاتے ہوئے نیچے جا گریں گے تمام جھوٹے معبود اور ان کے تمام پرستار اور ابلیس اور اس کے تمام معاون و مددگار کو دوزخ میں الٹا کر کے پھینک دیا جائے گا پھر وہاں ان میں آپس میں ہی ٹوک جھونک اور ایک دوسرے پہ الزام تراشی شروع ہو جائے گی۔ تب انہیں احساس ہوگا اور وہ اس کا اقرار بھی کریں گے کہ وہ کس قدر غلطی پر تھے اور اللہ کی اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کو نہ ماننے کی وجہ سے وہ اس حشر کو پہنچے ہیں۔ قرآن حکیم میں جگہ جگہ بار بار عالم آخرت کے عبرت ناک مناظر کا نقشہ کھینچا گیا ہے تاکہ اندھی تقلید کرنے والے دنیا میں ہی آنکھیں کھولیں اور کسی کے پیچھے چلنے سے پہلے خوب اچھی طرح سوچ سمجھ لیں کہ وہ جو راہ اختیار کر رہے ہیں ٹھیک ہے احکام الہی کے عین مطابق ہے یا نہیں ہے۔

چند قرآنی آیات سے ہم بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ روز آخرت اہل دوزخ کی کیسی بدتر حالت ہوگی۔

(جاری ہے)

یا احکام اللہ مبارک

ملیحہ احمد

آنچل کی رفیق اور دیرینہ ساتھی اور قارئین و قلم کار بہنوں کی ہر دل عزیز مدیرہ فرحت آرا کو ہم سے بچھڑے ہوئے پورا ایک سال گزار گیا۔ کہنے کو تو یہ ایک سال ہے مگر دیکھا جائے تو اب بھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کہ یہ ابھی کی بات ہو۔ ہم نے آنچل و سمیر کا شمارہ فرحت آرا کے نام کر کے ان کو چھوٹا سا خراج تحسین پیش کرنے کی ایک ادنیٰ سے کوشش کی ہے یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان کی وسیع خدمات ہمارا یہ عمل بہت کم ہے۔ اپنی اس کوشش میں ہم کس حد تک کامیاب رہے ہیں اس کا اندازہ تو آپ کی آرا سے ہی ہو پائے گا۔ ادارہ

موتیوں کی لڑی.....!

انسان کے لیے یہ دنیا ایک سبائٹیشن ہے جہاں انسان پیدا ہوتا ہے شیر خوارگی سے بچپن پھر جوانی اور پھر بڑھاپا..... یہ ہر ایک کی زندگی کی مختصر سی کہانی ہے۔ انسان کے وجود کو اللہ تعالیٰ نے مٹی سے بنایا۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آج تک مٹی سے بنایا انسان اسی مٹی میں جا کر سو جاتا ہے۔ ہر انسان کی زندگی کا آخر لحد ہے چاہے بچپن میں شیر خواری، جوانی یا پھر بڑھاپے میں۔ لحد ایک ایسی جگہ ہے جہاں پہنچ کر کوئی واپس نہیں آتا۔ ہم بچھڑوں کو یاد کر کے روتے ہیں تڑپتے ہیں ان کے جانے پر ہاتھ ملتے رہ جاتے ہیں۔ انسان کی زندگی میں عزیز رشتے داروں کے ساتھ ساتھ کچھ دوستوں اور سہیلیوں سے بھی ناتے جڑ جاتے ہیں۔ کچھ سہیلیاں آپ کی پڑوسی سہیلیاں ہوتی ہیں، کچھ اسکول اور کالج سے وابستہ..... مگر کچھ ایسی ہوتی ہیں جو ہمیشہ آپ کے دل کے نزدیک رہتی ہیں۔ چاہے آپ نے انہیں دیکھا ہو یا نہیں ابھی اس عید کے روز میری ایک پیاری سہیلی جو صرف آواز کی دوست تھی۔ وہ کینسر سے فوت ہو گئی۔ میں نے انتقال سے دس دن پہلے رمضان میں اس سے بات کی تھی تو اس نے بتایا تھا کہ اس کا کینسر ہڈیوں میں پھیل گیا ہے۔ وہ مجھ سے بڑے درد سے پوچھ رہی تھی کہ ڈاکٹر تنویر! میں اچھی ہو جاؤں گی..... میں زندہ تو رہوں گی تا میں اپنی دس سالہ بیٹی کو پال تو سکوں گی؟ اور میں نے اس سے کہا تھا عرشہ! تم ضرور ٹھیک ہو جاؤ گی۔ میں ایک ڈاکٹر ہونے کی وجہ سے انجام جانتی تھی اور جب عید کے دن میں نے اس کی خیریت کا فون کیا تو معلوم ہوا کہ وہ خاصی تکلیف میں تھی اور اسی رات اس کا انتقال ہو گیا۔ میں نے فرحت باجی کی طرح عرشہ کو بھی کبھی نہیں دیکھا تھا پر وہ میری ٹیلی فون کی دوست سہیلی اس سے محبت کا رشتہ تھا۔ پیار تھا وہ بھی لحد میں چلی گئی میری اچھی فرحت باجی کی طرح..... میں نے فرحت باجی کے انتقال کے بعد جانا کہ وہ ابن صفی کی بیگم تھیں۔ ابن صفی کا نام کون نہیں جانتا۔ ان کی جاسوسی کہانیاں اور ناول میں نے بھی پہلے کبھی بہت پڑھے ابھی دو تین دن سے میں کچھ لکھنے کو سوچ رہی تھی میں یہاں اسلام آباد آئی ہوئی ہوں اور طاہر قریشی کا فون آیا کہ فرحت باجی کی برسی کے موقع پر کچھ لکھوں فرحت باجی میری قلمدان

کی دوست تھیں۔ 1980ء کی دہائی سے لے کر تیس دسمبر 2010ء تک وہ میری سہیلی تھیں۔ جنہیں کبھی نہ دیکھا، بس سنا ہی تھا۔ ایک پیاری سی آواز جو میں اب بھی بھلا نہ سکی ہوں۔ ان میں محبت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ شاید وہ سب لکھنے والی قلم کار بہنوں سے محبت کرتی تھیں۔ شاید بہت سی قلم کار بہنیں ان سے ملی بھی ہوں مگر میں اپنی یا جی سے کبھی نہ مل سکی۔ بس وہ آواز کا جادو ہی اتنا سحر انگیز ہوتا تھا کہ میں ان سے باتوں میں محو جاتی تھی۔ ہم دنیا کے ہر موضوع پر گھنٹوں باتیں کرتے تھے اور دل نہ بھرتا تھا، آج بھی مجھے وہ یاد آتی ہیں..... اس دنیا کے سب اسٹیشن سے وہ زندگی کا رحمت سفر باندھ کر جلد میں چلی گئیں، یادوں کے آواز کے بہت سے نقوش چھوڑ گئیں۔ جو ہم ہمیشہ یاد کرتے رہیں۔ فرحت باجی 'آئی مس یو' میں آپ سے بہت پیار کرتی تھی اور بھول نہیں سکتی کہ ایک ایک کر کے میری اچھی سہیلیاں منوں مٹی کے نیچے اتنی جلدی جلدی چلی گئیں۔ اللہ آپ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے آمین۔ ان کی خواہش کے مطابق میں نے آپل میں لکھنا نہیں چھوڑا۔ میں گاہے گاہے لکھتی رہوں گی..... اور ان کو یاد کرتی رہوں گی۔ ایک انجانی کک رہے گی ہمیشہ ہمارے دل میں کہ ہم آپ جیسی شفیق دوست کو کبھی دیکھ ہی نہ سکے۔ شاید اس لیے کہ یہ نہ سوچا تھا کہ آپ یوں اچانک چلی جائیں گی۔ میرے ساتھ آپ کا پیار کا 'درد کا' آواز کا رشتہ موتیوں کی لڑی کی طرح ٹوٹ کر بکھر جائے گا..... مگر آپ کی یادیں ایسی نہیں جو ٹوٹ کر بکھر جائیں، فرحت باجی یہ آپ کی سہیلی آپ کو ہمیشہ یاد رکھے گی۔ شاید اپنی زندگی کی آخری سانسوں تک میں آپ کو بھول نہیں سکتی..... کیونکہ وہ آواز ہی نہیں بھولتی تو یاد کیسے بھولے گی۔ آپ کی پہلی برسی پر میں یادوں کا یہی تحفہ دے سکتی ہوں۔ آپ موتی کی لڑی تھیں جو بکھر گئی اور جدا ہو گئی۔

ڈاکٹر تنویر انور خان

ہاتھ خالی ہیں

نہ ہاتھ تھام سکے نہ پکڑ سکے دامن
بہت قریب سے اٹھ کر چلا گیا کوئی

دسمبر کا مہینہ مجھے ہمیشہ سے پسند رہا ہے۔ اس کی اداسی میں ڈوبی سردشائیں، کہر میں لپٹی، ٹھٹھرتی پُر کیف صبح اور جادوئی راتیں بہت متاثر کرتی ہیں۔ کچھ عزیز ہستیوں کے ساتھ میں دسمبر کو بھی اپنی زندگی میں بہت اہمیت دیتی ہوں مگر.....!

میری اتنی محبت اور اہمیت کے باوجود دسمبر نے کبھی مجھ سے وفا نہیں نبھائی، ہر سال یہ جب بھی آتا ہے، دل اور دامن خالی کر جاتا ہے۔ 25 دسمبر 2010ء کو ایک صبح مجھے بتایا گیا کہ فرحت آپا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، وہ نماز کے لیے وضو کرنے اٹھی تھیں کہ طبیعت خراب ہو گئی، دعا کرنا، اللہ اپنا رحم کرے۔ میرا دل اس اطلاع کے بعد جیسے بے قرار ہو گیا، شدید مصروفیت اور پریشانی کے باوجود میں آپا کی طرف سے بے نیاز نہ رہ سکی۔ تاہم میری دعا میں، میری فکر، میری محبت کچھ بھی آپا کے کام نہ آ سکا اور 30 دسمبر کی شام آپا کے لیے وہ اطلاع سننے کو مل گئی، جس کا وہ ایمان بھی نہیں تھا۔

بھلا یوں بھی ہوتا ہے؟

کوئی یوں بھی چپ چاپ اپنا رخت سفر باندھ لیتا ہے؟

میں بلک بلک کر رو رہی تھی اور میری ماما میرے گھر والے مجھے چپ کروا رہے تھے۔ آپا کے لیے افسردہ ہو کر دعائے مغفرت کر رہے تھے مگر صبر تھا کہ آہی نہیں رہا تھا۔ دماغ جیسے سن ہو گیا تھا اور برف ہوئی انگلیاں قریبی دوستوں کو آپا کے لیے دعائے مغفرت کا Masage کرتے ہوئے کپکپا رہی تھیں، پتھرائی ہوئی آنکھوں سے یوں آنسو ٹپک رہے تھے جیسے کسی صحرا میں بارش ہو رہی ہو۔

میں نے کہا نا! مجھے دسمبر سے پیار ہے اس کی اداس شاموں اور ٹھٹھرتی راتوں سے عشق ہے اور یہی عشق شاید دسمبر کو میری بھگی پلکوں سے ہے اسی لیے تو ہر سال یہ نیاز خم سوئپ کر جاتا ہے۔ فرحت آپا.....! دیکھیے اس بے درد دسمبر نے آپ کو بھی چھینا ہے مجھ سے.....! دیکھیے ایک سال ہو گیا، میری سماعتوں میں آپ کی محبت بھری، شہد آ گئیں آواز کی نرہاٹ نہیں اتری، میری انگلیوں نے آپ کے کمرے کا وہ نمبر ڈائل نہیں کیا جس پر کال ریسیو ہوتے ہی آپ کا پیار میرا نصیب بنتا تھا۔

آپل سے آپ کی تیس سال رفاقت، کہنے مشق، ریاضت، تعاون اور محبت کے لیے کوئی ایوارڈ نہیں جو آپ کو پیش کر کے آپ کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا جاسکے مگر.....! کاش! آپ دیکھ پاتیں فرحت آپا کہ آپ کی دائمی جدائی پر مشتاق انکل نے آپ کی مداح قاری بہنوں سے جن انمول الفاظ میں آپ کے تعاون اور صلاحیتوں کا اعتراف کیا، وہ خراج تحسین کسی ایوارڈ سے کم ہرگز نہیں تھا۔

آپ کی مداح قاری بہنوں کی یہ فرمائش کہ آپ کی ذاتی زندگی پر آپل میں کہانی پیش کی جائے، ایوارڈ ہی تو ہے آپا.....!

میں اس حقیقت کو نہیں جھٹلا سکتی کہ آپ رضائے الہی سے منوں مٹی تلے ابدی نیند جاسوئی ہیں بالکل ویسے ہی جیسے صفی انکل بالکل اچانک اپنی سالگرہ پر پچیس سال پہلے آپ کو تنہا چھوڑ کر جاسوئے تھے مگر.....!

کل جب قیصرہ آپا سے میری بات ہوئی تو میں شاکد رہ گئی۔

وہی لہجہ..... وہی آواز..... وہی انداز! وہی بے پناہ اٹھتا بیار اور اپنا بیت.....

ایک پل کو مجھے لگا آپ واپس آ گئی ہیں، نہیں دیکھا گیا آپ سے ہمارا درد.....! مگر.....!

تجھ کو کس پھول کا کفن ہم دیں.....

تو جدا ایسے موسموں میں ہوا

جب درختوں کے ہاتھ ٹھالی ہیں

چکیاں بندھ گئی ہیں لفظوں کی
آئینہ خانے رو رہے ہیں اسے
اپنے دل میں سنبھال کر اس کو
آج ہاتھوں سے کھورے ہیں اسے
اس کو کس روشنی میں دفنائیں
اس کو کس خواب کا بدن ہم دیں
وہ جو خوش بو میں ڈھل گیا یا رو!
اس کو کس پھول کا کفن ہم دیں
وہ جد ایسے موسموں میں ہوا
جب درختوں کے ہاتھ خالی ہیں!

نازیہ کنول نازی

صبح کا ستارہ

میں لکھنا چاہتی ہوں پہلے اپنی اس پیاری ہستی کے نام مگر میری ہمت نہیں ہوئی تھی شاید میں اب
بھی بہت مضبوط نہیں ہوں مگر مجھے وہ آواز سنائی دی میری سماعتوں میں گونجتے وہ تمام لفظ اور مجھے
لگا اپنے صرف کمزوری نہیں ہوتے ہماری طاقت بھی ہوتے ہیں۔ فرحت آ پامیری مضبوط طاقت
تھیں۔ اب یاد آیا وہ میری بہت اپنی تھیں۔ وہ اپنا پن۔۔۔۔۔۔ وہ پیار۔۔۔۔۔۔ وہ یقین۔۔۔۔۔۔ وہ پیار بھری
ڈانٹ! اس سب کا کوئی بدل نہیں۔
مجھے گمان نہیں تھا وہ سفر تمام ہوگا۔

کبھی اس بارے میں نہیں سوچا تھا کہ وہ ساتھ نہیں رہیں گی اور میں ان کی آواز دوبارہ نہیں سن
سکوں گی۔ مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا اور اگر اندازہ ہوتا تو کیا میں اس آواز کو پھرنے دیتی؟
کاش میرے پاس اپنوں کو اپنے ساتھ باندھ رکھنے کا کوئی کلیہ ہوتا۔
میں کھونے سے بہت ڈرتی ہوں۔ میں کھونا نہیں چاہتی۔ میں فرحت آ پا کو کھونے کے بارے
میں کبھی سوچ نہیں سکی۔

میں سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ مگر مجھے کلیہ نہیں آیا۔ مجھے فرحت آ پانے بتایا کہ اپنے ہمیشہ ساتھ
رہتے ہیں اور اب فرحت آ پا کی وہ ساری باتیں میرے ساتھ نہیں۔ مگر میری سماعتوں میں محفوظ
ہیں۔ اب میں چاہے صبح سو کر اٹھوں تو وہ آواز پھر بھی سنائی نہ دے نہ میرا سیل بجے نہ وہ مخصوص نمبر
دکھائی دے نہ وہ پیار بھری آواز وہ محبت وہ حلاوت۔ شاید پھر بھی میری سماعتوں میں نہ پڑے اور یہ
سچ ہے۔ میرا دل ایک لمحے کو جیسے مٹھی میں آ جاتا ہے جب یاد کرتی ہوں کہ فرحت آ پا اب کہیں نہیں
ہیں۔ میں مانتی ہوں مجھے شاید اول اول میں اتنا خوب لکھنا نہیں آتا تھا اور فرحت آ پانے مجھے ہی
نہیں جانے کتنے نام ور رائٹرز کو پالش کیا پتھر سے ہیرا بنایا۔ میرے پاس وہ پہلا خط محفوظ ہے جب

انہوں نے قیاس کیا تھا کہ میں کوئی عمر رسیدہ ہوں پہلی تحریر کو انہوں نے کسی ”کہنہ مشق“ مصنفہ کا
شاہکار قرار دیا تھا اور وہ بہت پیار سے کہتی تھیں۔
”عشنا! تم بہت نام ور رائٹرز میں شمار ہوگی!“ اکثر مجھ سے لکھنے کو کہتی تھیں مگر میں چونکہ پڑھ رہی
تھی سو وقت نکالنا مشکل ہوتا تھا مگر ان کی محبت سے کبھی گئی بات ٹالنے کی ہمت نہیں تھی مجھ میں سو
ہمیشہ وقت نکال کر لکھنے کی کوشش کرتی تھی۔

آنجل میرے گھر جیسا ہے رشتہ پرانا ہے اور مضبوط بھی اور فرحت آ پا سے وہ رشتہ اور بھی گہرا
ہے۔ آج میں جو بھی ہوں آنجل کے باعث ہوں۔ میری مقبولیت میری کامیابیاں۔۔۔۔۔۔ سب آنجل
کے باعث ہیں اور آنجل کی سب سے پیاری ہستی فرحت آ راء! مجھے پہلی ناول لکھنے کی پیش کش
جب میں شاید اس قابل نہیں تھی مگر فرحت آ پا کو میری صلاحیتوں پر یقین تھا بھی میں ”اے شمع کوئے
جاناں“ جیسا کامیاب ناول لکھ پائی۔ یہ ناول ریکارڈ کا میاب ہوا اور اس کا سہرا میں فرحت آ پا کو
دیتی ہوں ان کی سپورٹ کے بنایہ ممکن نہیں تھا۔

عشنا شاید ایک غیر مقبول نام رہتا اگر آنجل کی اور فرحت آ پا کی سپورٹ نہ ملتی۔ عشنا کو ٹر سر دار کو
جاننے والے آج شاید بہت ہیں مگر میری پہچان کا باعث یہ ادارہ ہے اور وہ ایک ہستی ہے جو اب
میرے ساتھ نہیں مگر وہ میری مضبوطی بنی اب بھی کہیں میرے ساتھ کھڑی ہیں۔
ان کی آواز میری سماعتوں میں اب بھی گونجتی ہے۔ وہ پیاری سی ہستی وہ نرمی وہ حلاوت۔۔۔۔۔۔
میری زندگی کا حصہ ہے اور اسے میں کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔
وہ میری ایک اچھی یاد بن کر میری یادوں میں ساری عمر محفوظ رہیں گی۔ خدا انہیں کروٹ کروٹ
جنت نصیب کرے۔

وہ صبح کا بے نوا ستارہ وہ ہم نفس ہم سفر ہمارا
سدا رہے اس کا نام پیارا سنا ہے کل رات مر گیا وہ
فرحت آ پا! آپ بہت یاد آؤ گی!
دعاؤں کی طالب

عشنا کو ٹر سر دار

تجھے اے زندگی! لائوں کہاں سے

مرحومہ پیاری فرحت آ راء آ پی کے نام

فرحت آ راء آ پی اتنی پیاری اتنی مہربان اور پُر خلوص محبت سے بھرپور ہستی ہیں جن کے لیے
الفاظ کو سورنگ میں ڈھالوں تو بھی کم ہیں ان کی مہر و وفا اور محبت کو بیان کرنے کے لیے ان گنت
الفاظ کا یہ ذخیرہ بھی کم ہے۔ فرحت آ راء آ پی ایک ہر دلعزیز ہستی ہیں جن کا لاکھوں قارئین سے تعلق
جزا تھا۔ وہ آنجل کی مدیرہ تھیں مگر ہر قاری بہن کے لیے وہ ایک اہم حیثیت رکھتی تھیں۔ کسی کی آ پی
تھیں تو کسی کی آنٹی! ہر قاری اپنے ان کو ایک منفرد نام و لقب دے رکھا تھا۔ بہر حال آنجل کی مدیرہ کی

حیثیت سے ان کا ہم سے جو تعلق تھا وہ سب سے جدا تھا۔ ناول کا انجام بخیر و مسافیت سرانجام دینا یہ ان کے لفظوں کا ہی تواجاز تھا۔

مت سہل اسے جانو پھرتا ہے فلک برسوں

تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

فرحت آراء اپنی! صرف نصیحت و مزاج میں ہی بے مثل و یکتا نہ تھیں بلکہ وہ ایک ایسا تاجناک ستارہ تھیں کہ جس کی روشنی سے قارئین کے دل روشن و منور تھے۔ ان سے جب بھی بات کرنے کا موقع ملا ہر بار ہی دل واک بے بسی خوش و حاصل ہوئی۔ مجھے وہ دن اب بھی یاد ہیں وہ بھی دسمبر کے مہینہ میں دن تھے میں اسکول میں تھی اپنی کلاس کو پڑھا رہی تھی۔ اس دن میں نے پہلی بار فرحت آپی سے آواز کا حلق جوڑا تھا اور اس سے پہلے تو صرف خطوط کے ذریعے ہی رابطہ رہا تھا۔ اتنی محبت اتنی شفقت اور اس قدر اچھے انداز میں بات چیت کا سلسلہ رہا کہ میں اب بھی ان لکھوں کو فراموش نہیں کر سکتی۔ کئی دن تک ان سے بات کرنے کی نہ شجاعت نہ ذہن و دل پر حاوی رہی اور میں ایک خوش گواری فضا میں تھی دن تک جیتی رہی۔ اس پہلی فون کال کو میں عمر بھر نہیں بھول پاؤں گی۔

تذکرہ مدیرہ آنجل کا ہونا صرف فرحت آراء آپی کا ہونا تھا کسی بھی رشتہ سے پا کرے جانے والی ہستی فرحت آپی کا تو وہ ہر رنگ ہر پہر میں تیرے قلب خیال تھیں۔ ان کی عادات و خصائل کا تذکرہ ہونا پھر اخلاقی اقدار کی پاسداری کا نکتہ لگتا کہ وہ ہر فن مولا ہیں بہ خوبی میں یکتا و بے مثال۔ قارئین کے خطوط کا جواب دیتے ان کی گفتار میں مہارت سادہ سبب نگارش کی پیروی اور مدیرہ کی حقیقت سے اپنے فرائض کی بجا آوری کے امور غرض ہر طرح سے وہ بے مثال تھیں۔ مجھے کبھی اندازہ نہ تھا کہ فرحت آپی کا ابن صافی سے اتنا گہرا تعلق ہے۔ میں نے بہت کم عمری میں ابن صافی کو پڑھنا شروع کیا تھا اور ابن صافی جیسے لوگوں کی قربت و صحبت حاصل ہونا یقیناً فرحت آراء آپی جیسے روشن و تاجناک ستارے ہی دنیا کو روشن و منور کرتے ہیں۔

جلنوں کی روشنی ہے کاشانہ چمن میں

یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں

فرحت آپی کو یاد کرنے کے اتنے ہی نے ہیں کہ ان کے کس کس رنگ اور کس کس انداز و موضوع سخن بنویں؟ وہ تو سراپا مہر و محبت و وفا تھیں۔ ان کی ذاتی زندگی کے بارے میں نہیں جانتی مگر ہمارا دوران کا حلق ایک رائٹر اور مدیرہ کا تھا وہیں دوست بھی تھیں وہ بڑی بہن بھی تھیں۔ مدیرہ کے تعلق میں ہمیشہ دوستانہ فضا حاصل رہی۔ خصوصاً بھی تھیں اس فضا میں اور محبت بھی تھی۔ جہاں تنقید کی اصلاحی ماحول آتا تو وہ مقتدر و پھر راہنمائی بھی کرتی تھیں۔ میں اس لحاظ سے بھی خود کو بہت خوش نصیب سمجھتی ہوں کہ میری پہلی تحریر آنجل میں نہ صرف منتخب ہوئی بلکہ آئندہ بھی جو بھی لکھ کر بھیجا بغیر کٹ چھانٹ کے جو کاتوں چھپ آئی کے ساتھ جہاں لاکھوں لوگوں کا تعلق ستوار تھا مگر انفرادیت کی بات کی جائے تو میرے لیے وہ جتنی کچھ تھیں۔ دوست آپی اور راہنما۔ ان کی وفات کے بعد کے کئی ماہ میں

ان کی کمی ایسی رہی کہ بعض اوقات لگا کہ اب شاید ان کی طرح مجھے کوئی تسلی نہ دینے والا ہو۔ مجھے ہمیشہ لگتے پڑا مادہ رکھنے والی کوئی ذات نہ ہو مگر قارئین کی بے پناہ محبتوں اور ہر خلوص تبصروں نے پھر سے نوازا عزم بحال کیا۔

آج آپی ہم میں نہیں ہیں ان کو گزرے ایک سال کا عرصہ ہونے کو ہے۔ مزید ماہ و سال گزرتے جائیں گے۔ مجھے ان سے ذاتی طور پر ملاقات کا شرف حاصل نہ ہوا مگر ان سے مل کر بھی کبھی محسوس نہ ہوا کہ ان سے نہیں ملی۔ اب جب کہ وہ ہم سے دور ہیں کچھ عرصہ شدت سے ان کی کمی محسوس ہوتی مگر وہ نہ ہو کر بھی ہر لمحہ ہمارے ساتھ ساتھ ہیں ہمارے درمیان ہیں۔ حیثیت و مقام بدلے مگر قیصر آراء ان کا پرتو ہیں۔ آنجل بھی اسی طرح چل رہا ہے۔ قارئین بھی ہیں مگر ان کی یادیں ہیں۔ ان کے بے شمار باتیں ہیں وہ خود نہ ہو کر ہمارے درمیان ہیں۔ اللہ ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے آمین اور آنجل کو دن دینی رات چوٹی ترقی عطا کرے آمین۔

آسمان تیری لحد پر شبنم آفشانی کرے

یہ سبزہ کو بستہ اس گھر کی پاسبانی کرے

سمیرا شریف طور

آسمان تیری لحد پر

آہ ایک سال گزر گیا فرحت آپی کی پہلی برسی اور اس موقع پر بھی میرا قلم میرے ساتھ نہیں دے رہا ہے۔ میرے کمان و یقین نہیں مل پا رہا ہے۔ ایک سال پہلے اس عزیز ہستی کو مجھ سے پتھر سے ہو گیا ہے۔ لکھنؤ سے میری بڑی شناسائی جب بھی کوئی جملہ کوئی غزل لکھتے ہیں مجھے بھی اذیت نہیں ہوتی مگر ان پیاروں کے بارے میں جو ہم سے پتھر گئے ہوں کچھ لکھنا دیا خود مرنے کے مترادف ہے۔

کیوں کہوں..... کیا لکھوں..... احساسات کی طرح قلم بھی منجمد ہے۔

ابھی تو جگر کا شائبہ

ابھی مجھ کو سنہلنے دو

جدائی کی اذیت پر

کوئی تو شعر لکھنے دو

کسی کی یاد کی مہر

سے باہر تو نکلنے دو

ذرا یہ روگ پلنے دو

جلائی تھیں کبھی ہم نے

جو شمعیں ان کو بجھنے دو

مجھے تھوڑا سا جلنے دو

جو دل کے زخم ادھر ہے ہیں

ذرا سا ان کو سلنے دو.....!!

یہ الفاظ کسی شاعر کے ہیں مگر میرے دل کی آوازاں میں گونج رہی ہے جدا سب کو ہونا ہے مگر ”جدا“ میرے لیے سب سے بڑا المیہ ہے۔ بہت دعا میں ہیں ان کے لیے۔ اللہ ان کے درجات بلند کرے ان کے اہل و عیال اور آجکل کے اسٹاف کو صبر جمیل عطا کرے (آمین)

اقراء صغیر احمد

بیان نبیانی والی

نامہ بر اپنا ہواؤں کو بنانے والے
اب نہ آئیں گے پلٹ کر کبھی جانے والے
درو دیوار پہ حسرت سی برتی ہے قتل
جانے کس دلیں گے پیار نبھانے والے

”فرحت آپی اب اس دنیا میں نہیں“ یہ کرب ناک خبر جب نکالوں کے سامنے سے زری تو نہ بصارت کو لیتیں آپا نہ دل اس سناک حقیقت کو قبول کرنے کے لیے تیار ہوا لیکن یہی حقیقت ہے کہ دنیا فانی ہے۔ ہر شخص نے اس سچ پر اپنا اپنا کردار ادا کر کے چلے جانا ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ پیار کے خزانے لٹانے والوں کو قدرت جلد اپنی گرفت میں لے لیتی ہے اور پیچھے رہ جانے والے تہی داماں رہ جاتے ہیں۔ کس گلی، کس کوپے، کس شہر کی ملک میں ڈھونڈنے سے کسی ایسی شہنشاہت نہیں ملے گی جو پتھروں میں پھول کھلا سکیں اور بیاباں میں زرخیزی دریافت کریں۔ بات صرف ہوتی ہے محبت اور چاہت کی!

اس نفسا نفسی کے دور میں تخلیق کار بہت نایاب ہو چکے ہیں۔ فن یہ نہیں کہ اپنے خیالات کو الفاظ کا پیراہن پہن کر صفحہ قرطاس پر موتی کی طرح بھیر دیں اور وادیاں پالیں تخلیق کی یہ بھی ایک قسم ہے کہ گدڑی میں لعل ڈھونڈیں کسی بے مایا کو تخلیق کار ہونے کا تاج پہنائیں یا کسی ذرے کو بھرپور تاج بنائیں۔ اپنے ہاتھ کی مشعل کسی اور کو تھمائیں۔

بہت کٹھن کام ہے پتھر کو تراش کر ہیرے کا روپ دینا!

بے شک فرحت آپی وہ فنکار تھیں جن کی حوصلہ افزائی اور چاہت نے مجھے تراش جنہوں نے اپنے خلوص اور ہمت افزائی سے بہت سے تخلیق کار پیدا کیے۔ میرا اور ان کا صرف قلمی رشتہ تھا لیکن ایسے رشتے جو احساسات اور جذبات کے تانے بانے پر مشتمل تھا۔ شاید وہ میرے خیالات کو پڑھ لینے کا سن جانتی تھیں اس لیے شادی کے بعد میری بے پایاں مصروفیات کا انہیں سمجھنا تھا لیکن پھر بھی اپنے آخری خط میں جو میرے نام تھا ایک پیارا بھرا اصرار!

”سال میں جلد از جلد نہ سہی چھ تحریریں تو بھیج دو گی؟“ اسی جہت میں اس قدر محبت چھپی ہوئی تھی کہ میں نے پھر سے قلم اٹھالیا میرے غفلوں کو پھر سے زرخیزی ملے گی۔

یہ سہرا فرحت آپی کے ہی سر جاتا ہے کہ میرا تعارف رائٹر کی حیثیت سے ہوا۔ یہ اعزاز میرے لیے کسی سرمائے سے کم نہیں انہوں نے نہ صرف مجھ میں ”تخلیق“ کو دریافت کیا بلکہ اس کا رہنر میں میرا ہاتھ تمام کمر متعارف بھی کرایا۔ میرا ان کا یہ قلمی رشتہ آج کا نہیں بہت پرانا تھا۔ انہیں فراموش کرنا بہت مشکل ہے جنہوں نے ان کی پڑ کردنیائے ادب میں مجھے چنا سکا یا ان کی محبتیں میرے دل میں تناؤ و شجر کی طرح لہہا رہی ہیں۔ میرے اندر نئی سوچ کی آبیاری کرنے والی اس بستی کو میں کیا جزا دوں کی سوائے دعاؤں کے اللہ ان کی مغفرت کرے۔ انہیں جنت میں اونچا مقام دے۔ بے شک ان کی ہی ایک عظیم دکھ ہے ایک بے پایاں نقصان ہے لیکن محبت سے گندھے ان کے منظر زندہ رہیں گے۔ یہ نلکہ محبت مر نہیں سکتی۔ جتنے پھول مٹیوں اور چاتوں کے انہوں نے باٹے ہیں وہ سارے مشکبو پھول دعاؤں کے گندھے کی صورت میں ان کی تربیت پر پختہ و رکرتی ہوں کہ اللہ ان کے درجات بلند کرے جنت میں ان کا سکن ہو۔

طلعت نظامی

اسحان قیری لحد بہ شبہم افشانی کرے

ابھی تو یہ یقین نہیں آیا تھا کہ ہماری پیاری بیوی اس دنیا سے جا چکی ہیں کہ زمانے کی برق رفتار چال نے یہ اطلاع بھی دے دی کہ ہال گزر گیا۔ میرے کانوں میں بھیجے کے انتقال سے پہلے کے ٹکٹھے بیٹھے جملے آج بھی تروتازہ ہیں۔

”راحت! تمہارا آجکل سے پہلا رشتہ ہے ناول تو چل رہا ہے اس کے علاوہ بھی لکھتی رہا کرو“ بات بہت محنت سے غائب ہو جاتی ہو۔ شکر یہ کہ میرے کنبے پر تم نے ناول لکھا۔ بس دعاؤں میں یاد رکھ کر اللہ تمہیں اپنی حفاظت میں رکھے آمین۔

وہ یہ نیلی قوائے مستو سے بد قسمتی سے آخری گنگو نابت ہوئی۔ جو فطرتاً ہی یاد ہے اور میں جانتی ہوں کہ ہمیشہ یاد رہیں گی۔ میں نے پہلا ناول لکھا تھا جس کی زبان سے میری بیوی نے کہا تھا کہ ”اس کا لکھنا تو سب سے آسان ہے“ لیکن جب بات ہوئی احساس کی برسات ہوئی۔ لکھنے سے سب آجکل کی ذمہ داری اٹھاتی ہیں لکھنے شروع کیا تھا۔ ان کی حوصلہ دہانی نے میری قدم بہ قدم میرے ساتھ رہی۔ پہلا ناول ”شہر“ لکھنے کی جسارت بھی میں نے بھیجے کے کنبے پر لی کی۔ آجکل میں نے افسانے لکھنا بھی نہیں چاہتا۔ افسانے کے بعد بھیجے کے تعریفی کلمات جو میرے دل پہ آج بھی یاد ہیں۔ ان سے محبت اور پناہیت کا رشتہ رہا جو باہش پیشہ ورنہ نہیں تھا! ان کا پیغام محبت ہوتا تھا جو سماعتوں کے ذریعے روح میں سرایت کر جاتا تھا۔

ناول ”جان جاں“ تو چھپنے کے بعد ان کی زندگی میں شروع ہوا لیکن بعد از مرگ مکمل ہوا۔ ایک مقام وہ بھی آیا کہ میری دل لکھی نے میری ہمت سب کر دی کہ اب یہ ناول کیسے لکھوں؟ کس کے لیے لکھوں؟ پھر بھیجی کی ہی فرمائش یاد آئی تو قسم سنہاں!۔ بھیجے کے لیے دعائے مغفرت کے علاوہ ہم اور کیا کہتے ہیں! تاہم ناول ”جان جاں“ جو کتابی شکل کے آخری مراحل میں ہے اپنی پیاری

بجیا کے نام کر دیا ہے۔ یہ پیاری بجیا کو خراج تحسین ہے میری جانب سے۔ اللہ بزرگ و برتر ان کی لحد پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے آمین۔ انسان چلا جاتا ہے اس کی یادیں رہ جاتی ہیں۔ میرے پاس بھی بجیا کی یادیں بسورت خطوط اور نقش و محفوظ ہیں۔ میں بجیا کی خواہش کا احترام ہمیشہ کرتی رہوں گی۔ وہ جو ”آپل“ ہمارے لیے چھوڑ گئی ہیں اس ”آپل“ کے لیے میں اپنی خدمات پیش کرتی رہوں گی۔ دعا ہے کہ بجیا کا آپل ترقی و کامیابی کی منازل طے کرتا رہے۔

راحت وفا

جیسے جگنو ہوا میں کھو جانے

ہاں دوستو! رشتہ ابھی کل کی بات لگتی ہے ہم فرحت آپنی سے فون پر ہم کام تھے۔ نیا نیا قمر سے رشتہ جڑ تھ۔ سوچا آپل میں بھی طبع آزمائی کریں۔

”ہیلو فرحت آپلی!“

”ہاں! السلام علیکم!“

”میں عالیہ حرا بول رہی ہوں، دراصل میں نے کچھ لکھا ہے تو اشاعت کے لیے بھیجنا چاہتی ہوں۔“

”عالیہ حرا! اتنا رکیما پوچھ کیوں! سچو، بدی سے تم نے تو پرکری۔“ میرے اندر فحری جھجک تھی مگر ان کی پذیرائی کا انداز پر ہر دوست نہ بیٹا ہے کی مٹھا۔ نے مجھے بہت متاثر کیا۔ نے کتنے والوں کے لیے مدیروں کے توصیفی لفظ کیسے تریاق کا کام کرتے ہیں، کوئی نے کتنے والوں سے پوچھے اور قلم کا اظہار، قلم قبیلے سے تعلق رکھنے والے جانتے ہیں۔

”یہ آپل ترقی آپل کے لیے جوں کی توپ شائع ہوئی پھر میرا ان سے رابطہ ہمیشہ فون پر رہا۔ بہت محبت اور لگاؤٹ سے وہ بات کرتی تھیں۔ اک محبت اک خیال ان کے لیے کا۔“

”جیسے ہی نہیں ہر لکھنے والوں کو اس بات کا احساس تھا۔“

”ہم اپنی خبروں کے منتظر رہتے ہیں۔“

”ان کی پذیرائی میرا حیران کن برسرِ حال کی۔ ان کے خیال کی خبریں ہر بار ہوتی۔“

یوں تیری یاد دل میں اتری ہے
جیسے جگنو ہوا میں کھو جائے

مجھے اس خبر نے اور بھی کیا۔ فرحت آپنی کو ہم سے پچھلے ایک سال تو ایسا وقت تھی بدی بیت جاتا ہے۔ ان کے لبت کی مٹھا تو ابھی میرے دل میں ہے میری ڈائری میں پہلا نمبر انہی کا ہے۔ ان کا نام میرے دل میں ان کی یاد میں کیا ہے۔ انہوں نے ان کنت نام پڑھنے والوں کو دیکھے ہر بہتر کنت والے کی تحریر کو قلم اشاعت بنایا، اگر شامل اشاعت نہیں ہے تو اس کو گائیڈ کیا۔ اسی تحریر کو اس طرح سے لکھو، کنت کے یہ مطالعہ شہ ہے۔ خیال کو انہوں کی گرفت میں رکھو۔ بے

غرض، بے لوث ہو کر ادب کی خدمت کرتی رہیں۔

ان کی یاد آنکھوں میں آنسو بھر دیتی ہے کہ اب آئندہ کبھی میری سماعتیں ان کی آواز نہیں سن سکیں گی، وہ ناصح لہجہ اب ہمارے درمیان نہیں ہے۔ مگر.....!

فرحت آپلی! آپ آج بھی ہمارے دل میں آباد ہیں، آپل کے ساتھ ساتھ آپ سے جڑا قلبی تعلق آج بھی برقرار ہے۔ آج بھی مجھے آپ کو سوچ کر اچھا لگتا ہے۔

عالیہ حرا

”کیا ہے یہ زندگی“

”کیا ہے یہ زندگی؟“ زندگی اللہ رب العزت کی نعمت اللہ کی عطا اور اللہ کی امانت ہے اور جب وہ خالق وہ مالک چاہتا ہے اپنی امانت واپس لے لیتا ہے۔ موت کے سامنے انسان کلی طور پر بے بس ہے اختیار و مجبور ہے۔ کتابی طاقت و رکیوں نہ ہو، کتنی ہی صاحب اختیار و مرتبہ کیوں نہ ہو، زندگی کو اپنے اشاروں پر کیوں نہ بچا، تاریا ہو، کتنی ہی بڑا بادشاہ کیوں نہ ہو، جب خالق و مالک کا حکم آجاتا ہے امانت لوٹانے کا تو سب چپ چاپ بے بس و ب اختیار ہو کر خاموشی سے امانت لوٹانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ انسان بے بس ہے لیکن انسان کے یہ اختیار ہیں نہ وہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اس عنایت و اس قیمتی امانت اور اس بہترین نعمت کو کس طرح جیتے ہیں۔ اپنے اچھے کردار و عمل سے اس بہترین نعمت اور اچھائی کا تاج پہناتے ہیں یا اپنے غم و ارمیل سے اس نعمت کو برباد کر دیتے ہیں۔ یہ نفع یا نقصان انسان کا ذاتی ہے اپنے کردار و عمل کا اس کو خود جواب دینا ہے لیکن؟ زندگی ایسے لوگوں سے ہے جو خوش ہوئی ہے جو اس و بہترین انداز میں گزارتے ہیں۔ اپنے اپنے وقت و خوش رستے ہیں اپنے کردار سے عمل سے اور اخلاق سے اور کسی کی دل رازی و گناہ نہ لگتے ہیں اور یہی فرحت آپنی ایسی ہی ایک شخصیت تھیں اور بہترین و کون میں شمار ہوتی تھیں۔ بہت دین و تعریف ہو رہی ہے فرحت آپنی، جسکی ہمہ جہت خوش اخلاق اور اچھی کی شخصیت سے ہے۔ ان کی اچھائی سے ہر انسان کا شمار ملک کے بہترین اور معیار کی پرچہ دہت میں ہوتا ہے۔ ہم سبھی کے لیے یہ کہہ سکتے ہیں کہ فرحت آپنی سے زیادہ تعلق نہیں رہا۔ لیکن ہم سب میں فرحت آپنی سے بات رہی۔ ان کی موجودگی میں آپل میں میرا دل ”دشت دل“ طو وار چل رہا تھا اور اسی سلسلے میں میری ان سے مشاورت رہی۔ ناول پر خوب بات کیا کرتیں۔ کیا ان کا کیا برا لگتا، کیا ہونا چاہیے، کس موڑ پر قرین و تبدیلی چاہیے۔ ان سب باتوں کے دوران وہ اپنی مدد کیا کرتیں پیار سے خصوص سے سمجھایا کرتیں۔ اسی دوران مجھے اندازہ ہوا وہ کتنی پیاری نازاں ہیں۔ یہ آپنی ایڈیٹر کی طرح وہ تعریف اور تنقید کیا کرتیں۔ ان کی شخصیت کی بہت پیاری یادیں ہیں جو آج اتنے عرصے کے بعد پھر نظروں میں اھوم رہی ہیں۔ وہ ہمیشہ یادوں میں اور تازگی میں رہیں گی۔ باڈی بادل چاہا کہ ان سے بات کروں، مذاقات کروں مگر زندگی اور زندگی کی

مصرفیات کہ ایسا ممکن ہی نہ ہوا۔ آج ان کی برسی پر دل اداس ہے مگر بہر حال موت کا ڈانٹ تو ہر ذی روح کو چکھنا ہے آج یہ لوگ گئے ہیں کل ہماری باری ہے۔ بس اللہ تعالیٰ سے التجا ہے کہ ہم سب کو بخش دے۔ معاف فرمادے اور ہمیں اپنی پسند کے اعمال کرنے کی توفیق دے۔ آمین۔ اللہ تعالیٰ فرحت آرا کے درجات بلند فرمائے آمین۔

رخ چوہدری

یہ جاننے والے!

مختصر فرحت آرا (اللہ تبارک و تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں اسی مقام عطا فرمائے)۔ بہت اچھی مدد یہ تھیں انہوں نے بہت سی نوا موزکھاریوں کو نام و در رائے بنانے میں کلیہ کی کردار اکیا۔ مجھ سمیت تین ہی رائےز ہیں جنہوں نے آجکل سے اپنے تحریری سفر کا آغاز کیا اور مرحومہ فرحت آرا کی حوصلہ فزنی اور رہنمائی کی بدولت آج کامیابیوں سے سفر پر گامزن ہیں۔ اپنے اس نام و مقام اور اپنی ذات کی اس شناخت کے لیے ہم تازہ امت اس مشفق ہستی کو بھلا نہیں پائیں گے اور وہ ہمیشہ ہماری دعاؤں میں رہیں گی۔ آج وہ نہیں ہیں تو لگتا ہے کہ جیسے سب پتہ میسر ہو لیکن پھر بھی کسی کی احساس دل کو بے گل کر دے۔ یوں جیسے ہر خوشیاں ہوں لیکن پھر بھی کوئی مال پلین نہ کر دے۔ گو کہ ان سے وابستہ بہت سی یادیں ہیں لیکن پتہ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو دنوں ہفتوں اور مہینوں نہیں سالوں تک ہماری یادداشت میں محفوظ رہتی ہیں۔ یہ بھی ایک ایسی ہی بات ہے جو مجھے آج بھی یوں یاد ہے جیسے ابھی کل کی بات ہو۔ میرا وہ زمانہ دوست تھا جو میں نے جوانی اور دلالت میں شرمین کر دینے کے کب آچان آئے گا۔ کم عمر تھی پہلا افسانہ اسی ماہ لکھا تھا وہ اب بھی امیر نہیں بلکہ یقین تھا کہ انجمن کے لیے کاؤ میرا ناول بھی شامل ہوتا۔ ڈائجسٹ آیا لیکن نہ ناول نہ خط کا جواب۔ بس فوراً اپنے اتنی ہی کتنے سناتے ہوئے شہوے شکایات سے بھر پور لکھ ڈالا اور جواب میں ان کی محبت و شفقت کے خط ملے جس نے ان کو میرا۔ انہوں نے یہ نہیں جتایا کہ پھر وہ تاریخ کو مات دے گا۔ اگر انتظار میں ان کی رہی ہو تو یہ میری بے وفائی ہے بلکہ محبت سے لگے وہ ہمارے لیے کی شاعت کی فوری سناتے ہوئے میری تحریریں حریفوں اور چھوٹی بڑی باری سے کہیں کہیں آج بھی وہ لکھنا نہیں ہوتا۔ اس لیے اگر ناول یا ناول کے لیے دو تین ماہ لکھ جایا کریں تو آپ چاہے دل چاہوں کر اس کے فوراً اٹلی تحریر ہوا ہے کی تیاری کریں۔ کسی ڈائجسٹ کی مدد سے ان کے جواب سے یہ خط اٹھا جو میں نے بطور رابطہ وصول کیا۔ آج بھی وہ کے یہاں ہے میں تو اپنی سرت و سرشاری تک یاد آتی ہے اور ان کے درجات کی بندی کے لیے دعا میں پل اٹھی ہیں۔

یہ دنیا ایک مسافر خانہ ہے اور ہم سب یہاں مسافر ہیں

ہر ایک کو باری باری اپنی منزل کی جانب کوچ کرنا ہے۔ کامیاب اور خوش نصیب ہے وہ انسان جو یہاں رہے تو اس سفر کے سب ہم سفر اس سے خوش ہوں اور چلا جائے تو اس کے لیے دعا گو رہیں۔ فرحت آرا ان ہی لوگوں میں سے تھیں۔

رخ کتنا بھی کریں ان کا زمانے والے جانے والے تو نہیں لوٹ کے آنے والے کتنی بے کیف سی رہ جاتی ہے دل کی ہستی کتنے چپ چاپ چلے جاتے ہیں جانے والے

عائشہ خان

یاد کی دستک

دسمبر کا مہینہ شروع ہو چکا ہے۔ نجانے اس مہینے میں ایسی کیا بات ہے کہ ہر برس یہ مہینہ جاتے جاتے درد دکھ اور جدائی دے کر جاتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے دسمبر کے ساتھ بھی کوئی بڑا حادثہ ہوا ہے۔ اے ہی کوئی گہری چوٹ لگی ہے جو یہ ہم سے اس کا بدلہ لے رہا ہے۔

”دسمبر!“

ہم نے غور کیا تو کچھ یہ نتیجہ نکلا۔

”درد“ سسکیاں ”رخ“ بے بسی!

ہے یہ دسمبر!

وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا اور ایک سال بیت گیا۔ ہماری پیاری مدد فرحت آرا صاحبہ انہیں ہم تو ”آنی خالیہ“ کہا کرتے تھے۔ ہمیں ابدی جدائی کا درد دے کر چلی گئیں۔ وہ جو ہمیں بہت دیر میں دیا کرتی تھیں آج ہم ان کی مغفرت کی دعا نہیں کرتے ہیں۔ ہم نے پہلے بھی کہا تھا کہ بابا تو ابھی نے ہے مگر پچھ لوگ جا کر بھی نہیں جاتے لوگوں کے دلوں میں رہ جاتے ہیں اور یہی اس زندگی ہے۔ فرحت آرا نے آجکل کی ہر رائے اور قری نے ایک رشتہ جوڑ لیا تھا۔ کسی کے لیے وہ پوجا جانی تھیں، کوئی انہیں خالہ جانی کہتی تو کسی کو وہ باقی ”آنی“ آپا اور امومحسوس ہوتی تھیں۔ یہ رشتے ان کے پر خلوص اور پیار بھرے رویے نے ان کو بخشے تھے۔ یہ محبتیں ان کی زندگی بھر کی گمانی ہیں اور یہ ان کی محبت ہی ہے کہ میری شادی میں صرف چار دن باقی ہیں تو میں ان کو یاد کرتی ہوں۔ سب انتہا مصروفیت میں ان کی محبت کے لیے میں نے وقت نکال ہی لیا ہے۔ بھابھہ نام میں نہیں رہیں مگر پھر بھی وہ ہم میں موجود ہیں کیونکہ مروہ جاتے ہیں جنہیں دگ بھول جائیں جو لوگ دلوں میں یادوں میں اور دعاؤں میں زندہ رہیں وہ بھی نہیں مرتے اور یہ ان کے خلوص و ارادہ کا ثبوت ہے جو سدا بہر رہن گران کے چاہنے والوں کے دلوں میں جاتا ہے۔ فرحت آرا کی رہنمائی ان کی دعا میں ان کا فکر مندانہ انداز نشو و نما جو کبھی میری محبت اور غیہ حاضری کے سبب ہوتا تھا مجھے آج بھی یاد ہے۔ کتنی ہی باتیں ہیں جو ذہن کے دلوں پر دستک دے رہی ہیں۔ ان کی آواز اب بھی ہاتھوں میں اپنی نیت اور محبت کا رس گھول رہی ہے اور ان شاء اللہ فرحت آرا کی یہ محبت ان کے بعد بھی ہمیں آجکل سے جوڑے رکھے گی۔

فرحت آرا کی

”آپ آنجل فیملی کا حصہ ہیں آپ کو ہم کیسے بھول سکتے ہیں آپ کے اچھے نصیب کے لیے کامیابیوں اور خوشیوں کے لیے صحت مند زندگی کے لیے بہت سی دعائیں ہیں ہمیشہ خوش رہیے اور لکھتی رہیے۔“

مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ فرحت آئی کی یہ دعائیں میرے حق میں ضرور قبول فرمائیں گے۔ آمین۔ یہی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرحت آئی کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے ان کے درجات بلند فرمائے آمین۔

سباس گل

”قریب دم سے روشن ہیں چراغ ساریے“

وہ خواب ہی سہی پیش نظر تو اب بھی ہے

پھڑنے والا شریک سفر تو اب بھی ہے

جتنے لوگ خوشبو کی مانند موتے ہیں۔ جن کی باتوں کی شناسائی جن کے نرم لہجے کی طاقت و تاثیر خوشبو بن کر روح و ذہن کو مس کر دیتی ہے لیکن چھوٹے جتنوں کی مانند موتے ہیں۔ رات و دن کمانے والے بے سمت راہوں میں منزل تک پہنچانے کے لیے مسافر کے ہاتھ میں روشنی کی کرن تھیں۔ کراچی کے سفر پر روانہ کر دینے والے اور یہ بھی کی کرن روشن چرخ بن کر مسافر کو اس کی منزل تک پہنچا دیتی ہے۔ وہ لوگ اپنی ذات میں روشنی کے مینار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور راہ میں اپنی روشنی سے چراغ چرا چہرا روشن کرتے چلے جاتے ہیں تاکہ پیچھے آنے والوں کو راہ منزل مل سکے۔ مرحومہ فرحت آئی کی ذات بھی آپس سے وابستہ تھیں اپنے تمام لکھنے والوں اور قارئین آپس کے لیے اسی روشنی کے مینار کی سی حیثیت رکھتی تھیں۔ بلاشبہ ادارہ آنجل نے سنہ لکھنے والوں کو ایک مضبوط پلیٹ فارم فراہم کیا ہے۔ جہاں وہ اپنی خفیہ صلاحیتوں کو نکھار کے کامیابیوں کے منتظر کھڑے چلے جاتے ہیں اور ایک وقت آتا ہے کہ قلم ان کی منفرد پہچان بن جاتا ہے۔ جس طرح ایک جوہری ایک عام سے قیمتی پتھر کو تراش خراش کے بعد آنکھوں کو خیرہ کرنے والی ہیرے کی تابان عینا کرتا ہے ایک باغبان چھوٹا سا پودا کا کرات پھلنے پھوٹنے کے لیے دن رات اپنی شبانہ روز محنت و سہ سے باغ ایک سایہ دار تناور درخت بنانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے بالکل اسی طرح ادارہ آنجل کے پلیٹ فارم سے فرحت آئی نے اس کا رواں میں شامل بے شمار نئے آنے والوں کو کامیابی کے سفر میں خوش آمدید کہہ کر اپنی گہم و فراست مشاہدہ و تجربے کی گہرائی اور رہنمائی سے اس قابل بنادیا کہ زینہ بہ زینہ ترقی کرتے آئے وہ نوا موزک کی کامیاب رائیڈ کی صف میں نمایاں مقام حاصل کر رہے ہیں۔ اور اس کا سہرا فرحت آئی کو جاتا ہے۔ ان کے ہنرمند ہاتھوں سے نجانے کتنے عام و خاص پتھر قیمتی لکھنے اور بیرے بن کر علم و ادب کے ایوانوں کو تابناکی عطا کر رہے ہیں۔ فرحت آئی نے جن سنہ لکھنے والوں کو آنجل میں خوش آمدید کہتے ہوئے پذیرائی بخشی ان میں ایک میں بھی شامل ہوں۔ اگرچہ ابھی طفل متب ہوں لیکن میری رہنمائی و حوصلہ افزائی میں آپ نے ہمیشہ مشفق استاد

یہ غلوں رہیں اور بے تکلف دوستوں جیسا کردار ادا کیا۔ میری بد قسمتی کہ ان سے بالمشافہ ملاقات نہ ہوئی مگر فون پر اکثر و بیشتر ہونے والی گفتگو نے نوائے سے ان کے ساتھ بہت اچھا اور قیمتی وقت گزارا۔ وہ ایک مشفق استاد اور محترم رہنما کا درجہ رکھتی تھیں۔ دہشتہ اور دوستانہ لہجے میں تحریر کی چیدہ چیدہ خامیوں کی نشاندہی بنا ہماری مہم کا احساس دلانے کرتے ہوئے صحیح معنوں میں ایک بہترین رہنما کی حیثیت رکھتی تھیں۔ یوں خط جیسی آدھی ملاقات فون پر ادھوری ملاقات کی شش کو کم کر دیتی تھی۔ معصوم نہیں تھا کہ زندگی مہبت نہیں دے کی اور ان سے ملاقات کی خواہش دل ہی میں دلی رہ جاسے گی۔ آئی ان کو ہم سے بچھڑنے پر ایک برس بیت گیا مگر آج بھی ان کے نام کے ساتھ مرحومہ کا خط لکھتے قلم کا پ رہا ہے۔ دل دھکے احساس سے بوجھل ہے مگر قہر رت کے فیصلوں سے کسی کو مفر ہے۔ علم و ادب اور ڈائجسٹ کی دنیا کا ایک اور روشن ستارہ موت کی بے رحم تاریکیوں میں مٹ گیا لیکن اپنی زندگی میں اس نے جتنے چراغ روشن کیے ہیں ان کی تابناکی سے علم و ادب کا افق روشن ہوا ہے۔ قلم کاروں کا یہ کارواں یونہی رواں دواں رہے گا۔ جیسے وقت کے بہتے کے ساتھ زندگی آگے بڑھتی ہے۔ اپنے پیچھے آنے والوں کے لیے یہ روشن چراغ راہ میں روشنی بکھیرتے رہیں گے۔ وہ چراغ جو فرحت آئی مرحومہ نے روشن کیے۔ اللہ تعالیٰ سے یہی دعا ہے مرحومہ فرحت آئی کو اجر عظیم عطا کرتے ہوئے بلند درجات کے ساتھ فردوس بریں میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین)

غزالہ عزیز

”یاد کیے جگنو۔۔۔“

جتنے لوگ ہوتے ہیں کہ جن کے بارے میں کہنے کے لیے غصہ نہیں ملتا۔ سوچیں ختم ہو جاتی ہیں جب طبع بھائی نے مجھ سے ”فرحت آئی“ کے بارے میں پتہ لکھنے کو کہا تو میں سوچنے لگی کہ کیا ہوں؟ کیا ہوں؟ ایسے تو فرحت آپات میرا بہت زیادہ واسطہ نہیں رہا لیکن جتن بھی رہا وہ خوشنواں ہائی صورت میں ہمیشہ میرے پاس رہے گا۔ ان کے لہجے کی نرمی اور شفقت ہمیشہ میری سماعتوں میں تازہ رہے گی۔ 2008ء میں میں نے اپنا افسانہ ”آنجل“ کے لیے بھیجا اور ذہن میں تھا کہ نہ ہائے کتنے ماہ بعد وہ شائع ہو لیکن جب میں نے کچھ دن بعد ہی پہلی بار فرحت آپا سے بات کی اور اپنا تعارف کروایا تو انہوں نے سراسر شوخی سے مجھ سے بات کی کہ جیسے میں برسوں سے انہیں جانتی ہوں اور فوراً کہا ”نزدہت! آپ کا افسانہ قابل اشاعت ہے“

اتنی مسروریت ہونے کے باوجود میں نے جب جب ان سے بات کی بہت تھل اور شفقت سے انہوں نے مجھ سے بات کی۔ میرا ایک افسانہ لگا فوراً ہی ہمارا آنجل میں تعارف بھی لگا دیا۔ میری بیٹی کی شادی کے سلسلے میں میں نے انہیں مدعو کرنا چاہا تو نہایت پیارا اور مددگار سے کہا۔ میں تو رشتہ داروں کے ہاں بھی نہیں جاتی۔ اور ساتھ معذرت کی اور پھر انہوں نے میری بیٹی صوفیہ کو ڈھیر ساری بات بھری دعوں سے نوازا۔ ان کے منہ سے نکلے ہوئے ان خوب صورت دعا یہ الفاظ کی بازگشت

مقدس رہا ہے۔ چکوال

۱۔ فرحت آئی کے ساتھ میرا بہت مہوار طرب ہے لیکن میری بھی ان کی شخصیت کو اتنا جان پائی ہوں کہ ایسے لوگ تو کما کر مایہ ہوتے ہیں۔ بحیثیت بد مزہ فرحت آئی ایک مہربان دوست، مشفق استاد اور اپنے بچوں (آج کل قارئین) کے لیے ایک محبت بھری آغوش تھیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے آمین۔

۲۔ فرحت آبی کے بچہ آج کل بہت سوتا سوتا اور یہ اس سہولت ہے۔ ایسا لگتا ہے آج کل کا ایک ایک لفظ مدیرہ آبی کے لیے بے قرار ہو جیسے کہ شاعر نے کہا اور مجھے لگتا ہے کہ شعر مدیرہ جی کے لیے ہی لکھا گیا ہے۔

سوتلی سونی اداس ہیں تمہیں
لوٹ آؤ کہ منتظر ہے وہی

۳۔ مجھے اس بات کا پیشہ کھڑے ہونا نہیں ہے۔ فرست آئی
تو فون پر بات کی ہے اور وہ بھی کبھی اس سے مل پائی ہوں لیکن بذریعہ
خط میرا دل سے بدھ ہوا وہ خط کا جواب دیتی محبت اور شفقت سے اپنی
تصنیع کے دل خوش ہو جاتا تھا۔ اب بھی یہی ہوا کرتا تھا خط لکھتے تو
اب غیب فرمات آئی یہ جانتی ہیں۔ اس کا شوق اندر زیادہ جانتے۔
میں اب بھی (خیالوں میں) ان دنوں مسکراتے محسوس کرتی ہوں۔
۴۔ جب آپ جل کے ذریعہ فرست آئی کے انتقال پر خبر ملی تو
مجھے ایسا لگا تھا کہ میرا دل کیسے بند ہو جائے گی۔ آج اس پر دوبارہ
چھوٹے دل نہیں بٹتا تھا۔ یہ سن کر ان دنوں میری یہ حالت ہے کہ
مجھے کوئی بات اچھی نہیں لگتی تھی۔ میرے سب جاننے والوں نے مجھے
پرستہ یا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا میں دھڑاڑیں مار مار کر روؤں اور ایسا ہوا بھی
تھا۔ یوں لگتا تھا میرا کوئی اپنا بھرا ہمتی اپنا بھرا چھوٹے چھوٹے گیا ہوا۔

۵۔ فرحت آلی ایک ایسی ہستی تھیں جو خوب لغظوں کا چناؤ بہت خوب صورتی سے کرتی تھیں۔ میں ان کے بارے میں صرف اتنا کہتا چاہوں گی کہ ایسے لوگ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ جو سب کو محبت کی ذور میں یہ باندھ لیتے ہیں۔ پھر اس دھار سے ٹکنا مشکل ہو جاتا ہے۔

میسرا انور..... مجملہ

۱۔ مجھ کو فرحت آیا ہمیشہ ایک شفیق سی شخصیت محسوس ہوئیں۔
میں نے انہیں بھی دیکھا نہیں تھا مگر ایسا محسوس ہوتا ہے۔ وہ میرے ہر
احساس میں موجود ہیں۔ میں نے جب بھی "در جواب آں" کا صفحہ کھولا
تو فرحت آیا کو انہیں بہت ہمدردانہ ولی شخصیت کے طور پر دیکھا تو
انہیں دوسروں کے دکھ درد میں شامل ہوتے دیکھا۔ وہ اتنے پیار سے
ہر خط کا جواب دیتی تھیں کہ ایسا محسوس ہوتا کہ ہم کسی بہت مہربان اور
اپنے بہت عزیز سے بات کر رہے ہوں۔ ایک مددگار کی حیثیت سے
انہوں نے اپنے تمام غرائز بہ حسن دخولی پر بھی ماریے۔

۲۔ فرحت آپ سب بغیر آچل گیا لگتا ہے جیسے بہار کے بعد
خزاں کا موسم آتا ہے۔ آچل بھی۔ رقی طرح اس کیابی دیتا ہے۔
اب ایسا لگتا ہے کہ کوئی ہمارے خط کا بے چینی سے استغناء نہیں کر رہا۔

۳۔ مجھے فرحت آپا کی یہ بات بہت زیادہ آگتی ہے جب انہوں نے ایک خط کے جواب میں کہا تھا ”اس بات بھی اسی کا جگہ معلوم اسی کا شہر سوچتا ہے اور دہنور بھی جگہ نہیں پاتا کہ وہ اس کیوں ہے۔“

۴۔ جب میں نے فوجستانہ پاکستان کے انتقال کا سنا تو مجھے یقین نہ آیا۔ مجھے اس قدر شکاک لگا کہ میں بار بار اس یہ لفظ وہ آئی رہی۔ ”نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔“ میں نے آپس کو ہار بٹھولا کہ شاید میں نے غلط پڑھا ہے مگر.....!

۵۔ فرحت پا کو ہم سے جد ہونے ایک سال بھی بیت گیا، مگر ابھی تو وہ مارے امیران تھیں۔ اس کی بھلی کے موصی بہیہ سہیل میں ہر ایک خواہش شدت سے اجڑی کرکاش میں بیٹھی فرحت پا ایک بہت حساس طبیعت کی مالک اس پیاری شخصیت اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتی جن کے لیے اتنے دلوں میں محبت اور پیار ہے۔

رشتک چیبہ کراچی

۱۔ کسی بھی رسالے یا انجمن کی کامیابی کا سب سے بڑا محرک اس
رسالے یا انجمن کے مدیرین و مدیرہ کے ہوتے ہیں۔ ان کے ہوتے ہی سالوں
سے چلے جس خوب صورتی کے ساتھ انہیں شائستگی سے وقت گزر رہا ہو
ترتیب سے۔ یہ اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ خوش قسمتی سے انچیلر
میں سے بہترین و باصلاحیت مدیروں کا ساتھ ملے آیا ہے۔ جنہوں نے
پیشہ فنی و فہمی صلاحیتوں سے اس کی ترغیب فراہم میں ان بھرپور کردار
نہایا ہے۔ رہا سوال یہ ہے کہ فہرست آرٹیکل پالیٹر مدد یہ ہے مایہ نوس کا
مواظب یہ ہے کہ ہمیں نثر نگاری کے اس گوشتے میں اپنی قدر سے اجازت
دے دینا چاہیے۔ جب فہرست پالیٹر مندرجہ ذیل ہیں۔ اسی وجہ سے
ان کو زور دیا جاتا ہے۔ ہمارے سامنے تو ایسی کمی ہیں۔ لیکن جیسا کہ میں نے
عرض کیا ہے۔ چلے گی کامیابی و کامیابی کا تمام تر سہارا ان کے سر ہے۔
پانچویں آئین کے لیے مقررین۔ یہ وہ جگہ ہیں۔ اللہ رب العزت ان
کو اپنے جوار رحمت میں باندھ لے گا۔

۲۔ فرحت، آپ کے جانے کے بعد ہاتھوں میں لکے ہوئے یہ دوں
 لکے ہوئے میں تک آچل بیٹھ خالی میں ماحسوس ہوتا تھا میں جب
 دس نہیں تھی۔ قیصر آپ کو دیر کے بعد بے رہ فائز کیا یا نہیں
 آپ کی کرسی دوسری آیا ہے لی سے تو یقین کر لی ہلی فرش ہوا
 یہ سچ ہے کہ فرحت آپ کی می پوری نہیں پہنچا لیان قسمت کا
 مقدر ہے کہ ایک ہاتھ اب ایک ہاتھ دو۔ آسم نے ایک ہاتھ سے فرحت
 پاؤں کو یا تو دوسرے ہاتھ سے قیصر آپ کو پا بجھی تو کیا۔ لیکن یہاں
 ایک بات ضرور کہوں گی۔

”فرحتا یا! آبی یافاتی ہو.....!“

۲۔ ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں جنہیں ہم بطور خاص یاد کرتے ہیں اور یہ لوگ اس سے بھی کم ہوتے ہیں جو اس مصروف و فانی دوزلی زندگی میں دہن و دل کے گوشاں میں عیاں ہوتے رہتے ہیں۔ میری زندگی میں فرحت آپ کا شمار چند اہم شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ جنہیں مجھے یاد کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ وہ مجھے

وہ فریاد آتی ہیں۔ میں انہیں زندگی کے کسی موز پر بھول نہیں پاؤں
کی۔ کبھی کبھی نہیں۔ جب میرا پہلا افسانہ پبلش ہو گیا تو میں ان
سے کہیں ہوئی۔ جو ٹیکل کی ٹیکوں میں اس وقت میں اس زمانہ میں
کی مانند تھی جو اسکول تو گیا تھا لیکن سکرانچان تھا اپنی کا اس سے اپنے
حساب سے اپنے ساتھ تھیں سے فرحت یا میرا ہاتھ تمام کر مجھے میری
مطلوبہ منزل پہ چھوڑ گئیں۔ مجھے یاد ہے کہ ہمیں یا اٹھا میں دوسرے کو میں
نے طاہر بھال سے بات کی تھی انہوں نے مجھے بتایا کہ میرا افسانہ
ذری کے ذریعے میں شائع ہو رہا ہے۔ میں نے اس وقت انہیں
خوش ہے عام میں ارادہ کیا تھا کہ میرے ہاتھ میں آجائے آئی
میں اپنی آنکھوں سے اپنا شائع شدہ افسانہ دیکھ لوں تو فرحت یا سے
بات کروں گی۔ ان کا شکریہ ادا کروں گی۔ اس وقت میرے ہجر و گمان
میں نہیں تھا کہ بہر ارادہ ہزارہ چائے گا اور وقت کے بہاؤ میں فرحت
یا سے نہ مل سکے گی۔

"آپ کی یہ روایا پانچ سو روپی کی روپہ میں آچلے
 فرمیں ہاں کی جی۔ تہ جتنی ترتیب دیے تھے میں نے۔ سنی باتیں
 دیگی صحیح میں نے۔ فرحتی آپ سے یہ ہوں لی وہ ہوں لی۔ فون یا
 کو ظاہر بھائی نے کال ریسیو کی تھی۔ میں نے کہا۔ مجھے فرحتی آپ سے
 بات کرنی ہے۔ تب سوچا بھی نہیں تھا کہ آگے سے اتنی غیر توقعی خبر
 سننے والے۔ پہلے تو نے مجھ ہی نہیں آئی کہ وہ آپ سے اور جب مجھ
 نے تو متنبہ کرنے یہ اختیار نہیں تھا۔ ہوتا ہے تو انہوں میں ایسا بہت
 کچھ جو کبھی نہیں بھولتا۔ میرا نہیں خیال یہ بات میں بھی فراموش
 کر گیاں گی۔ یہی کہانی شائع کرتے والی یہ زندگی کو اس وقت
 کہتے بھی مجھے اس میدان میں کھڑے ہونے کی صلاحیت فراہم کر
 کے میری ذات یہ کتنا بڑا احسان کر گئی ہیں۔

۵۰۔ ان کی بری کے سماع پر میری جانب سے میرے دل کی
 بات کرنی یہ شرعی فرحت آپا کی نذر میں نے خود گریہ کی ہے
 انکس وے جسے میں نہیں یاد کرتی ہوں۔

تسہیں کیوں فصل غم ہونے کی جلدی تھی؟

پچھڑ کر خاک میں ملے گی جلدی تھی
اور پچھڑ اور تم ساتھ ملنے رہیں
جدا یہ لہو کے رونے کی جلدی تھی
بھی پوری طرے سے ملنے پائے اور
تھیں فوراً جدا ہونے کی جلدی تھی
تھیں اب درشن سے پیسہ
اتار فرش نظر ہونے کی جلدی تھی
شہر والے تم قسمت کے آپ تھیں
مقدمہ کو نہیں کھانے کی جلدی تھی

یا سیمین عندلیب... شورش کوٹ

ایہ فرحت آپ کی تو صرف یہ رہ گیا ہے تو نا انصافی ہوگی وہ صرف یہ رہ نہ تھیں ہماری پھوپھو آئی آئی نہیں اور ماں کا دلچہرہ تھیں۔
افغان نہیں ملتے کہ کچھ کہہ سکیں کیونکہ وہ بے مثال تھیں۔

۲۔ فرحت آپی کی تو ابھی بھی محسوس ہوتی ہے پہلے لگتا تھا کہ آنچل میں یہ ادھورا پن خالی پن اب ہمیشہ رہے گا مگر جب قیصر آرا نے یہ بارے میں پتا چلا تو دل کو ٹھوڑا سکون ملا۔ قیصر آپی فرحت آپی کا عکس ہی تو ہیں یوں لگتا ہے جیسے ان کے وجود کا حصہ ہیں اور یہ حقیقت بھی تو ہے۔ یہ بات غلط ہے وہ ہمارے درمیان نہیں رہیں ان کی باتیں ان کی یادیں پیار و شفقت ہمرا انداز آج بھی محسوس ہوتا ہے وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئیں مگر ہمارے دلوں میں آج بھی نندہ ہیں اور ہمیشہ رہیں گی۔

۳۔ فرحت آبادی کی یہ بات بہت یاد آتی ہے وہ کہتی تھیں۔
 ”یاسمین! ابھی حوصلہ مت ہارنا، جوش جذبے اور لکھن کے ساتھ
 آگے بڑھنا ایک دن منزل مل جائے گی۔“

"میرے کی زندگی مجھ سے روشہ کر جا رہی تھی انہوں نے مجھے شکرت کا سامنا کرنے اور زندہ رہنے سے بچنے کا فن سکھایا۔ وہ میرے ہونے ہو جانے کو چاہتے نہ تھے۔ میں نے اپنی ہر فیکٹ کے ساتھ شینہ کی ہے۔"

۴۔ فرحت آئینہ کی نقال کی خبر رات ہی دن میری زندگی کی
چغزل کی خبر ڈنٹ رہ رہتی تھیں۔ مجھے ایک نہیں وہ سب سب
تھے وہ انہیں سبنا بہت حوصلے کا کام تھا۔ آبی نے مجھے سنائی تھی
میں نہیں ہونے دی تھی اور جب مجھے آبی کے بارے میں پتہ چلا
تو کہ یہ کام میرے جذبات اسما مات جہد ہو گئے ہیں پھر انے
تھیں۔ میں دیکھتی تھی کہ آبی سوتا تو اپنے جانب ہو کر جیسے تحراست
کرتی۔ یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ میرے ساتھ کیا ہو چکا ہے۔ آبی بھی
پتھر میں اوندھنڈی تھی۔ آبی کے پاس یا آبی تو دل سے پوچھتا تھا کہ
میرا ایک دن میں نے اپنے دل کو بار بار یقین دلایا اور اس کی حقیقت
کو پور کر لیا تو اس دن میں اتنا ٹوٹ کر رہی کہ دل ہی نہیں بھرتا تھا
رونے کو دل چاہتا تھا سارے آسمان ہی ختم ہو جائیں۔ میں نے
نئی چھوٹی سی زندگی میں بڑے بڑے صدمے اٹھائے ہیں اور آبی
خسے دیے ہوئے حوصلے سے گانٹھ لیا میں نے اپنے غموں کو اور خود کو۔
اٹھائیں تو آج بھی خیر رہتی ہیں۔

۵۔ تیری باتیں تیری یادیں میرا سرمایہ
عندلیب تنہا نہیں ہے ساتھ تیرا سایہ
تو رات کی رانی تو روشن چاند تھا میرا
خدا تیرے درجات بلند کرے جنت ہو گھر تیرا
کرن وفا.....یکراچی

۱۔ فرحتیٰ ایک بہترین مدیہ تھیں۔ آپ کی وہ بہتر بہترین
کی طرف ماحزن کرنے کے علاوہ قارئین اور آپل کے درمیان جو
نوب صورت رشتہ آپس کا گریڈ فرحتیٰ کی کوہ تا ہے۔

۲: آنی کے بغیر نخل بہت ادا اور ساکت ہے۔
۳: فرحت آنی کی ایسی کون سی بات ہے جو یاد نہ آتی ہو۔ نرم لہجے میں دل جوئی کرنا بات کا سمجھنا ان کی یاد دلاتا ہے۔ ان کی کمی شاید ہی کوئی پوری کر سکے۔

۱۔ فرحت آپ کو کروت کر موت جنت نصیب کرے۔ آمین۔ خرمیں صرف تائبوں کی کہ فرحت پھوپھو دل کے قریب نہیں ہیں اور ہیں گی۔ ان شاء اللہ تبارک و تعالیٰ دل کے قریب رہیں گی۔

۲۔ بشری ملک نمازہ ملک..... فیصل آباد

لوگ کیسے ہوتے ہیں جدائی سے بے خبر ہم سے تو اک شخص بھلا نہیں گیا

۱۔ فرحت پھوپھو بہت اچھی مدد رہی۔ ان کی باتوں سے دل مسرور ہو جاتا تھا، ان کے نصیحتوں سے اللہ تعالیٰ مولیٰ جنت میں رہے۔ وہ ہر کسی کو اپنا ماننے کا فن رکھتی تھیں۔ وہ کسی کو تاراج نہیں رکھتی تھیں بہت ہی کچھ اس طرح سے کرتی کہ دل خوش ہو جاتا تھا۔

۲۔ فرحت پھوپھو کے بغیر آپل سوا سونا اور بے قراری جتنا سما لگ رہا ہے۔ تھینا آپل کو بھی ہماری طرح فرحت پھوپھو بہت یاد آ رہی ہیں گی۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔ جو اللہ کو منظور تھا وہ ہو گیا۔ اب ہم تو صرف اور صرف دعا کر سکتے ہیں وہ ہم کر رہے ہیں۔

۱۔ فرحت پھوپھو کو بطور مدد یہ سب سے مختلف بہرہ مہربان

۱۔ فرحت پھوپھو بہت اچھا دل کے بہت قریب پایا۔ کہیں ملک کے حالات کے لیے ان کی فکر مندی اچھی لگتی تھی تو ہمیں سب کی خوشیوں میں خوشی کا اظہار بری وہ اپنی ہی لگتی تھیں۔ جب وہ خوشی کسی کی بہن دوست خال پھوپھو نہیں دل چاہتا تھا سارے رشتے ان سے جوڑاؤں۔ ہر ایک کے غم کو دیکھ میں انسرود اور دعا گو ہوتا اپنی بے شمار محبتوں اور چاہتوں کا اظہار کرنا کافی عرصے بعد مدد پر غیر ضروری کی وجہ سے چھٹا نہیں سب سے مختلف کرتا ہے۔ آج کل کے دور میں کسی کے پاس خود کے لیے بھی کچھ نہیں لگتا ہے اور ایسے میں وہ ہر ایک کے غم کے جواب خود پیشانی سے دیتی تھیں۔ بطور مدد یہ وہ سب سے بہترین تھیں۔

۲۔ فرحت پھوپھو کے بغیر آپل یقین جانیں ابھی تک انھوں اور بے رنگ لگتا ہے۔ بے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے زندگی کے تمام رنگ ان کے اپنے آپل سے جڑتے ان کے جدا ہونا جو ہونے لگتا ہے۔

۳۔ فرحت پھوپھو کو گزشتہ ایک سال ہونے والا ہے۔ مرنان کی کئی ہر بات آج بھی ذہن دل پر نقش ہے۔ لیکن جو بات سب سے زیادہ یاد آتی ہے وہ ان کا مجھے "جھنڈا اور رشتہ" کہنا ہے۔ میں نے ان کے بعد اس ایک لفظ میں سچی محبت کو بہت شدت سے محسوس کیا ہے۔

۴۔ اس وقت کے جو تاثرات تھے انہیں آج بھی اللہ تعالیٰ میں دھاننا شکل نہیں ہاں لیکن بے یقین تب بھی نہیں آیا تھا اور یقین اب بھی نہیں آ رہا۔ جس سے انسانی محبت کا جذب ہوا اس کے متعلق ان یقین دانا بہت اذیت ناک ہوتا ہے۔ تب میں بہت بے یقین رہی تھی۔ خبر پڑنے کے بعد جو اتنی مرتبہ پڑھا کہ وہ واقعی ہمیں چھوڑ کر چل چکی ہیں۔ اس وقت دل بہت اداس ہوا تھا۔ مجھے ابھی بھی سمجھ نہیں آ رہی کہ اس وقت کے تاثرات کو کیسے بیان کروں۔ سو مزید سننے سے معذرت چاہوں گی۔

۵۔ آج اگر پیچھے مڑ کر دیکھوں تو واقعی سچ لگتا ہے کہ وقت بڑی تیزی سے گزرتا ہے۔ نہ کسی کے لیے رکنا ہے نہ کسی کے دل کا حال چاہنا چاہتا ہے۔ نہ کسی کے غم کو دیکھتا ہے۔ میں اپنی ان سے محبت کو اس طریقے سے بیان نہیں کر سکتی کہ میرے جذبات سطحوں کی پلاز سے بہت دور ہیں۔ فرحت پھوپھو آپل میں آپ کی کئی بڑی شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔ آپ کی "جھنڈا اور رشتہ" آپ کو یہ دہائی میں یاد کرتی ہے۔ ہر نماز میں آپ کی مغفرت کی التجاربت سے لڑتی ہوں۔

۱۔ فرحت آپ کا ہر ایک سے پیار کرنا یاد آتا ہے۔ وہ ہر ایک سے ایسے پیار سے بات کرتی تھیں اور توجہ سے ہر ایک کا لفظ پر غور کرتی تھیں۔ یہ سب سے جواب دہ تھیں جیسے صرف وہ ایک ہی ان سے ایسے اہم ہوں۔ ہمارا دل چاہتا تھا کہ ان کی یہ عادت کاپی کریں۔ میں انہیں ہم اساتے اچھے کہیں؟

۲۔ اس وقت کے احساسات بتاتا ہمیں بالکل بھی نہیں آ رہا۔ وہ بہرہ کا آخر تھا۔ سچ کی ٹون بھی دیکھ تو فریڈ کا ٹیکسٹ تھا۔ "یہ آپل کی مدد فرحت آراء کی وفات ہوئی۔" یہ ٹیکسٹ پڑھ کے یقین جانیں نہیں تو پہلے کچھ سمجھ ہی نہیں آیا۔ دماغ ایک دم سے ماؤف ہو گیا۔ کتنا وقت ہم سیل ہاتھ میں لیے سن دماغ کے ساتھ ٹریس رہے۔ جب یہ سمجھ میں آیا تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ لگتا تھا کسی نے جھوٹ بولا ہے۔ اس وقت بھی یہ سطر میں لکھتے ہوئے ہمارا دل وہ دماغ بالکل پیسٹ رہا آپ کے لیے لفظ فوت ہو جانا بہت ہی کچھ دیتا ہے ہمیں۔

۳۔ ان کی برسی کے موقع پر ان کی مغفرت کے لیے بہت ساری دعا میں ہیں۔ ہماری پاس ایسے الفاظ نہیں ہیں جو ہمارے جذبات کی عکاسی کریں۔ بس اتنا ہے کہ جب بھی آپل کا نام آئے تو وہ ذرا یاد آتی ہیں اور ہمیشہ یاد آتی رہیں گی۔ شاید آپل کی کوئی بھی قاری انہیں نہیں بھول سکتی۔ اللہ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین

۴۔ طبعاً بڑا ہرہ... گاؤں مہور

۱۔ پہلے سوال کا جواب دینا میرے لیے کوئی آسان نہیں کیونکہ میں نے ان کی حیات میں صرف ایک ہی خط لکھا اور انہوں نے جس

۵۔ پیچھے مڑ کر دیکھوں تو واقعی سچ لگتا ہے کہ وقت بڑی تیزی سے گزرتا ہے۔ نہ کسی کے لیے رکنا ہے نہ کسی کے دل کا حال چاہنا چاہتا ہے۔ نہ کسی کے غم کو دیکھتا ہے۔ میں اپنی ان سے محبت کو اس طریقے سے بیان نہیں کر سکتی کہ میرے جذبات سطحوں کی پلاز سے بہت دور ہیں۔ فرحت پھوپھو آپل میں آپ کی کئی بڑی شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔ آپ کی "جھنڈا اور رشتہ" آپ کو یہ دہائی میں یاد کرتی ہے۔ ہر نماز میں آپ کی مغفرت کی التجاربت سے لڑتی ہوں۔

۱۔ فرحت آپ کے بغیر آپل بھی پہلے پہلے اداس ہی لگا۔ ان کے بغیر پہلے پہلے آپل بے رونق سا لگتا جیسے کچھ کی ہوا چھ محسوس نہیں ہوتا تھا۔

۲۔ فرحت آپ کا ہر ایک سے پیار کرنا یاد آتا ہے۔ وہ ہر ایک سے ایسے پیار سے بات کرتی تھیں اور توجہ سے ہر ایک کا لفظ پر غور کرتی تھیں۔ یہ سب سے جواب دہ تھیں جیسے صرف وہ ایک ہی ان سے ایسے اہم ہوں۔ ہمارا دل چاہتا تھا کہ ان کی یہ عادت کاپی کریں۔ میں انہیں ہم اساتے اچھے کہیں؟

۳۔ اس وقت کے احساسات بتاتا ہمیں بالکل بھی نہیں آ رہا۔ وہ بہرہ کا آخر تھا۔ سچ کی ٹون بھی دیکھ تو فریڈ کا ٹیکسٹ تھا۔ "یہ آپل کی مدد فرحت آراء کی وفات ہوئی۔" یہ ٹیکسٹ پڑھ کے یقین جانیں نہیں تو پہلے کچھ سمجھ ہی نہیں آیا۔ دماغ ایک دم سے ماؤف ہو گیا۔ کتنا وقت ہم سیل ہاتھ میں لیے سن دماغ کے ساتھ ٹریس رہے۔ جب یہ سمجھ میں آیا تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ لگتا تھا کسی نے جھوٹ بولا ہے۔ اس وقت بھی یہ سطر میں لکھتے ہوئے ہمارا دل وہ دماغ بالکل پیسٹ رہا آپ کے لیے لفظ فوت ہو جانا بہت ہی کچھ دیتا ہے ہمیں۔

۴۔ ان کی برسی کے موقع پر ان کی مغفرت کے لیے بہت ساری دعا میں ہیں۔ ہماری پاس ایسے الفاظ نہیں ہیں جو ہمارے جذبات کی عکاسی کریں۔ بس اتنا ہے کہ جب بھی آپل کا نام آئے تو وہ ذرا یاد آتی ہیں اور ہمیشہ یاد آتی رہیں گی۔ شاید آپل کی کوئی بھی قاری انہیں نہیں بھول سکتی۔ اللہ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین

۵۔ پہلے سوال کا جواب دینا میرے لیے کوئی آسان نہیں کیونکہ میں نے ان کی حیات میں صرف ایک ہی خط لکھا اور انہوں نے جس

۱۔ فرحت آپ کا ہر ایک سے پیار کرنا یاد آتا ہے۔ وہ ہر ایک سے ایسے پیار سے بات کرتی تھیں اور توجہ سے ہر ایک کا لفظ پر غور کرتی تھیں۔ یہ سب سے جواب دہ تھیں جیسے صرف وہ ایک ہی ان سے ایسے اہم ہوں۔ ہمارا دل چاہتا تھا کہ ان کی یہ عادت کاپی کریں۔ میں انہیں ہم اساتے اچھے کہیں؟

۲۔ اس وقت کے احساسات بتاتا ہمیں بالکل بھی نہیں آ رہا۔ وہ بہرہ کا آخر تھا۔ سچ کی ٹون بھی دیکھ تو فریڈ کا ٹیکسٹ تھا۔ "یہ آپل کی مدد فرحت آراء کی وفات ہوئی۔" یہ ٹیکسٹ پڑھ کے یقین جانیں نہیں تو پہلے کچھ سمجھ ہی نہیں آیا۔ دماغ ایک دم سے ماؤف ہو گیا۔ کتنا وقت ہم سیل ہاتھ میں لیے سن دماغ کے ساتھ ٹریس رہے۔ جب یہ سمجھ میں آیا تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ لگتا تھا کسی نے جھوٹ بولا ہے۔ اس وقت بھی یہ سطر میں لکھتے ہوئے ہمارا دل وہ دماغ بالکل پیسٹ رہا آپ کے لیے لفظ فوت ہو جانا بہت ہی کچھ دیتا ہے ہمیں۔

۳۔ ان کی برسی کے موقع پر ان کی مغفرت کے لیے بہت ساری دعا میں ہیں۔ ہماری پاس ایسے الفاظ نہیں ہیں جو ہمارے جذبات کی عکاسی کریں۔ بس اتنا ہے کہ جب بھی آپل کا نام آئے تو وہ ذرا یاد آتی ہیں اور ہمیشہ یاد آتی رہیں گی۔ شاید آپل کی کوئی بھی قاری انہیں نہیں بھول سکتی۔ اللہ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین

۴۔ طبعاً بڑا ہرہ... گاؤں مہور

۱۔ پہلے سوال کا جواب دینا میرے لیے کوئی آسان نہیں کیونکہ میں نے ان کی حیات میں صرف ایک ہی خط لکھا اور انہوں نے جس

۵۔ پیچھے مڑ کر دیکھوں تو واقعی سچ لگتا ہے کہ وقت بڑی تیزی سے گزرتا ہے۔ نہ کسی کے لیے رکنا ہے نہ کسی کے دل کا حال چاہنا چاہتا ہے۔ نہ کسی کے غم کو دیکھتا ہے۔ میں اپنی ان سے محبت کو اس طریقے سے بیان نہیں کر سکتی کہ میرے جذبات سطحوں کی پلاز سے بہت دور ہیں۔ فرحت پھوپھو آپل میں آپ کی کئی بڑی شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔ آپ کی "جھنڈا اور رشتہ" آپ کو یہ دہائی میں یاد کرتی ہے۔ ہر نماز میں آپ کی مغفرت کی التجاربت سے لڑتی ہوں۔

آنچل کے ہمراہ

وقت گزرا تو یہ بدل ہوا
ختم اک زندگی کا سال ہوا

(۱) کہتے ہیں کہ دسمبر جاتے جاتے انمٹ یادیں دے کر جاتا ہے گزشتہ سال کے حوالے سے کوئی ایسی یاد جو آپ کی آنکھوں میں نمی یا لبوں پر مسکراہٹ بکھیر جاتی ہو؟

(۲) سال گزشتہ میں آپ نے آپل کو کیسا پایا اور نئے سال میں آپ اس میں کیا تبدیلیاں دیکھنا چاہتی ہیں؟

(۳) سال گزشتہ میں کوئی ایسے لمحات جو ہمیشہ آپ کے دل و ذہن میں تازہ رہیں گے؟

(۴) سال گزشتہ آپل میں شائع ہونے والی کوئی ایسی تحریر شعر یا اقتباس جو آپ کے لیے یادگار ہو؟

(۵) سال نو کے لیے کوئی خواب دعا خواہش یا امید؟

آپ ان سوالات کے جوابات 08 دسمبر تک بذریعہ ڈاک یا ای میل ارسال کر سکتی ہیں۔



والدین کی نیلے بعد دیگرے حادثاتی اموات کے بعد دونوں بہنیں لائبہ اور صفیہ اپنے گھر میں تنہا رہتی ہیں تاہم ان کا کزن شہود اور اس کی بیوی منہ جبین ان کے پڑوس میں مقیم ہیں اور ان سے بے حد محبت بھی کرتے ہیں۔ شہود کی غیر موجودگی میں لائبہ کے گھر کی واردات کی رپورٹ کے لیے لائبہ منہ جبین کے مشورے پر تھانے جاتی ہے تو اسے ایس پی فوزان صدیقی کو دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے۔

فوزان صدیقی وہ نیک سیرت و فرض شناس انسان تھا جو ماضی کے حوالے سے اس کا محسن رہا تھا۔ فوزان صدیقی کے ذہن و دل میں لائبہ کے لیے اس وقت کی چاہت ابھی تک زندہ تھی۔ تاہم ماضی کے اس اندوہناک حادثے نے تا صرف ان دونوں کے والدین کو چھین لیا تھا بلکہ ان کی حالیہ زندگی میں بھی زہر گھوس رکھا تھا۔ جس کے سبب ان کی نیک نامی کو بھی داغ لگا تھا۔

واردات کی جانچ پڑتال کے سلسلے میں فوزان صدیقی کو بار بار لائبہ کے گھر آنا پڑتا ہے۔ جس کے سبب صفیہ جن کا کردار پہلے ہی لوگوں کے نشانے پر ہے۔ مزید افواہوں کی زد میں آتا ہے۔ ماضی کے حوالے سے لائبہ بار بار فرسٹریشن کا شکار ہو جاتی ہے۔ (اب آگے پڑھیے)

”میری خیال میری بہن تھی۔ بہت معصوم بہت پیاری میری جان تھی اس میں زندگی اور خوابوں کی اور انسانیت کی باتیں کرنے والی وہ لڑکی وحشی درندوں سے لڑ پڑی اور پھر وہ ہم سب کو چھوڑ کر چلی گئی۔ وہ اس چوڑے چکے بھر پور مرد کو دیکھے گی جس کی آنکھیں دینے کے لیے بالکل غیر ارادی طور پر اس کے مضبوط مرد نہ ہاتھ پر اپنا تھا سما سفید ہاتھ رکھ دیا۔ وہ پونک کر لائبہ کو دیکھنے لگا۔ جس کی آنکھوں میں آنسو تو جمع تھے مگر وہ انہیں اندر تارنے کے جان کر رہی تھی۔

”لائبہ آپ کو دوبارہ دیکھ کر مجھے خوشی کے ساتھ

شہود کی کہانی

سمیرا شریف طور

تخفہ میری انا کا یہ اچھا دیا گیا
مجھ کو ہی میری ذات میں الجھا دیا گیا

نا معتبر رہے جو الفاظ دیر تک

پیغام آشنائی ان ہی میں دیا گیا

پانی سے بھری ہوئی تھیں۔ آواز رقت آمیز تھی مگر وہ ساتھ بہت دکھ بھی ہوا۔ اس رات آپ کی گہری گرے آنسو بہنے کی بجائے دوبارہ کہیں اندر ہی اترنے لگے۔ گرین آنکھوں نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ بہت ہی ”اوہ... آئی ایم سوری۔“ فوزان صدیقی کو حوصلہ روئی سی ڈراور ہر اس سے مزین تھیں۔ کچھ چھین جانے

کے خوف سے بھی ہوئی لیکن اس دن آپ میں آپ کی آنکھیں دیکھ کر مجھے لگا جیسے آپ بھی نیناں کی طرح ان وحشی لوگوں کا نشانہ بن گئی ہیں۔ بہت اذیت ہوئی تھی آپ کو دیکھ کر..... آپ نے اس دن میرے کانٹیل کے بارے میں جو کچھ کہا وہ حقیقت تھا۔ دکھ تو اس بات کا تھا کہ میں انتہائی کوشش کے بعد بھی آپ کی آنکھوں سے خوف اور ہراس کو نہیں نکال پایا تھا۔ مجھے لگا جیسے اس خوف اور ہراس نے مل کر آپ کی آنکھوں میں ایک لکڑی جمادیا ہے۔ مجھتی ہیں نا لکڑی کیا ہے؟“ وہ اب اس کی گہری گریں گرین آنکھوں میں بڑی گہرائی سے جھانک رہا تھا۔ لائبہ نے اسے تسلی دینے کے لیے رکھایا یا بنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے ہٹالیا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

”پتا نہیں ضوفی کیا کر رہی تھی جو ابھی تک نہیں لوٹی تھی۔“

”آپ ایسی جگہ سے شاید کبھی بڑی ہوں جہاں سبز تھوڑی طرح سجھتی ہے۔ اگر کبھی اچانک اس تھوڑے سا پڑاؤں پر جاوے تو نیچے گہرا پانی ملتا ہے۔ پانی تو دیے ہی تھا مگر اس پانی پر کچھ جم گیا تھا۔ اچانک پاؤں پڑنے پر پانی کی سطح واضح ہوئی۔ مجھے لگتا ہے آپ کی ان آنکھوں میں بھی یہی کیفیت ہے۔ بے تحاشا رونے کی خواہش بہت کچھ کہنے کی آرزو مگر آپ اوروں کی خاطر مسلسل اپنی اس خواہش کو دوبارہ ہی ہیں۔ آپ نے اپنی آنکھوں میں مچلتے اس طوفان کے اوپر خوف کی گہری تہہ جمادی ہے جو لکڑی بن گئی ہے۔ آپ مجھ پر اعتماد کر سکتی ہیں۔ دکھ کہہ دینے سے بہت ہلکا چھلکا ہو جاتا ہے۔“ وہ بہت ہی خلوص سے پیشکش کر رہا تھا۔ ”وہ دکھ جو آپ خوفناک اور بھنبی سے بھی نہیں کہہ سکتیں۔“ اس نے لائبہ کو دیکھا جو سر کو نفی میں ہلاتے آنسو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”آپ اتنی بے اعتماد کیوں ہو گئی ہیں۔ زندگی ہر ایک کو آزماتی ہے۔ کسی پر مشکل وقت بہت دیر پا ہوتا ہے اور کسی پر بہت جلد مل جاتا ہے۔ بتائیں مجھے اس بات کے علاوہ ایسا کیا دکھ ہے آپ کو جو دیمک کی طرح اندر ہی اندر چاٹ رہا ہے؟ آپ کہنا بھی چاہتی ہیں اور کہہ بھی نہیں پاتیں۔“ وہ مسلسل اس کی روح کو ادھیڑنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ یہ آخری جملہ لائبہ کی روح پر تازیانے کی مانند لگے تھے۔ اس کی زخمی زخمی روح ذلت و تکلیف کی شدت سے بلبلانے لگی وہ بھی ایک دم چیخ اٹھی۔

”چپ ہو جائیں پلیز چپ ہو جائیں..... مجھ سے کچھ مت پوچھیں بڑی مشکل سے میں نے اپنے کرچی کرچی وجود کو اکٹھا کیا ہے۔ بڑی تکلیف سے جینے کا حوصلہ کیا ہے۔ اس دیوالوں نے بہت برا کیا میرے ساتھ آپ تو میری زخمی بلبلانی روح پر تازیانے نہ لگائیں۔“ چہرہ ہاتھوں میں چھپائے وہ ہلکے ہلکے کر رونے لگی تھی۔ وہ ترحم بھری نظروں سے اس ٹوٹی پھوٹی لڑکی کو روتے دیکھتا رہا۔

”عرصہ بیت گیا ہے مجھے یہ آبلہ پانی کا سفر برداشت کرتے۔“ اوپوں کی تحقیر بھری نظریں ان کے طنز اور تمسخر میں لیے خش جملے ایک عرصے سے سہہ رہی ہوں۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا تھا کبھی کسی کا دل نہیں دکھایا پھر یہ آزمائش ختم کیوں نہیں ہوئی۔ اگر زندگی ہر ایک کو آزماتی ہے تو چند سکھ بھری گھڑیاں بھی نصیب میں کرتی ہے پھر میری سزا اتنی طویل کیوں ہو گئی ہے؟ اتنی طویل کہ نہ میں اپنے جینے کی کوئی دعا کر سکتی ہوں اور نہ مرنے کا سامان!“ وہ ٹوٹی پھوٹی لڑکی پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے اپنا دکھ کہہ رہی تھی۔ فوزان کے اندر اک ہوک اٹھی۔ وہ جس اذیت سے گزرتی تھی اور اب جس اذیت سے گزر رہی تھی

میں ہی اذیت وہ اپنے اندر بھی محسوس کر رہا تھا۔ موت تکلیف دہ امر نہیں مگر بار بار مرنا بہت تکلیف دہ موت ہے۔ بھلا اس سے بہتر کون جان سکتا تھا۔

”بس لائبہ حوصلہ رکھیں۔ وقت ایک سانس نہیں رہتا“ زندگی اتنی ہی سنجیدہ ہے۔ اس کو سینے کے لیے بس حوصلہ بنانوں کا سا ہونا چاہیے۔“ انداز سلی دینے والا تھا۔

”ہونہہ.....! چٹانوں کا سا حوصلہ..... میں نے اس سے بڑے حوصلے کیے ہیں اپنی تڑپتی ماں کو موت کی آغوش میں سوتے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اپنے باپ کو اپنے دکھ پر جان بارتے دیکھا ہے۔ وہ دونوں چلے گئے سب ساتھ چھوڑ گئے اس کے باوجود میں زندہ ہوں کیا یہ حوصلہ کم ہے۔ اگر میں نے بنانوں کا سا حوصلہ نہ کیا ہوتا تو اس وقت آپ لائبہ کی قبر پر کھڑے ہوتے اس کے سامنے نہیں۔ سنا آپ نے.....“ لائبہ نے دوپٹے سے اپنا چہرہ صاف کرتے اس نے کہا تو فوزان ضد لقی خاموش ہو گیا۔ خاموش تو لائبہ بھی ہو گئی تھی۔ دونوں طرف بالکل خاموشی تھی یہ معنی خیز بولتی ہوئی خاموشی دونوں کے انگوٹھوں کی کوشش کر رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ خاموشی مزید گہری ہوتی، ضوفی کی تیز آواز پردوں سے اٹھ گئی تھی۔

”ار۔ فوزان صاحب آپ ابھی تک یہاں.....“

”آئی ایم سوری! بھائی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔“

”میں نے بلوایا تھا اس وقت میں نماز ادا کر رہی تھی۔“

”اس لیے دیر ہوئی۔ میں بھی شاید آپ چلے گئے ہیں۔“

”میں صدیقی اور ضوفی آئے سانس منے کھڑے تھے وہ.....“

”نہ نہیں آ رہی تھی۔ وہ جلدی سے کمری پر بیٹھ گئی۔“

”میں تیزی سے باقی ماندہ مٹر چھیلنے لگی۔ وہ نہیں.....“

”ضوفی اس کی سرخ آنکھیں اور روئی ہوئی

صورت دیکھ کر پریشان ہو جائے۔

”ہاں..... میں بس جانے ہی والا تھا۔“ فوزان صدیقی کہہ رہا تھا۔ اس کی بات پر بھی اس نے اپنا جھکا سر نہ اٹھایا۔

”یقیناً پری نے آپ کو خاصا بور کیا ہوگا؟“ ضوفی خاموش کام کرتی لائبہ کو دیکھ کر پوچھنے لگی۔

”نہیں.....! ابھی میں ان کی شگت میں بالکل بور نہیں ہوا۔ ہر مزاج کے لوگوں میں بہت جلد گل مل جاتا ہوں۔ یہ تو پھر ایک بہت اچھی بولنے والی ہیں اور میں ایک اچھا سامع۔“ اس نے ہنستے ہوئے ضوفی کی بات کی تردید کی۔

”واقعی! یہ تو بہت اچھی عادت ہے۔ آپ واحد شخص ہیں جو یہ کہہ رہے ہیں ورنہ پری سے جو بھی ملتا ہے وہ ان کی خاموش طبعی اور کم سخن پر ضرور بور ہوتا ہے۔“

”بس سمجھ لیں اپنی اپنی رائے ہے۔“ وہ اب اٹھا رہا تھا۔ مسکراہٹ خود بخود لائبہ کے ہونٹوں کو چھوئی۔ وہ قدرے سنبھل چکی تھی۔ سر اٹھا کر دونوں کو دیکھا۔ وہ واقعی اس شخص کی اس ”خاص الخاص“ شخصیت سے متاثر ہو چکی تھی پھر جلد ہی وہ اپنے سابقہ پراعتاد موڈ میں آ گئی تھی۔ ضوفی کے آنے پر وہ مزید تھوڑی دیر بیٹھ کر جانے کے لیے اٹھ گیا۔

”اوکے لائبہ! اللہ حافظ میں پھر کسی دن فرصت سے آؤں گا۔“ وہ بطور خاص اسے مخاطب کر کے جاتے جاتے بھی اپنے پر خلوص رویے کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ ضوفی اسے گیت تک باہر چھوڑنے لگی تھی اس کے واپس لوٹنے تک وہ اسی شخص کی ذات میں الجھی رہی۔

پھر وہ کئی دن تک غیر محسوس طریقے سے اس کی



منتظر رہی۔ ہر آہٹ پر چونک جاتی نہریل پر بھاگ کر گیت بھولتی فون کی گھنٹی بجتی تو ضوفی سے پہلے خود اٹھ کر ریسو کرتی۔ مگر ہر دفعہ تاامید ہو جاتی تھی۔ اندر باہر ایک بے گلی سی پھیلتی لگی تھی۔ وہ اپنی اس کیفیت پر خود بھی پریشان تھی کہ اسے اس کا انتظار کیوں تھا؟

”مجھے اس کی ذرا سی ہمدردی پر اپنی اوقات نہیں بھولنی چاہیے۔“ آخر آتا کر اس نے خود دس سرنش کی مگر پریشانی جوں کی توں برقرار تھی۔

”پری کیا بات ہے آپ مجھے کچھ پریشان لگ رہی ہیں۔“ ضوفی جو کئی دنوں سے اس کی کیفیت دیکھ رہی تھی ایک دن پوچھتی تھی۔

”کچھ نہیں ہوا۔ بس ہلکی پھٹی تھکن محسوس کر رہی ہوں آج کل۔“ اس نے ضوفی کو تو ہال دیا مگر خود گوشمال سکی۔ البتہ اتنا ہوا کہ پہلی جیسی پریشان نہیں تھی۔ کافی حد تک خود کو نرا مل کر رہا تھا۔

ضوفی کے کانٹ جانے کے بعد وہ بھی یونیورسٹی کو نکل رہی تھی جو بھی گاڑی اپنی گلی سے مڑی وہاں پوئیس پیارہ میں چند اسپرزد دیکھ کر رک گئی۔ دو پولیس کا ٹیبلر جیلہ کے اسی آوارہ بد معاش نذیر کو پکڑ کر گاڑی میں بٹھارے تھے۔ اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ہمراہ فوزان سدیقی تھا۔ انسپکٹر کی گاڑی دیکھتے ہوئے وہ جلدی سے دروازہ کھول کر اس کی طرف آ گیا۔

”السلام علیکم۔“ اسے اپنی طرف آتا دیکھ کر اپنی گاڑی کا دروازہ کھول کر وہ بھی جلدی سے اتری۔

”ولیکم السلام۔ آپ یونیورسٹی جا رہی ہیں؟“ جی۔ اس شخص کو کس جرم میں پکڑا گیا ہے؟“ اس کے بارے میں جاننے کے لیے انسپکٹر کو تجسس ہوا۔

”ہے بس اس کا بھی ایک جرم۔ آپ اس وقت یقیناً جلدی میں ہوں گی پھر کبھی ملاقات ہوں اللہ

حفظ۔“ وہ جس عجلت میں آیا تھا اسے جیسے چھوڑ کر اسی عجلت میں چلا گیا۔ وہ اس سے ”پھر کبھی“ کے بارے میں دریافت کرتے کرتے رہ گئی۔ اس کی گاڑی نظروں سے اوجھل ہوئی تو وہ بھی اندر بیٹھ کر گاڑی اشارت کرنے لگی مگر اس دفعہ جمیلہ خاتون کی بے وقت کی مداخلت نے اسے روک دیا۔

”مل گیا۔ لیکن تجھے ڈائن! میرے بچے کو رفقہ کر وا کر؟“ آتے ہی اس نے منہ آؤدیکھا نہ اس پر چڑھ دوڑی۔ وہ تو اپنی جگہ کا بکا رہ گئی۔

”دیکھیے آپ کا بیٹا جیسا اوباش فطرت ہے سارا محلہ جانتا ہے۔ مجھ پر کیوں الزام لگاتی ہیں! جہاں مجھے کیا ضرورت پڑی ہے اسے گرفتار کرنے کی؟“ ان لوگوں میں مردوں اور لوگوں کو اسے دیکھ کر اس نے ہمت کر کے کہا۔

”ارے واہ لڑکی! منہ سنبھال کر بات کر۔ تو بھی جیسی ہے تیرے بارے میں بھی سارا محلہ جانتا ہے۔

مجھے اچھی طرح خبر ہے تیرے اس بچے میں والے سے کیسے تعلقات ہیں یونہی تو روز یہاں نہیں آتا۔ تو نے رفقہ نہیں کر دیا تو تیری بہن نے تو کر دیا ہے۔ بڑی آئی تھی کل دھمکی دینے والی۔ میں تمہیں گرفتار کرادوں گی۔“ بونہہ! اپنی نہیں یہ عورت کیا کہہ رہی تھی! اس کے تو کچھ بچے نہیں پڑ رہا تھا۔ ہمت کر کے گاڑی ان لوگوں کے جھوم سے نکال کر لے آئی۔ سارا وقت یونیورسٹی میں خالی دماغ سے کام کرتی رہی۔ ٹھیک سے کچھ پڑھا بھی نہ پائی تھی۔ جیسے تیسے پیریڈ لے کر گھر لوٹی تو ضوفی آچکی تھی۔ آتے ہی اس سے پوچھ گچھ شروع کی۔

”تمہیں کچھ پتا چلا ہے جمیلہ کا بیٹا گرفتار ہو گیا ہے؟“ تفتیشی نظروں سے گھورتے بات شروع کی۔

”اچھا۔! کب ہوا؟“ بغیر چونکے اس نے

آرام سے پوچھا۔

”تم نے اسے گرفتار کروایا ہے۔ اس کی ماں ہے۔“ پری! مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کسی کو گرفتار کروانے کی؟ اس کے کرتوت تو سب ہی جانتے ہیں! سو گیا ہوا اپنے کسی کالے دھندے کی وجہ سے گرفتار۔ سر ہے اب کچھ عرصہ سکون رہے گا۔ خوشخواہ زندگی سے آتا ہٹ ہونے لگی تھی۔ اس کی بات بھی اسے منہ نہ کر پائی تھی۔

”ضوفی اب ہمارے درمیان ایسی کیا مہوئی ہوئی ہے کہ ہم ایک دوسرے سے کچھ چھپانے کی کوشش کریں۔“ اس نے ضوفی کو خاتے غت سے دیکھا۔

”پری! امیر! یقین کریں۔ آپ تو یونہی پریشان ہو رہی ہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔“ اس نے نظریں پاتے ہوئے جواب دیا۔ وہ اس کے برابر بیٹھ کر بغور دیکھنے لگی۔

”ضوفی! میری آنکھوں میں دیکھ کر بتاؤ اصل بات کیا ہے؟“ ہاتھ سے اس کا چہرہ اونچی کیا تو وہ دانت کاٹی شش و پنج میں گرفتار ہو گئی۔

”جمیلہ کا بیٹا ہر روز مجھے کانٹ آتے جاتے ٹپک لرتا تھا۔ اتنے رکیک الفاظ اور گھٹیا گفتگو کرتا تھا کہ نہ نہیں۔ کل بھی اس نے بد تمیزی کی اور میرا ہاتھ پڑا تھا۔ مجھ سے برداشت نہ ہوا اور میرا ہاتھ اس پر اٹھ گیا۔ وہ مجھے برے نتائج کی دھمکیاں دینے لگا تھا۔ میں گھبرا گئی۔ اس وقت تو گھر آ گئی بعد میں صبر کے سبب نیل ہوئی تھی میں نے جا کر ریٹ ہوا تو دونوں نے دینا تھا۔ دندنا تے ہوئے اندر گھس آئے بد تمیزی نے لگے۔ میں نے بھی شش و پنج میں تو چوکیدار نے اسے روک دیا۔ اس وقت آپ سو رہی تھیں۔

اتفاق سے فوزان بھائی بھی آ گئے۔ میں رو رہی تھی وہ پریشان ہو گئے اور مجھ سے تمام صورت حال اگلوالی مجھے تسلی دی۔ مجھے نہیں پتا تھا وہ اسے واقعی گرفتار کر لیں گے۔“

ساری بات سن کر وہ اپنی جگہ پر ساکت ہی ہو گئی۔ پتا نہیں انہی کے ساتھ ہر بار ایسا کیوں ہو رہا ہے؟“ اس نے اس شخص نے کچھ کر دکھایا تو۔ یہ خیال انسپکٹر کی جان نکال دینے کو کافی تھا۔

”ضوفی! تم نے مجھے یہ سب کچھ کل ہی کیوں نہیں بتایا۔؟“

”آپ پریشان ہو جاتیں اس لیے۔۔۔۔۔“ اس نے اس کا ہاتھ تھام کر اس کا غصہ کم کرنے کی کوشش کی۔

”اب تو یقیناً میں بہت خوش ہو رہی ہوں۔“ اس نے طنز یہ کہتے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

”کیا ہو گیا ہے پری! آپ کو؟“ اچھا ہوا وہ گرفتار ہو گیا ہے۔ چند سال تو سکون سے مڑ رہی گے۔ پہلے بھی وہ پولیس کوئی مقدمہ میں مطلوب ہے چوری اور کل کے جرم اس پر عائد ہیں جب بھی پکڑا جاتا تھا کچھ دے والا گرفتار ہو جاتا تھا اگر اب اس دفعہ میرے ہاتھوں میں پھنسا ہے اتنی جلدی جان چھوٹنے والی نہیں۔ آپ پریشان مت ہوں۔ وہ رساں سے اسے سمجھانے لگی۔

”خاک پریشان نہ ہوں اتنا تو اشد در سوخ ہے اس کا۔ اب بھی اگر وہ بچ گیا اور اس نے کوئی ایسی سیدھی حرمت کر دی تو بواو کیا کریں گے ہم؟“ خدا نخواستہ اس نے اتر تم کو۔ وہ رک گئی۔ وہ تو تصور کر کے ہی کانپ گئی۔ کسی قسم کی غلط بات ذہن میں نہ لائی۔ ضوفی سے فارغ ہو کر اس نے پہلی فرصت میں فوزان صدیقی سے رابطہ کیا تھا۔

”فوزان صدیقی صاحب! میں انسپکٹر۔ پہلے

بھابی کو ساری صورت احوال بتا کر پھر ان ہی کے مشورے سے وہ ان ہی کے گھر سے فوزان کے آفس فون کر رہی تھی۔

”ارے آپ.....! کیسے یاد کیا آپ نے اس وقت؟“ دوسری طرف سے اس کی آواز آئی تھی۔

”آپ آج رات فارغ ہوں گے میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔“ اس نے ملنے کی وجہ بتانے سے گریز ہی کیا وہ کچھ دیر سوچتا رہا تھا پھر بولا۔

”آئی ایم سوری لائیب! میں آج رات کیا پورا ہفتہ ہی فارغ نہیں ہوں۔ ایک بہت ضروری کیس کی جانچ پڑتال میں پورا ہفتہ شہر سے باہر ہی گزاروں گا۔ ابھی میں نکلنے ہی والا تھا۔ پلیز براست مایے گا۔ آج کل کام کا بہت بوجھ ہے سر کھانے کی بھی فرصت نہیں۔ ان شاء اللہ میں جیسے ہی فارغ ہوا آپ کی طرف آؤں گا۔“ معذرت خواہانہ لہجے میں وہ بات کر رہا تھا۔

”ٹھیک ہے میں آپ کی واپسی کا انتظار کروں گی۔“ بڑی ناامید ہو کر اس نے فون بند کیا تھا۔ اب اسے نبھانے کے لئے دن انتظار کی سولی پر بند رہنا پڑے گا۔ بہن کو مصروفیت کا بتا کر وہ اپنے پورشن میں آگئی۔ بڑی مشکلوں سے اس نے ایک ہفتہ گزارا تھا۔ ہفتہ گزرنے کے بعد اس نے متواتر دو دن تک فوزان صدیقی کو فون کیا مگر مل ہی نہیں رہا تھا۔ وہ جب ناامید ہو گئی تو وہ خود چلا آیا۔ آنے سے پہلے اس نے فون کر کے اسے اپنی آمد کی اطلاع دی تھی۔ وہ جب ان کے ہاں آیا تو اس نے خود ہی اس کے لیے گیٹ کھولا تھا۔

”خیریت! آپ بہت پریشان لگ رہی ہیں؟“ صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس نے بغور لائیب کا جائزہ لیا۔ وہ قصداً مسکراتے ہوئے اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

”آپ بتائیے جس کام کے لیے آپ شہر سے

باہر گئے تھے وہ ہو گیا۔“

”جی۔! کافی حد تک ہو گیا ہے۔“

”مبارک ہو۔“

”شکریہ آپ نے بتایا نہیں آپ پریشان کیوں ہیں۔“ وہ ایک دفعہ پھر اسی بات پر آ گیا۔ وہ کوئی بھی جواب دیے بغیر اس کے لیے چائے کا انتظام کرنے اٹھ گئی۔ پھر اچانک رک گئی۔

”آپ کھانا کھائیں گے یا چائے پیئیں گے؟“ اس نے کافی پرسکون انداز میں بیٹھے فوزان سے پوچھا۔

”آپ کیا چاہتی ہیں؟“ مسکراتے ہوئے اس نے نیا سوال داغ دیا۔ اس نے یونہی کندھے اچکائے۔

”میرا خیال ہے یہ کھانے کا وقت ہے میں کھانا لگواتی ہوں۔“ آداب میزبانی نبھانے کو وہ اٹھ کر کچن میں چلی آئی۔ صوفی کے ساتھ مل کر میز پر کھانا لگوا دیا پھر خود ہی وہ اسے کھانے کی میز پر لگائی۔

”سیدھا آفس سے ادھر آ رہا ہوں کھانے کی شدید طلب مجھے بھی ہو رہی تھی۔“ ان دونوں کے ساتھ کھانے کی میز پر بیٹھتے ہوئے اس نے کافی بے تکلفی سے کہا تھا۔ کھانا بالکل خاموشی سے کھایا گیا تھا۔ دونوں میزبانی کے فرائض انجام دیتے ہوئے وقفہ وقفے سے اسے مختلف چیزیں پیش کرتی رہیں۔ کھانا کھا کر وہ لاؤنج میں آگئے تو صوفی ان کے لیے چائے لیے چلی آئی۔ دونوں کو باری باری کپ تھمانے کے بعد ایک کپ خود بھی لے کر وہاں بیٹھنے لگی تو اس نے اسے ٹوک دیا۔

”تمہیں پڑھنا نہیں جاؤ جا کر اپنی اسٹڈی کرو۔“ اس کے سخت لہجے پر جہاں وہ منہ بسورتی باہر نکل گئی تھی وہاں فوزان صدیقی بھی چونکا۔

”آخر بات کیا ہے آپ اتنا سسپنس کیوں پھیلا رہی ہیں؟“

”آپ اچھی طرح جانتے ہیں کیا بات ہے؟“ غصے اور ناراضگی کے ملے جلے تاثرات سے اسے گھورا۔ انداز یوں تھا جیسے کہہ رہی ہو یہ قوف کسی اور کو بنا بیٹے۔

”نہیں.....! باخدا مجھے کبھی الہام نہیں ہوتا۔ میں بالکل نہیں جانتا کیا بات ہے؟“ وہ اتنے دنوں سے انتظار کر رہی تھی اس وقت اس جملے بازی کی تحمل نہ تھی۔ فوراً تیغ نئی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

”پلیز!۔! ایس پی فوزان صدیقی صاحب۔“ آواز میں آنسوؤں کی آمیزش نمایاں تھی۔

”مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا آپ مجھ سے کیوں ناراض ہو رہی ہیں؟ میں نے تو ایسی کوئی کوتاہی نہیں کی۔ جیسے ہی فارغ ہوا ہوں فوراً آ گیا ہوں۔“ چائے کا خالی لگ میز پر رکھ کر وہ اس کے سامنے آ گیا۔

”صوفی نادان تھی جذباتی تھی آپ تو سمجھدار تھے مجھے آپ سے اس بات کی توقع نہ تھی۔“

”اوہ اب سمجھا۔“ اس نے ہونٹ سکیڑے۔

”اس مسئلے پر آپ کو مجھ سے ناراض نہیں ہونا چاہیے بلکہ خوش ہوں کہ وہ شخص رفتار ہو چکا ہے۔“ اس نے پرسکون انداز میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”یہ آپ پولیس والوں کی عادت ہوگی اور وہ انیت دے کر خوش ہونے کی۔ میری نہیں۔“

”ہاں ہم پولیس والوں کی یہ عادت ہے دشمن کو اذیت دے کر خوش ہونے کی اس کے باوجود میں اسے نہیں چھوڑ سکتا۔“ یہ بات کہتے ہوئے اس کے لہجے میں ہلکی سی سختی تھی۔ ”ہاں یہ ہو سکتا ہے میں یہ پولیس کی جاب چھوڑنے پر سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دوں۔ ساری زندگی آپ کا غصہ سہنا کافی مشکل کام ہے۔“ یہ بات کہتے کہتے وہ پھر غیر سنجیدہ ہو چکا تھا۔ وہ نا بھی اسے دیکھنے لگی۔

”آپ اسے چھوڑیں گے نہیں..... میرے کہنے پر بھی نہیں؟“ پتا نہیں اس کے لہجے میں کیسا مان اور یقین گونج رہا تھا وہ بے اختیار اسے دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کی نظروں کے ارتکاز سے پاگل کر اس نے رخ موڑ لیا تھا۔

”ہاں آپ کے کہنے پر بھی نہیں..... بالکل نہیں.....“ لائیب کے رخ موڑنے پر اک سکوت ٹوٹ گیا تھا۔ وہ گہری سانس لے کر فنی میں سر ہلانے لگا۔

”کیوں آپ اسے کیوں نہیں چھوڑ سکتے جبکہ یہ آپ کے اختیار میں ہے۔“ وہ الجھتے ہوئے اس سے بحث کے موڑ میں تھی۔

”اس لیے کہ لائیب آپ ایک غلط آدمی کی سفارش کر رہی ہیں۔ آپ اس شخص کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں۔ سوائے اس کے کہ اس نے صوفی کو تنگ کیا تھا۔“

”میں کچھ بھی نہیں جانتا چاہتی میں نہیں چاہتی کہ اس شخص کی وجہ سے صوفی کی بدنامی ہو جبکہ اس کی ماں آج کل کلنگی تلوار بنی ہوئی ہے۔ نجانے کیا کیا کہانیاں گھڑی ہیں اس نے ہمارے اور آپ کے متعلق۔“ ایک دم اس نے اصل بات کہہ دی تھی۔ فوزان خاصا مطمئن ہو گیا۔

”تو ٹھیک ہے اس کی ماں کا بندوبست کر لیتے

ہیں۔ چند دن تارک کوٹ میں رہے کی تو عقل آجائے۔ ”سکرات ہوئے اس نے کیا لو کھا حل پیش کیا تھا۔ لائبہ کو سخت ہنسا لگا۔ وہ بے یقینی سے استہیضہ کی۔

”آپ! آپ! وہ ایک دم ہنٹ بھینٹ کر بالکل چپ ہوئی۔

”لائبہ! آپ بہت سیدھی ہیں۔ چہم بے وقوف بھی۔ کیچیں وہ شخص بہت بڑا مجرم ہے۔ چند ماہ پہلے اس نے ایک لڑکیا تھا۔ پڑا گیا، پھر دے دیا اگر اس نے بعد میں ضمانت بھی کروائی۔ مقول کے ساتھ کافی اثر و رسوخ رکھتے ہیں انہوں نے دوبارہ سے کیس شروع کروایا ہے۔ عدالت نے اس کی ضمانت کیمنسل کر دی تھی۔ وہ کافی عرصے سے رہ پڑا تھا۔ چنانچہ یہ تھا کہ میرے نذر آتا ہے ہی لیے مجھے نوکریں کیس کی پڑتاں کرنے وہاں گیا تھا۔ میں کافی عرصے سے اسے ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ وہ یہاں اپنی فیملی کے ساتھ وقت نہیں گزارتا، کبھی کبھی آتا تھا مگر بہت بات نہیں کرتا تھا۔ آج کل اس کے سب کچھ پتہ چل گیا ہے۔ یہی ہے اس کی شہادت پر کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ ضحویٰ کی شہادت پر میں نے اپنا ایک ایکشن لیا تھا تو یہ ہی شخص تھا۔ ہمارا کام آسان ہو گیا۔ مجھے علم تھا آپ بار بار کیوں فون کر رہی ہیں مجھ سے کیوں ملنا چاہتی ہیں اسی لیے میں یہ کام نمٹا کر آنا چاہتا تھا۔ اپنے یہاں آنے سے پہلے میں اسے جیل بھیج کر رہا ہوں۔“ وہ کافی مطمئن انداز میں بتا رہا تھا۔

”آپ کو یہ سب کرنے سے پہلے کچھ نہ کچھ تو بتانا چاہیے تھا نا؟“ اپنے اعصاب اور ذہن کو مطمئن کرتے

کرتے پھر سوال کر بیٹھی۔

”کیا بتانا آپ کو...؟ ہم پولیس والے اگر اپنے سب کیس کی سے دیکھیں کرتے لگیں تو پکڑ جائیں گے۔“ وہ ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”پھر آپ کو کیا پتا اس نے ضحویٰ کو کیا دھمکی دی تھی؟“ اس نے خالی خالی نظریں فوزان کی آنکھوں میں گاڑ دیں۔ ضحویٰ نے اسے ساری بات نہ دے بتائی تھی۔ کیا دھمکی دی ہے اس بارے میں تو ضحویٰ نے نہیں بتایا تھا۔

”اس شخص نے ضحویٰ کو اٹھوا لینے کی چٹائی دی تھی شاید اس دن عمل بھی کر چکا ہوتا، کیونکہ وہ ایک کوشش نہ کر چکا تھا۔“ وہ حیران بھتی پھٹی آنکھوں سے اس سامنے والی شخصیت کو دیکھنے لگی۔ کانوں کو اس انکشاف پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ ”وہ تو خوش قسمتی سے جب وہ دونوں ماں بیٹا زبردستی آپ کے گھر میں داخل ہوئے تو چونکہ اسے گھر میں گیا ہوا تھا۔ جب وہ زبردستی ضحویٰ کو چٹائی پر لے جا رہے تھے تو وہ آگیا اور اس نے سن کی نوک پر انہیں کھینچ کر اپنے گھر میں لے کر دیا تھا۔“ وہ یہ سب جانتی تھی مگر اندر کی باریک بینی اس کے علم میں نہیں تھی۔

”مگر چونکہ اس نے تو مجھے کچھ نہیں بتایا۔“ کانپتے ہوئے اس سے یہ جملہ پورا کیا۔

”اس واقعے کے فوراً بعد میرا ادھر آنا ہوا تو چونکہ کیدار نے مجھے سب بتا دیا۔ میں نے اسے کسی سے بھی ذکر کرنے سے منع کر دیا تھا۔ اور ضحویٰ کو بھی منع کر دیا خواہ وہ آپ پریشان ہوتیں۔“

”وہ میرے خدا! اب کیا ہو گا؟“ وہ زور و شور سے رونے لگی۔ اتنا کچھ ہو چکا تھا اور اسے کچھ خبر ہی نہیں تھی۔ وہ کسی بہن تھی۔ اس کی یہ کیسی محبت تھی کہ بہن پر ہنسنے والی قیامت کا اسے اندازہ ہی نہیں ہوا تھا۔

”لائبہ! پریشان مت ہوں۔ الحمد للہ سب ٹھیک

ہو گا۔“ اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کی طبیعت کو نرم کرنے کی کوشش کی۔

”فانی کی بات پر یوں ہراساں ہوئی ہو گی۔ فانی اور شہدائے یہ بھی نہیں بتایا ہو گا۔“ وہ کہہ رہی تھی۔ ”میں نے ان لوگوں میں بھی یہ شخص لائبہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل

پڑا۔ میں تو گرفتار کیا گیا تو انہوں نے باوجود اپنے پیوتے سائی کا ذکر نہیں کیا۔ انہوں نے نہ صرف میں تھا اب اس کے بعد ہم نے اس کے اگلے پچھلے سب کچھ کی حقیقت کی تو اس نے خود یہ اگلا۔ اس نے کہا کہ اس کی شہادت ہی سہی ہے۔ وہ

ہانا تھا کہ ان دنوں شہود یہاں پر نہیں ہے اس کے اور اس کے ساتھیوں کے ارادے انتہائی گھٹیا تھے انہوں نے تو اقرار کیا ہے۔ یہ تو شکر تھا کہ اللہ نے آپ کو اس کی حقیقت کی طرف اشارہ کر دیا۔“ وہ رک کر اس کی

آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ فانی پر خوف و ہراس نے غلبہ کر دیا تھا۔ ”اب اللہ تعالیٰ پر تو ان کی بات کو دیکھنا۔“ وہ کہہ رہی تھی۔ ”وہ کیسے کیسے فانی کی طریقے سے سبیل نکال دیتا ہے۔ اس نے خود اقرار کیا ہے کہ وہ لوگ انتہائی کوشش کے باوجود آپ

کو مارنے کا ارادہ نہ ہونے پر توڑنے میں ناکام ہوئے۔“ وہ سب اختیار رکھنے میں فانی کی۔ سامنے بیٹھے شخص کے سامنے یہ ذات یہ ذاتی امر یہ بے چارہ۔ اس کا مرجانے کو ہی چاہا۔

”یہ یہ بھی ابھی ہونا تھا۔ یہ بھی سننا تھا؟“ وہ کہہ رہی تھی۔ اس قدر ذمت کے بعد اسے پاس سے آنسوؤں کے اور کوئی راہ فرار

نہیں تھی۔

”لائبہ! پلیز خود کو سنبھالیں، وہ شخص اب کچھ نہیں کر سکتا گا۔ وہ جس جگہ پر ہے وہاں سے نکلنا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ میں ان چند دنوں میں اس کے فرار کی ہر راہ بند کر آیا ہوں۔ اب آپ واس کی طرف سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔“ وہ بہت اپنائیت اور سجاوٹ سے کہہ رہا تھا۔

”مایا پاپا آج زندہ ہوتے تو زندی قدرے مختلف ہوتی۔“ اس نے یہ سب تو نہ بولا۔ زندی یوں ہمارے بچوں کی زندگی کا۔ اب تک وہ ضحویٰ کی کہیں نہ تھیں شادی کر چکے ہوتے مگر میں کیا کروں اس کے لیے کوئی اچھا رشتہ آتا ہی نہیں۔ وہ بھی کسی کے لیے نہیں مانتی۔ وہ مجھے تنہا چھوڑ کر جانے پر آمادہ نہیں۔ بس یہ

بھابی شاید اسے مزے میں کوئی امید تو دے دے۔ اس نے اپنے بھائی پر سراسر محبت و رچہ سے رشتہ توڑ دیا۔ وہ شاید خود کو فانی میں دیکھ رہی تھی۔ فانی اس کے ساتھ عدالت پر بیٹھ گیا۔ اس وقت وہ بہت کھری کھری بات کر رہی تھی۔ انہوں نے اس کا ہاتھ تھام کر دوسرے ہاتھ سے اس کے لیے سہانا شام کھا دیا۔

”اب تک اس شخص کا فیصلہ ہو جائے گا۔“ اپنے ساتھ بیٹھے فوزان کو دیکھتے کی۔

”ابھی تو اس کا مقدمہ عدالت میں چلے گا۔ پھر ہی کوئی فیصلہ ہو گا۔“

”جسے تو بہت ڈرنے لگا اب۔ اس سے پہلے کہ وہ شخص دوبارہ ہمارے پاس آئے میں اس سے پہلے ضحویٰ کی شادی کر دینا چاہتی ہوں۔ مگر اتنی جلدی کون اس سے شادی کرے گا کہاں سے رشتہ لاؤں؟“ جو کبھی رشتہ آتا

تو میری وجہ سے واپس چلا جاتا ہے۔ ”فوزان اندازہ لگا۔ کا وہ اتنے قریبی ہے یا خود تہہ رہی ہے۔“

”آپ لائبہ! بے فکر ہو جائیے۔ میں ہوں نا میری نظر میں ایک بہت اچھا رشتہ ہے۔ چند ایک دنوں میں

We at Paksociety.com
giving you the facility to
download urdu novels,monthly
digest,imran series etc with
direct links and alternatively
21 other mirrors.
for complaint about site not
opening contact us @
admin@paksociety.com or
message at 0336-5557121

”امی کے بعد یوں پایا کی اچانک وفات سے ہم دونوں بالکل تنہا ہو گئی تھیں۔ ماما پایا کے بغیر تو زندگی کا تصور ہی ناممکن تھا۔ اگر ان حالات میں بھیا بھانی ساتھ نہ دیتے تو اتنا کٹھن سفر کبھی بھی سہل نہ ہوتا۔ بہت کچھ برداشت کیا ہے ہم دونوں نے۔۔۔ اپنی طرف سے تو میں نے پوری کوشش کی کہ ضوفی کو ماما پایا جیسا پیار دوں ہر وہ چیز مہیا کروں جو وہ کر سکتے تھے مگر بعض معاملات میں خود بے بس ہو جاتی ہوں۔ پایا کی شدید خواہش تھی کہ ان کی زندگی میں ہی ضوفی اپنے گھر کی ہو جائے مگر امی کی طرح انہیں بھی قدرت نے اتنا موقع ہی نہ دیا کہ وہ اس وقت کا انتظار کرتے۔ جاتے جاتے بھی انہیں صرف ہماری فکر تھی۔ انہوں نے ضوفی کو کسی بھی محرومی سے بچانے کے لیے مجھ سے اور بھائی سے وعدہ لیا تھا مگر میری وجہ سے وہ ہر بار دیکھی ہو جاتی ہے۔ میرے مقدر کی سیاحتی اس کا مستقبل تباہ کیے دے رہی ہے۔ لوگ آتے ہیں دیکھتے ہیں اچھے جاتے ہیں مگر دوبارہ لوٹ کر نہیں آتے۔“

”آپ اتنی شکست و ریخت کا شکار کیوں ہو رہی ہیں اتنی ناامید کیوں ہیں؟ میں نے کہا میں سب سنبھال لوں گا آپ بے فکر رہیے میں ہوں نا۔“ وہ اس کے اندر امید کی کرن چکانا چہ رہا تھا۔ مایوسی کی گہری پاتال سے باہر پہنچ نکال لانا چاہتا تھا۔ وہ اس کے تمام آنسو اپنی پوروں سے چھنے کی انتہائی خواہش رکھتا تھا۔ ایک عرصے سے گہری گرے ترین آنکھیں اسے پریشان کیے ہوئے تھیں وہ ان آنکھوں کو زندگی کی نئی انوکھی اور محبت بھری جوت بخشنا چاہتا تھا۔ وہ اس کے بکھرے بکھریو جو خود کو خود میں سمیٹ لینا چاہتا تھا لیکن ابھی شاید وہ وقت نہیں آیا تھا ابھی تو اسے اس کے تمام راستے ہموار کرنے تھے اس کے اندر زندگی سے لڑنے کا جذبہ پیدا کرنا تھا۔ ابھی جلدی ممکن نہیں تھی ابھی تو

اسے آپ سے ملنا تھا۔“ فوزان کی بات پر بہت چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ بڑی تیزی سے اس کا ذہن کچھ سوچ رہا تھا۔

یہ شخص ہر مشکل میں اس کے کام آ رہا تھا۔ جب سے ملا تھا بہت اپنائیت اور خلوص سے مدد کر رہا تھا۔ ہر ملاقات میں اس کی اہمیت اس کی نظر میں بڑھتی جا رہی تھی۔ اتنا مضبوط باحوصلہ اور ہارسوخ شخصیت رکھتا تھا۔ حالات کو اپنے حق میں ہموار کرنے کا پورا حوصلہ رکھتا تھا۔ ایسے ہی مرد تو لڑکیوں کے آئیڈل ہوتے ہیں جو کسی لڑکی کو تحفظ دے دے۔ وہ اس کی عزت کرنے لگتی ہے۔ وہ اسے بار بار آزمائشیں بھیجتی تھی تو پھر کیوں نا وہ اسے ضوفی سے شادی کے لیے کہہ کر دیکھ لے۔ وہ یقیناً انکار نہیں کرے گا۔ کوئی اور رشتہ چاہے کتنا ہی اچھا ہیوں نہ ہو وہ فوزان صدیقی جیسا تو نہیں ہوگا۔ یہ خیال بچکی کی طرح ذہن میں کوندا تھا۔ وہ ایک دم پر جوش ہوئی ساری تقاریرات ساری پریشانی ایک آنٹنم ہوئی تھی۔ چہرے پر اک روشنی سی ابھر آئی۔ ضوفی نے یہ فوزان صدیقی سے بہتر ساتھی اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک بہن کی سوچ تھی۔ واقعی فوزان صدیقی نے پہلی ملاقات سے لے کر اب تک اس کی تمام مشکلوں کو حل کیا تھا۔ اس کی پراہ کے ہر کانٹے کو ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ جب یہ شخص اس کے ساتھ اتنا مخلص ہے تو ضوفی تو پھر پاک صاف لڑکی ہے۔ بالکل ایک ایسی لڑکی جس کی کوئی بھی این آدم آرزو کر سکتا ہے جو کسی کی بھی من چاہی خواہش ہو سکتی ہے تو پھر یہ بہترین شخص ضوفی کا مقدر کیوں نہیں بن سکتا۔ ضوفی ہر طرح سے عمل لڑکی ہے انکار کی تو نجائش ہی نہیں وہ خاموشی سے اس سے بڑے سبھاؤ سے بات کرنے کے لیے لفظوں کے تانے بانے بنتی تھی۔ مناسب الفاظ تلاش کر لیتی تھی۔

اس کو تمام نئی خوشیاں واپس اوتانی تھیں اور اس کی سب سے بڑی خوشی صوفی کی شادی تھی۔ ابھی اسے انتظار کرنا تھا اور ان سب سے پہلے اس کے اندر اسے امید کی لونی لڑی کو جوڑنا تھا۔

”ہاں! آپ ہیں نا۔ آپ جو بن گئے میری ہر بات سمجھ جاتے ہیں۔ آپ نے میرا ہمیشہ ساتھ دیا ہے، پر خوس مدد کی ہے، چاہے وہ کوئی بھی موقع ہو، آپ کے اس قدر احسان ہیں مجھ پر کہ میں کوشش کے باوجود نہیں اتار ماؤں گی۔ میں تو۔۔۔“

”خدا کے لیے لایا گیا ہے یہ تو میری بھی خواہش ہے آپ کو خوش دیکھنا“ آپ مجھے کیوں شرمندہ کر رہی ہیں یہ تو میرا فرض تھا“ فوزان نے درمیان میں ہی اس کی بات کاٹ کر اتنا مزید کچھ بھی کہنے سے روک دیا۔

”نوزان صاحب! آپ میری ایک بات
 نہیں کہے؟“ کچھ جھنجکتا ہوا اصل بات کی
 طرف آئی۔

آپ یہ نہیں سوچیے۔ میں اپنی پوری کوشش
کروں گا۔ اس نے اسے ہمت دلائی۔

”وہ میں چاہ“ وہ رک گئی۔ یہ اتنی بڑی بات
 رو رہی تھی کہ مقابل کے سامنے ہچکچاہ رہی تھی۔ اس نے
 فی آکھسولی سے اس شخص کی اپنے یہ آنکھوں کی
 تک دیکھی تھی پھر بھی وہ اتنا بڑا رسک لے رہی تھی
 صرف اور صرف ضوئی کے بہتر مستقبل کے لیے۔
 انہیں وہ کیا جواب دے اسے یہ بات اچھی بھی لگے
 یا نہیں۔ اس کا سر پٹ دوڑتا دل اندر ہی اندر ڈر بھی
 باتیں۔

”میں مانا پیپا کا وعدہ پورا کرنا چاہتی ہوں۔ میں
وکی اور ایسی صورت حال پیش آنے سے پہلے غصہ
و مضبوط ہاتھوں میں دیکھنا چاہتی ہوں۔ آپ مجھ پر

ایک آخری احسان کریں۔ آپ۔ آپ۔ ضحویٰ
سے شادی کر لیں۔‘ وہ اٹک اٹک کر نظروں کو جھکائے
کہہ رہی تھی۔

”کیا...؟“ ایک دھماکا تھا جو فو زان صدیقی کے اعصاب پر ہوا تھا۔ ایک خواب تھا جو یوں چکنا چور ہوا تھا، ایک کل تھا احساسات کا جو ان میں زمیں بوس ہوا تھا۔ ایک اعتماد تھا جو ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گیا تھا۔ وہ ششدر سا یکدم اٹھ کھڑا ہوا۔ بے یقین فکروں سے لائبہ کودیکھے گیا۔ آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا اتنی بڑی بات لائبہ افتخار نے کہی ہے۔ جس کے بارے میں نجانے کیا کیا جذبات دل میں محفوظ رکھے ہوئے تھے۔ کیا انوکھے خواب دیکھے تھے۔

پانگل ہو گئی ہو تم، دوش میں تو ہو۔ جانتی ہو کیا کہہ
 رہی ہو؟ وہ تمام لحاظ بالائے طاق رکھتے انہ پر برس
 پڑا۔ سوچ بھی نہیں سکتا تھا یہ لڑکی، یہ انہمہ افتخار جسے وہ
 دل کی بستی کی مالک بنائے بیٹھا تھا: وہ یوں اس کے
 احسانوں کا پہرہ کر اس کے منہ پر تمام بدت مارے گی۔
 یہ لڑکی جسے کالج سے بھی تازک تشہر کر کے اس کو کر پتی
 کر چکی ہونے سے بچار ہاتھ۔ وہ اسے ہی زخمی کر دے
 گی۔ اس قدر مال شور مچنے لگا تھا کہ وہ اپنی کیفیت
 بھی نہیں سمجھ رہا تھا۔

”ہاں“ جانتی ہوں میں کیا کہہ رہی ہوں۔ اگر آپ کو میری اتنی ہی پروا ہے تو ہمارے درمیانے کا اتنا ہی فرق ہے تو پھر اس بات میں کیا مضائقہ ہے؟ جب مجھے میری مدد کی ہے اس طرح ضو فی کا خیال رکھا ہے تو پھر اس میں کیا حرج ہے؟ ضو فشتاں پر بھی لکھی ہوئی ہے کہ وہ اس کی بہت سی باتیں لکھنے اور سننے پہنچے۔ ہر فرد کے لئے اس کا سلیقہ ہے اور کیا چاہیے آپ کو۔ ہر فرد کے لئے جو ایک آئینہ ہے اس کی میں نے یہی وہ اس

میں ہے۔ آپ کو بھی تو کسی نہ کسی سے شادی کرنی ہی
ہے تو پھر اس ”کسی نہ کسی“ میں ضوئی کیوں نہیں
استی۔ کیا کمی ہے اس میں۔ وہ یوں اس کے بلبلانہ
رچنے پر بول اٹھی تھی۔ اسے امید نہیں تھی کہ وہ اس
بری طرح پرہم ہوگا یوں بلا سوچے سمجھے فوراً انکار
کر دے گا۔ وہ تو پتھر بنا اسے دیکھ رہا تھا اس کی آواز
سن کر بھی دل کا شور کم نہیں ہوا تھا۔ کان یقین پر آماہ
میں ہوئے تھے۔

”میں سوچ بھی نہیں سکتا! اب! آپ میرے لیے ایسی بات کہیں گی۔ وہ لڑکی جسے میں نے آج تک کسی غریبی فکر سے دیکھا ہے! آپ اس سے مجھ کو شادی کرنے کا کہہ رہی ہیں۔ جتنی غلط بات کہی ہے آپ نے! آپ نے یہ سوچ بھی کیسے لیا؟“ وہ اس پر دیا انوں کی طرح برہم ہوتا ہوا باز پرس کر رہا تھا۔ وہ تیز اسّا خائف ہوئی۔

”یہ اتنی غلط بات بھی تو نہیں۔ وہ نامحرم ہے محرم تو نہیں ہے آپ کی۔ جس کے بارے میں سوچتے ہو آپ گھبرا سکیں۔ اب سوچ لیجیے۔ ویسے بھی وہ پوری طرح اپنے موقف پر ڈلی ہوئی تھی۔ وہ بے ہرحال میں قائل کرنا چاہتی تھی اس کے پاس اس کے لئے ہزار مداخلتیں بھی تھیں۔“

”بس کیجیے انبیاۃ الفتار صاحبہ بس!“ اس نے
 کہا اٹھا کرات مزید چھ پہنے سے روک دیا۔ انبیا کی
 ات نے اس کے دل پر آ رہے چلا دیئے تھے۔ اس
 نے وجود کو کانٹوں پر گھسیٹ لیا تھا برداشت جواب
 دینے لگی، و ساری احتیاطیں بھول بیٹھا۔ ایک دم اس
 کی طرف آ گئی۔ اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کر
 وہ کہا ”ایا تھا۔ انبیا کا دوپٹا اس پیش قدمی پر کندھوں
 سے ٹک کر بائیں بازو پر آ کر اٹھا۔ انبیا بولا اس
 نے ”خدا ہے نوران صمد لقی کیجئے“ دی ہاتھوں کے دباؤ

سے نہیں دیئے جائیں گے۔

”محرم تو آپ بھی نہیں، نامحرم ہی آپ میں میرے لیے پھر ضوفشاں کیوں؟ آپ کیوں نہیں؟“

ضوفنی کے لیے تو میں نے ایک بہت اچھا لڑکا سوچ رکھا تھا ایک ایسا لڑکا جیسا ایک محبت کرنے والا بھائی اپنی بہن کے لیے سوچ سکتا ہے لیکن آپ آپ نے تو لالہ بہن میں یقین نہیں کرتا آپ نے میری آنکھوں میں کبھی تحریر نہ پڑھی ہو۔ میرے جذباتوں کی آج آپ تک نہ پہنچی ہو۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ میں نے تو ضوفنی کے لیے زبیر کے بارے میں سوچ رکھا تھا۔ اُسر یہ معاملہ درمیان میں نہ ہوتا تو اب تک میرے گھر والے آپ لوگوں سے اس سلسلے میں بات کر چکے ہوتے۔ میں نے آپ کو اس لیے نہیں بتایا کہ میں آپ کو سر پر اندر دینا چاہتا تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا جب یہ اچانک خوشی سنیں گی تو آپ کی سرے لرین آنکھوں سے ڈر خوف کی لپٹی لکڑ کی تہہ اتر کر آپ کی آنکھوں میں کتنے جگنو جگمگائیں گے مگر لالہ بہن آپ نے سارا کچھ میرے منہ پر اچھال دیا ہے۔ جو لوگ ذلت کی تکلیف سے گزرتے ہیں وہ دوسروں کو کبھی نہیں آزماتے اور آپ نے کب محسوس کیا کہ میں ضوفشاں میں دلچسپی رکھتا ہوں۔ بتائیں کب آپ نے میری آنکھوں میں ایسی گندگی محسوس کی کہ ایسی بات کہہ دی؟ آپ کیا جانتیں؟ مجھے کتنی تکلیف ہو رہی ہے۔ میں تو اپنی نظروں سے گزرنے لگا ہوں۔ وہ اس کے کندھوں کو تھامے ایسے دل رفته انداز میں سب ہمہ رہا تھا وہ جو اس کو قائل کرنے کے لیے ہزار جواز سوچ چکی تھی اس قدر شدید رد عمل پر اپنی جگہ شرمندہ ہو کر رہ گئی۔ اس نے آج سے پہلے کبھی بھی فوزان صدیقی کو اس قدر ٹوٹا پھوٹا اور جذباتیت میں اس قدر بے اختیاری میں اپنی طرف ہڑتے نہیں دیکھا تھا۔ اس کی

نظریں جھک گئیں۔

”الانبا! آپ نے میرے ہمدردی جتانے میرے پر خلوص مظاہرے کو غلط نگاہ سے دیکھا ہے مجھے آپ سے تعلق خاطر کا کوئی دعویٰ نہیں۔ پہلی نظر ہاں لائے بہ افتخار وہ پہلی نظر ہی تھی جب آپ میرے اندر تک اتر گئی تھیں۔ میں چاہوں بھی تو آپ سے کٹ کر نہیں رہ سکتا۔ صرف ایک جھٹک دیکھ کر ایک ملاقات کے بعد اپنی ساری زندگی آپ کے نام بے سوچے سمجھے کر دی تو کوئی مطلب یا چاہ نہیں کی تھی۔ قدرت نے دوبارہ ہم دونوں کو ملایا ہے تو میں نے سوچا یہ موقع نہیں کھونے دوں گا، بہت عرصہ انتظار کیا اب موسموں کو بے رنگ نہیں کروں گا۔ کچھ خون کی طرح وجود میں گردش کرتے ہیں آپ بھی ان ہی میں شامل ہیں مجھے اپنی ذات کا حصہ لگتی ہیں جس کے لیے خود قدرت نے مجھے آپ کے پاس اچانک بھیجا تھا میرے دل میں آپ کے لیے محبت پیدا کی احساس جگایا۔ میں جانتا تھا آپ ضوئی سے پہلے اپنے بارے میں سمجھ نہیں سوجھیں گی اسی لیے میں چاہتا تھا کہ پہلے زیر اور ضوئی کی شادی ہو جائے پھر آپ سے اپنے بارے میں بات کروں گا۔“ وہ سرسراہٹے لہجے میں اس سے کہہ رہا تھا۔ کوئی اسے اس قدر چاہتا ہے وہ حیرت سے گنگ رہ گئی۔ کئی آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر رخساروں پر گرنے لگے تھے۔ وہ اس قدر سچی محبت کی حق دار نہیں تھی۔

”لیکن لائے آپ اس قدر انجان بن جائیں گی مجھے اندازہ نہ تھا۔“ اس کے کندھوں سے اپنے ہاتھ اٹھا کر دوپٹا دوبارہ اس کے کندھوں پر پھیلا کر اس نے اس کے دونوں ہاتھوں کو تھام کر ایک بھر پور شکوہ کیا تھا۔ ”آئی ایم سوری۔“ کافی رقت آمیز لہجے میں وہ بول پائی تھی۔ ”فوزان! آپ کے جذباتوں کی میں قدر کرتی ہوں۔ آپ نے میرے بارے میں اس انداز

میں سوچا یہ میری خوش بختی ہے۔ آپ آج صرف چند واقعات کے علاوہ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ کچھ بھی تو بتائیں آپ کو۔ اگر جان جائیں تو شاید آپ یہ الفاظ بھی نہ کہیں۔ میں خوش فہمیوں میں مبتلا نہیں ہوتی تو پھر میں آپ کی آنکھوں کی تحریر پر کیوں ایمان لاتی؟ صرف ایک بار زندگی نے بہت بڑا دھوکا دیا ہے اب کسی اور حادثے سے دوچار ہونے پر آمادہ نہیں ہوں۔ اپنا ہاتھ آئینے سے چھڑوا کر وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ ”مجھے معاف کر دیں مجھے شاید اس طرح آپ سے یہ بات نہیں کہنی چاہیے تھی۔“ لائے کی آواز میں ندامت کے ساتھ ساتھ حسرت و یاس کی کیفیت بھی شامل تھی۔ فوزان صدیقی محسوس کر کے فوراً اس کے پاس بیٹھا تھا۔

”میرے دل پر صرف ایک نقش ثبت ہوا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس نے اپنا آپ منوالیا۔ آپ کیا ہیں مجھے اس سے کچھ سروکار نہیں۔ آپ کے بارے میں میں کچھ بھی نہیں جانتا چاہتا۔ بس آپ دنیا کی سب سے اچھی لڑکی ہیں۔ اس کی گواہی پہلی نظر میں آپ کی آنکھوں نے اور پھر میرے دل نے دی تھی۔ دل کی گواہی ہمیشہ سچی ہوتی ہے اور میں ایمان لے آیا۔ اس کے بعد مجھے کچھ بھی جاننے کی جستجو نہیں۔“ فوزان نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے حوصلہ دیا۔ ”جب تک آپ سے دوبارہ ملاقات نہ ہوئی میرا دل آپ کے متعلق معلومات حاصل کرنے پر مجھے اکساتا رہا جب سے دوبارہ ملا ہوں یہ خواہش بھی نہیں رہی۔ آپ مجھے ہر حال میں ہر حیثیت سے قبول ہیں۔“ وہ مزید کہہ رہا تھا۔ اس نے اپنے بہتے آنسو صاف کیے۔

”پہلے شاید میں آپ کو اپنے متعلق کبھی کچھ نہ بتاتی مگر اب آپ مجھے میرے متعلق جاننا بہت

ضروری ہو گیا ہے۔ میں آپ پر واضح کر دوں کہ میں آپ کی غیر شادی شدہ لڑکی نہیں ہوں بلکہ ایک طلاق یافتہ لڑکی ہوں جسے اس جرم کی پاداش میں طلاق دے دی گئی جو اس نے کیا ہی نہیں تھا۔“ وہ اب پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ فوزان نے اس کے کندھے پر ہاتھ اپنا ہاتھ اٹھا لیا۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اب کیا کر رہے۔ کیسے وہ کوئی حرف تسلی دلائے کوئی جگنو اس کی جھولی میں ڈالے۔ اس نے اس سے محبت کی تھی بڑی سچی اور بے ریا۔ حقیقت میں اس کو اس خبر سے شاک پہنچا تھا اور اس شاک سے فوراً نکلنے کے لیے اسے کوئی راستہ نہیں مل رہا تھا۔ وہ بول رہی تھی اپنے بارے میں بتا رہی تھی۔ وہ اپنی ہر سوچ کو جھٹک رہی تھی خیال کی آغی کرے صرف اور صرف اس کی بات سننے لگا تھا۔

”میں لائے افتخار جسے صرف زندگی میں محبت ہی محبت ملی۔ ہر سوں خوشیاں رقصاں تھیں۔ آسائشات ملتی تھیں۔ زندگی خواب سے بھی زیادہ حسین تھی۔ لوگ دکھوں اور غموں کی باتیں کرتے تو میں حیران ہوتی بھلا اس دنیا میں بھی غم ہو سکتے ہیں کوئی دکھ میں بھی مبتلا ہو سکتا ہے جب یہی سوال میں ماما سے کرتی تو وہ مجھے سمجھاتیں۔“

”لائے! دنیا میں ہر انسان کی زندگی میں خوشی کے ساتھ غم بھی ہوتے ہیں۔ یہاں کوئی بھی انسان مکمل نہیں ہے۔ ہر کوئی اپنے اپنے درد کی آگ میں جلی رہا ہے۔ ہر انسان سچی خوشیوں کی تلاش میں رہا ہے۔ ہر کوئی صرف اور صرف خوشیاں مانگتا ہے خوشیاں آسائشیں اور محبتیں حاصل کرنے کی کمن میں وہ بھٹکتا جاتا ہے۔ کیونکہ اس کی زندگی بے توازن ہو جاتی ہے اگر ایک انسان کی جھولی میں وقت خوشیوں

کے جگنو ڈالتا ہے تو اس کو اپنی زندگی سے غم بھی سہنے پڑتے ہیں۔ جس طرح خزاں کے بعد بہار آتی ہے اور پھر وہ بھی گزر جاتی ہے اس طرح غموں کے بعد خوشیاں اور خوشیوں کے ساتھ غم۔ یہی سلسلہ ازل سے چلتا آ رہا ہے اور تا قیامت چلتا رہے گا۔ یہاں دنیا میں کوئی بھی چیز مستقل نہیں جو آج یہاں آیا ہے اسے کل چلے بھی جاتا ہے۔ کوئی چیز دائمی نہیں۔ ہر ایک فانی ہے۔ اگر کسی کو فنا نہیں تو وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ وہ حق القیوم ہے ازل سے ابد تک ہے۔ اسی کے حکم سے پتا تک سرگتا ہے سو اس دنیا میں توازن ہے ورنہ یہ دنیا پلک جھپکنے میں ہی فنا ہو جائے۔ خوشی اور غم زندگی سے مشروط ہیں جب ہم اللہ تعالیٰ پر پختہ یقین کر لیں گے ہر بات کو اس کی رضا سمجھ کر قبول کریں گے تو ہم پر بھی غم خوشیوں کی مانند محسوس ہوں گے۔“

زندگی اور اس کے رخ حقائق جو برحق تھے ان کے بارے میں ماما کا فلسفہ عجیب نہیں تھا مگر میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ اس وقت تو میں یہ باتیں نہ سمجھ سکی مگر وقت اور حالات نے سب یاد کر وادیں۔ میری ماما بہت ہی نیک اور صالح خاتون تھیں۔ اللہ تعالیٰ سے ہر وقت ڈرتی تھیں ہماری تربیت بھی انہوں نے بہت ہی مذہبی ماحول میں کی تھی۔ وقت اور حالات کے بدلتے تقاضوں میں بھی انہوں نے ہمیں مذہب سے دور نہیں ہونے دیا تھا۔ وقت کا پہیہ ذرا آگے سرکا تو اس وقت میں ایف ایس سی کے امتحان دے کر فارغ تھی۔ پھوپھو کینیڈا سے اپنے بیٹے رمیز کے ساتھ ہم لوگوں سے ملنے آئی ہوئی تھیں۔ میری زندگی کا محور میرے والدین، ضوئی، تایا ابو کی فیملی تھی۔ بچپن سے میری زندگی انہی رشتوں کے گرد گھومتی تھی۔ دوستوں کا شروع سے ہی ایک مقام تھا مگر میں نے ان کو ان رشتوں پر غور نہیں ہونے دیا تھا۔ بچپن سے میری

نسبت رمیز سے ہے تھی۔ جنت یاد ہے جب پہلی دفعہ پھوپھو پاستن آئی تھیں تو اس وقت میری عمر لگ بھگ پانچ سال کی ہوگی یا پھر اب کوئی تھیں۔ شعور کی منزل پر قدم رکھنے کے بعد میں نے پہلی دفعہ رمیز کو دیکھا تھا اور اس نے بھی۔ یہ سترہ اٹھارہ سال کی عمر ایسی ہی انہونی ہوئی ہے۔ ہر چہ تکی چیز سونا لٹی ہے۔ بچپن سے جس کا نام اپنے ساتھ سستی آئی تھی اس کا اس قدر خوب صورت روپ دیکھ کر دل بھی چل اٹھا تھا۔ ان کی خوب نشات اور احمق دنیویوں کے لیے ایک میں رمیز کی باتیں اس کی عمر میں بچکے کی اور ہی دنیا کی یہ آزمائش میں باگ ڈور نہ تھی نہ پر صافی نہ جانتی تھی اور نہ ہی بالما پاپائی صرف سے کوئی مدد نہ تھی۔ تب میں خلی دانا شیطان کا گھر ہوتا ہے۔ میں بھی ہوں۔ تو سب رمیز سے متاثر ہونے لگی۔ بچپن سے ایک تصور ذہن میں قائم تھا اس تصور کو مجھے کہ روپ میں جسم دیکھ کر ان کے سب آنکھوں میں ترنے لگے۔ میں آج بھلا آج تک ان کا وہی ایسا رویہ دیکھتی ہوں۔ پر پور رمیز کی بات میں وہ سب تھی۔ رمیز کی باتیں شہر میں اور چار چیس ایک طرف۔ چھوٹے بچے ایک شاعر ہوتے۔ لکھنا آپ بڑا پیرا پیرا اور اوجھل لکھتے تھے۔ خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی سمجھتی تھی۔

”عزیزانہ! اس کی دفعہ تکی زور قومہ کی یہ خواہش پوری ہو۔ تم میرے چاند میری جہوں میں ڈال دو۔ بہت انتظار کر رہا اب مجھ کو تمہیں سوتا۔ میں اکثر ایسی ہی باتیں پھوپھو کو ماما سے کہتی سنتی۔ ماما جیسے سے مسکرا دیتیں۔ شاید پھوپھو اسی مقصد کے لیے آئی تھیں۔ میں ان کی اتنی زیادہ محبت کے مظاہرے پر اور نہال ہو جاتی۔ میں رمیز سے چسپتی رہتی۔ کوشش کرتی اس سے سامنا کرتی ہوں۔ میں جہاں بھی جاتی وہ پیچھے چلا آتا۔

”تم میرے سامنے رہ کر ڈیوے چپنے کی کوشش مت کیا کرو۔“ وہ مجھے دیکھتے ہوئے والہانہ انداز سے کہتا اور میں مارے شرم کے پٹھ کہہ ہی نہ پاتی۔ وہ ہر بات کہہ دینے میں اتنا ہی بے باک تھا۔ کینیڈا جیسی فضاؤں میں بیل بڑھ کر جوان ہونے والا خود بھی بہت سا جرح خنک تھا۔ میں دل ہی دل میں مسکراتی رہتی۔ ایک دن اچانک پیادہ سامنے ہوا سے ہورٹرانسز کے آرڈر مل گئے۔ پھوپھو چھ خرٹے جیمیں رہنے کے ارادے سے آئی تھیں۔ اس نئی افق پر پریشان ہو گئیں۔ دوبار بارشادی کا کہہ رہی تھیں۔ پاپا اتنی جدی اتنی مامی میں میری شادی نکال کر چاہتے تھے۔ وہ مسلسل پھوپھو کو دل بستے تھے۔ اس مہم کو پیش سے لے کر جانے کی تیاریاں کرنے لگے۔ میرا دل سلام آباد چھوڑ کر چلنے لگی تھی پھر رہا تھا اور پاپا کے بغیر بھی میں نہیں رہ سکتی تھی۔ رمیز سے نئی فی محبت پھوپھو نے کا۔ اور پاپا کا ان غزلیں بہت زیادہ دوس کی۔ چھوٹے تالیانے لہو لہو کر رہے تھے۔ پاپا کو راشی رانی لیا کہ اگر شادی نہیں کرنا چاہتے تو نکاح کرنا ہے۔ تب میں پھوپھو سے فریاد ہو چلاں پھر رستی ہو چلاں۔ تالیانے اور اٹھنے لگے پاپا کو بھی مانتا پڑا۔ ساتھ ہی پھوپھو نے یہاں ہمارے رہنے کا ارادہ بھی منوی کر لیا۔ ہمارے اپنے جانے سے ایک ہفتہ پہلے ایک سرٹکی سی شام میں میرا ریمیز سے ہو گیا۔ رمیز بہت خوش تھا۔ خوشی اس کے چہرے سے پھولنی پڑ رہی تھی اور اسے خوش ہوتے دیکھ کر میں بھی خوش تھی۔ مومن چاہتے دیوانہ سا لگی کو اپنا لینے کا خواب ایسا روج پر تھا۔ میں منہ کا جتنا بھی شکر ادا کرتی لم تھا۔ مارے شکر کے میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ سارے دن کی جھلک سے چور ہو کر ابھی میں لیٹی ہی تھی کہ رمیز چلا آیا۔ مارے گھبراہٹ

میں اٹھ بیٹھی۔ حقیقتاً میں رمیز کی اس وقت آمد پر بیان ہو رہی تھی۔ ہمارا خاندان اگر اتنا قدامت پرست نہیں تھا تو اتنا آزاد خیال بھی نہیں تھا کہ یوں نہیں اتنی آزادی دے دی جاتی۔

”ہماری خیندیں اڑا کے محترمہ سونے کی تیاری کر رہی ہیں؟“ وہ میرے قریب ہی بستر پر بیٹھ گیا اور میرا ہاتھ مہرمت پاش نظروں سے دیکھنے لگا۔ مجھ سے تو جواب میں بول ہی نہ گیا۔

”آپ کیوں آئے ہیں؟“ بڑی وقت سے میں بولی تھی۔

”پاپا تمہاری آواز بہت پیاری ہے جیسے کوئی گلاب رہا ہو۔“ وہ میری آمد کی حریف کر رہا تھا۔

”آپ پینا بیوں سے جا نہیں آکر کوئی آگیا؟“ اس وقت میرے سر پر کسی کے آجانے کا خوف ہو رہا تھا۔ پتا نہیں رمیز کیا کیا کہہ رہا تھا۔ میں تو اندھنہ کی پڑائش میں ہی نہیں تھی۔ میری بے تابی کی سبب وہ بھی محسوس کر کے دھار دھار پھوٹ گیا تو میری بات پر تن آئی۔ وہ دھار دھار بات کرنے لگی۔

”اے دو تین دن یہ بھی گزار کے۔ رمیز مجھ سے مل رہی رہا۔ اس نے ان میں جانا تھا اس سے صرف دو دن ہی پہلے رات کا کھانا کھا کر برتن دھو کر میں اس کے کمرے میں آ گئی۔ کالج کے بعد وہاں پاپا نے ہم پر نئے مزارات کرنے پر کوئی پابندی نہیں چلائی تھی۔ مجھ سے اس کی ناراضگی برداشت نہیں ہو رہی تھی اتنی لیے اس نے خود ہی منہ میں پھل کر لی تھی۔ وہ ستر پر بیٹھا تھا۔ مجھ کو دیکھ کر منہ موزا لیا۔

”میرے سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ آپ مجھ سے وہ ناراض ہیں؟“ میں نے تو ایسا پتہ نہیں لیا۔ میں بانی سے ہٹ کر کہہ رہی تھی۔ رمیز پر مطلق اثر نہ

ہوا۔ ”رمیز پلیز یوں ناراض تو مت ہوں۔“ میں جھجکتے ہوئے بیڈ کے کنارے پر ہی ٹک گئی۔ غیر ارادی طور پر میرا ہاتھ رمیز کے کندھے پر پڑ گیا تھا۔

”تمہیں کیا پتا تم میرے لیے کیا ہو۔ تم جب یوں بدامنی کا مظاہرہ کرتی ہو تو خود پر بہت غصہ آتا ہے۔“ خدا خدا کر کے رمیز کی چپ کوئی تھی۔ میں نے شکر ادا کیا۔

”ہانا آئی ایم سوری۔ معاف نہیں کریں گے۔“

بہی پکسی ہوت ہی میں نے پھر کہا تو وہ مسکرا دیا۔ اپنے کندھے پر رکھا میرا ہاتھ اس نے اپنے ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔

”اب آخری بار ہے اگر تم آئندہ یوں کرو تو میں بہت ناراض ہوں گا۔“ مسکراتے ہوئے وہ مجھے تنبیہ بھی کر رہا تھا۔ اگلی شام وہ مجھے پاپا کی اجازت سے باہر لے گیا تھا۔ ہم نے بہت سا وقت اٹھ گزارا تھا۔ رمیز نے مجھ کو کھانے دیا تھا۔ میں پچاس کی طرح خوش ہوتے ہوئے پکے کھانے کی۔ یہ ایک خوب صورت رنگ تھی ہوا اس نے نکال کے لیے خریدی تھی مرس رات وہ مجھ کی سینے یا تھا مراب سے رہا تھا۔ میں اس محبت بھرے منہ پر بے پردہ خوش ہوئی۔

”تکی ہے؟“ اس کی مدد بھری آواز ابھی تھی۔

”بہت..... بہت پیاری.....“ میں انگلی کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ابھی اس نے انگلی میرے ہاتھ سے لے کر میری انگلی میں پہن دی۔

”تمہارے ہاتھ کی زینت بن کر اس کی خوب صورتی اور دوبار ہو گئی ہے۔“ اسے فضا کو اپنے موافق کرنے کا ہنسا آتا تھا۔ میرے ہاتھ کی پشت کو ہونٹوں سے کا کر کہا تو میں مارے حیا کے پلٹیں ہی نہ اٹھا سکی۔ وہ میرا اعتماد بھاس کرنے کو بے شمار باتیں کرتا رہا تھا۔ بہت جلد میں اس سے بے تعلق ہوئی۔ ہم دونوں

بڑی خوشی سے مستقبل کی پابند کرنے لگے۔

اگلے روز ہم لاہور آ گئے۔ ہماری روانگی کے وقت میز بہت ہی افسردہ تھا۔ ”مجھے بھول تو نہیں جاؤ گی۔ دیکھو تم مجھے یاد رکھنا۔ میں تمہیں اکثر فون کروں گا۔ ای میلز بھی بھیجا کروں گا۔ یہاں سے کینیڈا جانے سے قبل تم سے ملناؤں گا۔“ وہ میرے ساتھ چلتے ہوئے ہزار تاکیدیں کر رہا تھا اور میں اس کی ہر فرمائش پر مسکراتے ہوئے سر ہلاتی جا رہی تھی۔ میں اپنی ہزار تسلیوں اور امیدوں کے جگنو اس کے ہاتھوں میں تھا کہ اس کی بے پناہ محبتیں اور شدتیں اپنے دامن میں سمیٹ کر جہاز میں بیٹھ گئی۔ لاہور میں ٹیمپل ہونے میں کچھ وقت لگا تھا۔ لاہور آنے کے ایک مہینہ بعد پچھو پو اور رمیز ہم سے ملنے آئے تھے۔ دو دن ہمارے ساتھ گزار کر دونوں کینیڈا چلے گئے۔ شروع دنوں میں مجھے اس کی بہت یاد آتی تھی۔ وہ اکثر فون کرتا رہتا تھا۔ ای میلز بھی بھیجتا تھا۔ وقت سہولت سے گزرنے لگا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کی محبتوں اور شدتوں میں بھی اضافہ ہو چکا تھا اور میں اپنی پڑھائی میں مگن ہو گئی۔ ہمارے ماما پاپا نے سب سے پہلے ہمارا نصب العین پڑھائی ہی رکھا تھا۔ ضوئی ابھی چھوٹی تھی اسے ان باتوں کی پروا ہی نہیں تھی اور ماما نے ہم سے دوستی کا رشتہ رکھنے کے باوجود اپنی مامتا سے محروم نہیں رکھا تھا۔ سب کچھ ٹھیک تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پک جھپکنے میں دو سال کا عرصہ بیت گیا۔ میں بی اے کے امتحانات دے کر فارغ تھی اور گھر پر بھرپور توجہ دے رہی تھی ابھی میں نے محسوس کیا کہ پاپا ان دنوں بہت پریشان رہنے لگے ہیں۔ پاپا اپنی مشکلات اور مسائل سے ہم بہنوں کو دور ہی رکھتے تھے۔ سوائے ماما کے وہ اپنی باہر کی باتیں کسی اور سے شیئر نہیں کرتے تھے۔

میں بہت اچھی مقررہ رہی ہوں۔ اس حلیہ میں

میں نے بے شمار انعامات جیتے تھے۔ نہ تو میرا شمار فطین بچوں میں ہوتا تھا اور نہ ہی ٹکے اسٹوڈنٹس میں۔ میں تقریباً ذہین ہی تھی۔ ہمیشہ فرسٹ ڈویژن اے پلس گریڈ سے نمایاں مارکس لے لیتی تھی۔ اچانک ایک دن ہماری پرنسپل نے فون کر کے مجھے تقریری مقابلے میں شمولیت کا کہا۔ اپنے کالج والوں کی جانب سے میں نمائندگی کر رہی تھی۔ لاہور کے بڑے بڑے تمام کالجز اور اسکولز کے طلبہ و طالبات اس مقابلے میں حصہ لے رہے تھے۔ کافی بڑے پیمانے پر مقابلہ کر دیا جا رہا تھا۔ چونکہ ابھی میرا رزلٹ آؤٹ نہیں ہوا تھا اسی لیے میں نے کالج کی فورٹھ ایئر کی طالبہ کی حیثیت سے مقابلے میں حصہ لیا۔ حسب روایت میں نے یہ مصرعہ بھی سیکنڈ پوزیشن سے سر کر لیا تھا۔ فرسٹ پوزیشن کسی لڑکے کی تھی۔ فرسٹ پوزیشن نہ لینے کا دکھ تو تھا مگر مقابل لڑ کے نہ تیر بہت اچھی تھی۔ میں اپنی سیکنڈ پوزیشن پر ہی بہت خوش تھی اور اپنی خوش شیز کرنے کے لیے جب میں گھر پہنچی تو پاپا ڈرائنگ روم میں تھے۔ ضوئی ان دنوں تایا ابو کے ہاں اسلام آباد گئی ہوئی تھی۔

”پاپا جانی! دیکھیے آپ کی چیمپین نے ٹرافی جیت لی ہے۔“ ہماری پاپا سے بہت دوستی تھی اس لیے کبھی کبھی ہم بے تکلفی پر بھی اتر آتے تھے۔ پاپا اس وقت کسی شخص کے ساتھ مصروف تھے مجھے قطعاً علم نہ تھا میں یکدم اندر کھس گئی اور خوشی سے پاپا کے گلے میں بازو ڈالے بتانے لگی۔ پاپا بہت ہی حلیم و شفیق طبیعت کے مالک تھے۔ میں نے بھی ان کو انتہائی غصے میں نہیں دیکھا تھا مگر جب میں نے ان کے چہرے کی طرف دیکھا تو وہاں نیند و غصہ کی بجلیاں چمک رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے ایک طرف صوفے پر کی اور کو بھی دیکھ کر حقیقتاً میں

پریشان ہو گئی۔ وہ شخص بے باک نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں اس کی نظروں سے ڈر کر ایک دم پیچھے ہٹ گئی۔

”بیٹا! آپ باہر جائیے۔ اس وقت میں مصروف ہوں۔“ پاپا کے چہرے کی طرح ان کی آواز بھی بہت سپاٹ تھی میں فوراً باہر بھاگی بعد میں پاپا نے پوزیشن کے بارے میں پوچھا تو میں انہیں خوش خوش ساری صورت حال بتانے لگی۔ وقتاً فوقتاً مجھے وہ نظریں پریشان کرتی رہتی تھیں مگر میں ہر بار سر جھٹک کر خود کو مطمئن کر لیتی تھی۔ یہ ایک معمول کی حرکت تھی۔ اکثر ایسا ہو جاتا ہے مگر وہ شخص مجھے پریشان کر رہا تھا۔ جس کی وجہ سے میرے پاپا پریشان تھے۔ پاپا نے آئندہ مجھے یوں بلا جھجک کمرے میں داخل ہونے سے منع کیا تھا۔ میں وجہ نہ سمجھ سکی۔ مجھے اپنی اس چھوٹی سی غلطی کا احساس اور معاملے کی نزاکت کا علم اس وقت ہوا جب تین چار دن بعد رات کو ماما پاپا کے کمرے میں چائے کے گگ اٹھانے آئی تھی۔ اندر سے آنے والی آوازوں نے میرے قدم باہر ہی جکڑ لیے۔

”آپ ٹرانسفر کروالیں۔ آخر کب تک وہ شخص ہمیں ہیک میل کرے گا؟“ ماما پاپا کو مشورہ دے رہی تھیں ان کی آواز بھی کافی متفطر تھی۔

”ٹرانسفر کروانا اتنا آسان نہیں ہے جتنا تم سمجھ رہی ہو۔ میں نے درخواست دے رکھی ہے۔ دیکھو کیا ہوتا ہے۔ فی الحال تو اصل مسئلہ اس شخص کا ہے۔ میں نے اپنی ساری سروس کے دوران ایک روپے کا گھپا نہیں کیا جہاں اڑھائی کروڑ۔۔۔! وہ مسلسل دباؤ ڈال رہا ہے۔ میں اس کے کاغذات کلیئر کر دوں۔ اب تو جب اس نے پری کو دیکھا ہے بلیک میلنگ کر رہا ہے۔ فی سیدھی دھمکیاں دے رہا ہے۔ حتیٰ کہ اغواء کروانے کا بھی کہہ رہا ہے۔“

”پریشان مت ہوں۔ میں تو سوچ رہی ہوں پری کو اسلام آباد بھائی صاحب کے پاس بھجوا دیں۔ کیا پتا اس بد معاش کا کچھ کرنے دکھائے۔ اتنے تو تعلقات ہیں اس شخص کے۔ عام شخص تو بے نہیں وہ۔“ ماما پاپا اور بھی نجی نے کیا کیا کہہ رہے تھے میرا ذہن خود پر مرکوز دو بے باک نظروں میں الجھنے لگا۔

اگلے تین چار دنوں میں پاپا نے میرے اور ماما کے اسلام آباد جانے کے تمام انتظامات کر دئیے۔ نامہ مشتاق میری بہت اچھی دوست تھی۔ لاہور آ کر ہی میری اس سے دوستی ہوئی تھی۔ امتحانات کے بعد اس کی شادی طے تھی۔ اس نے بطور خاص مجھے فیملی کے ساتھ مدعو کیا تھا۔ ہمارے آپس کے تعلقات گھریلو سطح پر قائم تھے۔ جب اسے علم ہوا کہ میں اس کی شادی میں شرکت نہیں کر رہی بلکہ اسلام آباد جا رہی ہوں تو وہ اپنی ماما کے ساتھ ہمارے گھر آئی تھی۔ ہماری روانگی سے صرف تین دن بعد اس کی شادی تھی۔ اس نے ماما پاپا سے خاص طور پر تاکید کی تو پاپا نے شادی میں شرکت کی اجازت دے دی۔ میں بھی بہت خوش تھی کہ میں بھی اپنی عزیز از جان دوست کی شادی میں شرکت کر سکوں گی۔ ابو نے پہلی نکلیں کینسل کر دیا کہ شادی کے بعد کی پیشیں بک کر وادیں۔ جس دن شادی تھی ماما بہت مصروف رہے تھے۔ میں اور ماما ہی شادی میں گئے تھے۔ رات کی تقریب تھی پاپا رات کو بھی فارغ نہ تھے۔ کوئی پارٹی آئی ہوئی تھی اسی لیے پاپا ادھر مصروف تھے۔ واپسی کے لیے پاپا نے ڈرائیور کو گاڑی دے کر بھیجا تھا۔ ابھی آدھا رستہ ہی طے ہوا ہوگا جب ہمیں محسوس ہوا کہ کوئی مسلسل ہماری گاڑی کا پیچھا کر رہا ہے۔ ماما کے کہنے پر ڈرائیور نے گاڑی سنسان سڑک سے مصروف شاہراہ کی جانب موڑ لی۔ ابھی تھوڑا ہی فاصلہ کٹا ہوگا کہ کہیں سے اچانک کسی گاڑی

نے ہمارا راستہ روک دیا تھا۔ ایک گاڑی پیچھے سے آ موجود ہوئی۔ ارد گرد کی ٹریفک متاثر ہونے لگی۔ ہماری گاڑی درمیان میں پھنس گئی تھی صورت حال کا کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔

”اتر و جلدی کرو“ ایک نقاب پوش آدمی نے اپنی گاڑی سے نکل کر میری طرف کا دروازہ کھول کر میرا بازو دھینچا۔

”چھوڑو میری بچی کو کہاں لے جا رہے ہو؟“ ماما نے مجھے مضبوطی سے تھام لیا۔ ڈرائیور بھی ہکا بکا سب دیکھ رہا تھا۔ ارد گرد لوگ اب متوجہ ہو چکے تھے۔ مگر کسی کو بھی آگے بڑھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ ڈرائیور اور ماما مسلسل مجھے جھڑپے ہوئے تھے۔

”یار ان دونوں سے تو جان چھڑواؤ۔“ ان میں سے ایک نے دوسرے کو دبا کر کہا تھا۔ دوسرے ہی لمحے انہوں نے ان دونوں پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے میری روٹی چھتی ماں اور ڈرائیور نے ہاتھ اٹھا۔ میں اتنی بد نصیب تھی کہ کچھ نہ کر سکی۔ دور تک ان کو مارتے ہوئے دیکھتی رہی۔ روتے ہوئے المیہ نے اپنے گھٹنوں سے سر اٹھایا تھا۔ چپ سا دھڑکتا اپنے سامنے بیٹھے فوزان کو دیکھا۔

”جنت اندازہ تھا جب پایا کو ماما اور ڈرائیور کی موت کی خبر ملی ہوگی تو ان پر کیا ہوتی ہوگی۔ میرے پہاڑ سا حوصلہ رکھنے والے پاپا ریزہ ریزہ ہو گئے۔ جس بات کا انہیں ڈر تھا وہ ہو گیا۔ ضوٹی بھائی بھی اور تایا ابو کے ہمراہ فوراً اسلام آباد سے اہورا گئی۔ وہ بہت روٹی تھی۔ بھائی بتاتی ہیں وہ بے ہوشی میں بھی صرف مجھے اور ماما کو پکارتی تھی۔ یکدم ہماری ہنستی مسکراتی روشنی سے لبریز دنیا اندھیر ہو گئی۔ پاپا ڈھکے پوپیس اور ان کا ٹکڑا متحرک ہو گیا۔ زوہیب شاہ نے پھر وہی ڈیمانڈ کی۔ پاپا اپنا سب کچھ بار کر بھی اپنے موقف

سے نہ ہٹے۔ زوہیب شاہ نے میرے غوش اڑھائی کروڑ کا معاملہ کلیئر کرنے کی شرط رکھی تھی۔ المیہ نے دوپٹے سے اپنی آنکھیں صاف کیں۔

”مجھے تو کچھ خبر نہیں تھی کہ میرے پیچھے پایا نے کیسے کیسے لوگوں کو ہینڈل کیا ہوگا۔ میں تو چیخ رہی تھی جب ایک شخص نے گاڑی و فام سے بھگتا ہوا دھال میری ناک اور منہ پر رکھ دیا تھا۔ اس کے بعد مجھے کچھ پتا نہیں تھا۔ نجانے میں کب تک بے ہوش رہی تھی اور کس جگہ مجھے لے جایا گیا تھا۔ مجھے کچھ علم نہ تھا جب قیامت گزر جانے کے بعد ہوش آیا تو میں ایک اسپورٹڈ آرائش وزیائش والے کمرے میں دیکھ کر دم گدے والے بید پر لیٹی ہوئی تھی۔ ایک آدمی وہاں صوفے پر براجمان اخبار منہ کے سامنے پھیلے ہوئے تھا۔

”میں کہاں ہوں؟ کون ہو تم؟“ اچانک اندھیرے سے روشنی کی طرف لوٹنے سے میں سمجھ نہ سکی کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے اسی لیے انتہائی خوف سے سوال کر رہی تھی۔ میری آواز پر اس آدمی نے اپنے منہ کے سامنے سے وہ اخبار ہٹا کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی اور ہونٹوں پر کیمینی سی مسکراہٹ میں پوری جان سے کانپ اٹھی۔

”تم طسم کدے میں ہو اور میں تمہارا قدر دان ہوں۔“ اخبار رکھ کر وہ عجیب نظروں سے دیکھتے ہوئے میری طرف آ گیا۔ بل میں مجھ پر بہت بڑی حقیقت کا انداز رک ہوا۔ میں اس قدر ڈری ہوئی تھی کہ کوئی حرکت بھی نہ کر سکی۔ وہ تو وہی تھا زوہیب شاہ جس نے پاپا کو اڑھائی کروڑ روپے کا گھپلا کرنے کو کہا تھا۔ پاپا کے انکار پر میں آج اس کی دسترس میں تھی۔ وہ ہوس بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ وہ میرے ساتھ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ خوف سراپا کی میری آنکھوں

رہے تھے۔ ستمبر تھا کہ میں اس کمرے کی چار دیواری سے باہر بھی نہیں نکل سکتی تھی۔ اس نے میرے خوف سے بالکل ساکت وجود کو اپنے بازو کے گھیر میں لے لیا۔ میں بچنا چاہتی تھی اس نے اور میرے چہرے اعصاب نے میری ساری توانائیاں مفلوج کر کے رکھ دیں۔ مجھے اس وقت اپنا آپ رو بوٹ کی مانند لگا۔ میں نے خوف سے آنکھیں بند کر لی تھیں اور صوفے کی تستی کو پوری جان سے پکارا۔

”اللہ!“ میرے ساکت ہونٹوں سے بے آواز آہ نکلتی تھی اور اللہ نے میری پکار سن لی۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی شیطانی کھیل شروع کرتا کسی نے دروازہ زور شور سے بجایا۔

”ایڈیٹ اسٹوڈنٹ۔۔۔ اسے یہ مداخلت بہت ناگوار گزری تھی۔ وہ مجھے خوں خوار نظروں سے گھورتے ہوئے دروازہ کھولنے لگا۔ ”کیا ہے۔۔۔؟“ وہ آنے والے پر برس پڑا تھا۔

”معاف کیجیے گا شاہ جی! مجبوری تھی۔“ آنے

والے نے بہت بے چارگی سے کہا۔ ”کیا مجبوری تھی؟ کون مر گیا ہے؟ جب میں نے کہا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے ادھر مت آنا تو پھر کیوں ڈسٹرب کیا ہے مجھے۔“

”معاف کر دیں شاہ جی یہاں پولیس کی ریڈ ہو گئی ہے۔ آپ جلدی سے یہاں سے نکلیے۔“ آنے والا خاصا حواس باختہ تھا۔ تیزی سے بتا رہا تھا۔ میں تو بس دیکھ رہی تھی۔

”اچھا۔۔۔ تم اس لڑکی کو لے کر دوسرے رستے سے نکلو۔ اور ہاں سنو اسے پہلے بے ہوش کر لو تا کہ بعد میں کوئی مسئلہ نہ ہو پہلے ہی دو قتل کر چکے ہو تم لوگ۔ کوئی کام تم سے دھیان سے نہیں ہوتا۔“ وہ احاطہ دینے والے پر برستا ہوا باہر نکل گیا۔ میں ایک دفعہ پھر بے ہوش کر دی گئی تھی۔ جب دوبارہ ہوش آیا تو اس ویرانے میں تھی۔ مسلسل دن رات بے ہوش رہنے سے میں ملنے سے بھی قاصر تھی۔ وہاں ان تینوں آدمیوں نے مجھ کچھ نہیں کہا تھا۔ میں ان سے کوئی

سوال پوچھتی بھی تو کوئی جواب نہیں دیتے تھے۔ میں نے کچھ کھایا پیا بھی نہیں تھا۔ جب موت بالکل قریب دکھائی دی تو ان کا دیا گیا کھانا طلق سے اتارا۔ مجھے وہاں تیسرا دن تھا۔ جب مسلسل گریہ زاری پر اللہ نے آپ کو میری بددعا کے لیے بھیج دیا۔ آپ میرے لیے بالکل انجان اجنبی تھے پھر بھی میں نے آپ پر بھروسہ کر لیا۔ مجھے یہی لگا کہ آپ میرے لیے خدا کی طرف سے بھیجے گئے کسی رحمت کے فرشتے سے کم نہیں۔ وہ آنسو بہاتی اب خاموش ہو گئی تھی۔ فوزان خاموشی سے اس کی ساری بات سنتا رہا۔

”وہاں سے نکلنے کے بعد جب دوبارہ ہسپتال کے کمرے میں ہوش آیا تو پہلا خیال آپ کی طرف ہی گیا تھا۔ آپ وہاں نہیں تھے وہاں ڈاکٹر کی ساتھ رضوان صاحب تھے۔ سادہ کپڑوں میں دو اور پولیس والے تھے۔ رضوان صاحب مجھ سے میرے متعلق دریافت کرنے لگے۔

”آپ کا لیانا ہے؟“ میں نقابیت سے آنکھیں کھولے انہیں دیکھنے لگی۔

”لائبہ افتخار۔“ بہت مشکلوں سے میرے لبوں سے یہ جملہ نکلا تھا۔ پھر وہ مجھ سے میرے متعلق تفصیل سے پوچھتے رہے۔ بڑی مشکلوں سے میں انہیں اپنے متعلق سب کچھ بتا پائی تھی۔ میرا بیان ریکارڈ کروانے کے بعد ڈاکٹر نے دوبارہ مجھے ٹریکولائزر کے حوالے کر دیا تھا۔ میں مسلسل کئی دن تک ہوش اور بے ہوشی کی کیفیت میں رہی تھی۔ اس حادثے نے میرے اعصاب کو بہت بری طرح تباہ کر دیا تھا۔ جب عمل طور پر ہوش آیا تو اپنے پاس بھیا بھالی تایا ابو پایا اور ضوئی کو دیکھ کر میرا ضبط جواب دے گیا۔ مجھے لگا جیسے ابھی امی مجھے چھوڑ کر گئی ہیں پھر میں بہت روئی تھی اپنے دل کا سارا غبار نکالا تھا۔

میرے پایا ایک حق پرست انسان تھے۔ انہوں نے ساری زندگی دیانت داری میں گزار دی۔ وہ ملک سے وفاداری اور فرض شناسی کے قائل تھے ان کی اسی فرض شناسی نے ان کی بیٹی کو زمانے بھر کی نظروں میں معنوب ٹھہرا دیا تھا اور ایک نمک ر ہمدرد بیوی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان سے دور کر دیا۔ جب زوہیب شاہ نے میرے اغواء کے بعد پایا کو معاملہ کلیئر کرانے کو کہا تو پایا نے اسے جواب دیا کہ وہ اس وطن اور پیشے کی خاطر اپنی دس بیٹیاں بھی قربان کر سکتے ہیں مگر انہیں یہ گوارا نہیں کہ وہ جس گھر میں رہ رہے ہیں اس کی دیواریں کھو کھلی کر دیں۔ وہ اگر اپنی اولاد کی قربانی دے کر آئندہ کئی نسلوں کے لیے اس گھر کو مضبوط رکھ سکتے ہیں تو انہیں یہ سودا مہنگا نہیں اور پایا نے وطن کی خاطر معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا۔ زوہیب شاہ کا خیال تھا کہ وہ ڈر ادھم کا کر یا پھر مجھے رسوا کر کے پایا کو جھکا لے گا مگر اس کی یہ خام خیالی ہی رہی۔ میں اللہ کی عنایت سے اپنی عزت بچا آئی بلکہ پایا کو مزید رسوا ہونے سے بھی بچا لیا۔ میں جتنے دن ہسپتال میں رہی رضوان صاحب اور ن کے ساتھیوں کی تحویل میں رہی۔ انہوں نے بہت تعاون کیا۔ اپنی طرف سے انہوں نے مجھے پولیس کی خبر نہ بننے کی پوری کوشش کی تھی۔ دوسری طرف زوہیب شاہ نے اپنے تمام ذرائع استعمال کر کے میرے اور پایا کے متعلق جھوٹی کہانیاں پولیس کو مہیا کیں۔ میری ماما اور ڈرائیور کے قتل کو بھی غلط رنگ دیا گیا۔ میڈیا نے اس کیس کو بہت اچھالا تھا۔ میری ذات پر طرح طرح کے الزامات لگائے گئے۔ زوہیب شاہ نے پوری کوشش کی کہ پایا خاموش ہو جائیں مگر وہ خاموش نہ ہوئے۔ اس کی تمام حرکتیں بھی پایا کو فرض شناسی سے نہ ہٹا پائیں۔ وہ اس کھیل کا منجیہ ہوا کھلاڑی تھا اس کے آگے انسان کی اہمیت کٹ

بتی سے زیادہ نہیں۔ وہ لڑکیوں کو نشوونما کی طرح پوز کرتا تھا۔ پولیس کل فیلڈ کی ایک بھرپور شخصیت اس نے اپنی حیثیت سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے سب حالات کو اپنے حق میں ہموار کر لیا تھا۔ پایا کا انتہائی شان دار کیریئر شک کی لپیٹ میں آ گیا اور پھر انہوں نے نہایت دلبرداشتہ ہوتے خود ہی ریٹائرمنٹ لینے کا فیصلہ کر لیا۔

”اسپتال سے فارغ ہونے کے بعد بھیا بھالی بتایا ابو مجھے اور ضوئی کو اسلام آباد لے آئے تھے۔ یہاں لوگوں کو میڈیا کے ذریعے میرے اغواء کی خبر پہنچی تھی۔ عجیب و غریب کہانیاں مشہور ہو گئی تھیں۔ وہ تمام رکتی تو لوگ عجیب عجیب نظروں سے دیکھنے لگے۔ ایک طرف لوگوں کا رویہ دوسری طرف ماما کی موت کا صدمہ اور پایا کے تنہا رہ جانے کا دکھ۔ ریٹائرمنٹ تک پایا تنہا ہی لاہور میں رہ رہے تھے۔ میرا دل ہر لمحہ ان کے لیے پریشان رہتا تھا۔ دنیا ہوس پرستوں سے بھری ہوئی ہے لاہور میں گزارے گئے آخری ایام اس کا سب سے اہم ثبوت تھے۔ زندگی نے اس طرح آزمایا کہ میرا زندگی سے اعتبار اٹھ گیا تھا۔ بھابی بھیا اور تایا ابو نے میرا بھرپور ساتھ دیا۔ میرے امید کی کرن روشن کی مجھے زندہ رہنے کا سبق پڑھایا آئیں نے ایم اے انگلش کے لیے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ پایا کی درخواست منظور کر لی گئی تھی۔ وہ ات کچھ کھو کر دوبارہ اسلام آباد چلے آئے۔ یہاں وہ میرے اور ضوئی کی خاطر دوبارہ جینا چاہتے تھے کہ وہ سب کچھ ہو گیا جس نے ان سے جینے کی خواہش کیا زندگی بھی چھین لی۔“ ایک دفعہ پھر پھوٹ پھوٹ کر روتے اس نے سر گھٹنوں میں رکھ لیا۔ وہ کافی دیر خود کو سنبھالتی رہی تھی۔ بولنے کا حوصلہ پیدا کرنے لگی۔ بتاتی دیر تک وہ خاموش بیٹھی فوزان کے اندر بھی

زندگی ڈوبتی ابھرتی رہی۔

”لائبہ.....“ کافی دیر تک بھی اس نے سر نہ اٹھایا تو فوزان نے اسے پکارا۔ اپنی سرخ سوچی آنکھیں اٹھا کر فوزان کو دیکھا۔ پھر سر ہلا دیا۔

”ماما کی وفات پایا کی برسوں کی نیک نامی صرف میری وجہ سے سولی پر چڑھ گئی۔ یہ ایسا دکھ تھا مجھے کسی بھی لمحے سکون لینے نہیں دیتا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے حوصلہ کیا تھا۔ دوبارہ جینا چاہا مگر سارے حوصلے جواب دے گئے۔ پھوپھو اور رمیز کینیڈا تھے۔ یہاں پاکستان میں جو کچھ ہوا پایا اور تایا ابو نے قصداً انہیں کچھ بھی بتانے سے گریز کیا۔ وہ میری آئندہ زندگی کے بارے میں سوچ رہے تھے اسی لیے انہوں نے خاموشی کی ردالڑھلی۔ پھر ایک دن پھوپھو کا فون آیا تھا جو پایا نے ہی ریسو کیا تھا۔ وہ نجانے پایا کو کیا چھہکتی رہیں کہ پایا کا رنگ متغیر ہوتا گیا پھر ان کے ہاتھ سے فون چھوٹ گیا تھا۔ پھوپھو کو نجانے کیسے اس حادثے کی خبر ہو گئی تھی۔ بجائے اس کے کہ وہ ہمیں ماما کی موت کا پر سہ اور حوصلہ دیتیں انہوں نے تو ہمارے رہے سہے حوصلے ہی توڑ دیئے۔ انہوں نے برسوں کی محبت کو لفظوں کے نشروں سے چھید کر رکھ دیا۔ محبت مردوت، تعلق رشتہ داری کسی بھی بات کا لحاظ نہ کیا۔ انہیں میری ذات پر شبہ تھا۔ میرے کردار پر شک تھا۔ پایا کی نیک نامی اور دیانت داری دھوکا دینے لگی۔ انہوں نے ہر تعلق ختم کر دینے کی نوید سنائی تھی۔ پہلے ہی دکھوں غموں کے بوجھ تلے دبے پایا اس نے دکھ کا اتنا بوجھ سہہ نہیں پائے تھے۔ انہیں فوج کا ایک ہو گیا۔ تایا ابو اور بھیا انہیں اسپتال لے گئے۔ میں اور ضوئی مردوں سے بھی بدتر ہو گئیں۔ دن رات پایا کی زندگی کی دمانیں مالتی رہتی تھی۔ پایا آہستہ آہستہ صحت یاب ہونے لگے پھر ایک دن وہ گھر آ گئے ہم

کراتس کا ہاتھ تھا مایا۔

”پری! جو ہو گیا ہے اسے بھونٹنے کی کوشش کریں۔ انسان کی زندگی میں شیب و افزائے رست ہیں۔ یہ دنیا بڑی خانہ غمناک اور بے رحم اس کے ہاتھوں میں پتھر ہیں۔ اب ہمیں خود اپنی آپ بڑے سبب سے ان پتھروں سے بچنا ہے۔ آپ خود کو کیوں بہکان کر لی رشتہ ہیں؟ میری ماں نہیں باپ دوست سب چھوڑا آپ ہیں۔ میری خاطر ہی تو جی رہی ہیں پھر میرے لیے پر اپنے آسویں صاف کرتیں۔ وہ بہت محبت سے مجھ کے دوش پر رہتی تھیں۔“

”نہی! یہ سب بہت مشکل ہے۔ دیکھنے سے میرے ساتھ لپٹا کیوں لیا؟“ ماری دنیا کی لپٹ لیتی وہ یوں نہ رہتا۔ تب جیسے وہ ”ایکے دن“ پر تیار ہوا۔ ”میں نے تو صرف اس سے محبت کی تھی۔“ وہ آج بھی دفعہ رمیہ کا نام لے کر اس کے سامنے رہتی تھی۔ ماں مریں تھی نہ مریں نہ طرح بگڑی رہی۔ ”تو نہ تو تھیں نہ تھیں۔“ اس کی بڑی رات بے پندہ نیت میں مریں تھی۔

ماں نے بے پندہ خوشگوار گتے ایسے لگائے کہ وہ خوش لوگوں کو حال سے خائف ایک خوب صورت پندہ مایا کرتا ہے۔ ایسی خوب صورت پندہ جس سے انسان ذہنی آمدولی حاصل کرتا ہے۔ ماری کی ودیوں میں گھومتے گھومتے وہ حال کی ٹلنیوں کو فراموش کر بیٹھتا ہے۔ دنیا کا سب سے بڑا ادب ماری درگزر شدہ یہاں واقعات سے منسلک ہوتا ہے۔ ”Man of imagination“ اور ان کی نسبت زیادہ بہتہ طور پر زندگی کے صدقات برداشت کر سکتا ہے۔ جبکہ الائبہ فتنار کے ساتھ معاملہ ہاتھ اس تھا۔ اس کے لیے ماری ایک خوفناک ناگ کی مانند تھی جس کا تصور کرتے ہی وہ ہاتھ پاؤں چھوڑنے لگتی تھیں۔

ہو جاتی تھی۔ وہ جب بھی ماری میں وقت گزارتی اسے ماں باپ جیسی نعمت سے محروم ہو جانے کا احساس اور شدت سے چٹکیاں کاٹنے لگتا تھا۔ آج رات بھی یہی ہوا تھا۔ ماری اپنا تک آنکھ لگتی تھی تو بڑا گراٹھ پھینکتی۔ اُمی کی چٹکیں اسے ہولائے دیتیں۔ پاپا کا چہرہ یاد آئے۔ اسے رونے پر مجبور کر دیتا۔ وہ زندہ میں سب اس واقعے کے بعد پرسکون ہو کر سو سکی تھی۔ ماری نے اپنی بے پندہ راتیں نہیں جو بے پندہ بی میں گزر جاتیں۔ وہ اپنی رات پر اذیت کا پہاڑ سہا۔ سہا رچکا چورہ ہونے لگی تھی۔ ”میں چنک رہا تھا۔ بہت سے آج اٹھنے کو تھی۔“

”نہی! یہ سب بہت مشکل ہے۔ دیکھنے سے میرے ساتھ لپٹا کیوں لیا؟“ ماری دنیا کی لپٹ لیتی وہ یوں نہ رہتا۔ تب جیسے وہ ”ایکے دن“ پر تیار ہوا۔ ”میں نے تو صرف اس سے محبت کی تھی۔“ وہ آج بھی دفعہ رمیہ کا نام لے کر اس کے سامنے رہتی تھی۔ ماں مریں تھی نہ مریں نہ طرح بگڑی رہی۔ ”تو نہ تو تھیں نہ تھیں۔“ اس کی بڑی رات بے پندہ نیت میں مریں تھی۔

”پری! آپ تو بہت تیز بندہ ہے۔ آپ رہنے دیں۔ میں یہ سب کروں گی۔“ اس نے دوبارہ اس کے ہاتھ سے پچھا۔

”یہ بل تو زندگی کا حصہ ہے۔ تیرے دوشیاں تیار ہو جائیں۔ اس نے اپنی خاصی بے پرواہی کا مظاہرہ کیا مگر ضوئی مان کے ہی نہیں۔“ ماری تھی۔

”نہی! یہ سب بہت مشکل ہے۔ دیکھنے سے میرے ساتھ لپٹا کیوں لیا؟“ ماری دنیا کی لپٹ لیتی وہ یوں نہ رہتا۔ تب جیسے وہ ”ایکے دن“ پر تیار ہوا۔ ”میں نے تو صرف اس سے محبت کی تھی۔“ وہ آج بھی دفعہ رمیہ کا نام لے کر اس کے سامنے رہتی تھی۔ ماں مریں تھی نہ مریں نہ طرح بگڑی رہی۔ ”تو نہ تو تھیں نہ تھیں۔“ اس کی بڑی رات بے پندہ نیت میں مریں تھی۔

”نہی! یہ سب بہت مشکل ہے۔ دیکھنے سے میرے ساتھ لپٹا کیوں لیا؟“ ماری دنیا کی لپٹ لیتی وہ یوں نہ رہتا۔ تب جیسے وہ ”ایکے دن“ پر تیار ہوا۔ ”میں نے تو صرف اس سے محبت کی تھی۔“ وہ آج بھی دفعہ رمیہ کا نام لے کر اس کے سامنے رہتی تھی۔ ماں مریں تھی نہ مریں نہ طرح بگڑی رہی۔ ”تو نہ تو تھیں نہ تھیں۔“ اس کی بڑی رات بے پندہ نیت میں مریں تھی۔

”نہی! یہ سب بہت مشکل ہے۔ دیکھنے سے میرے ساتھ لپٹا کیوں لیا؟“ ماری دنیا کی لپٹ لیتی وہ یوں نہ رہتا۔ تب جیسے وہ ”ایکے دن“ پر تیار ہوا۔ ”میں نے تو صرف اس سے محبت کی تھی۔“ وہ آج بھی دفعہ رمیہ کا نام لے کر اس کے سامنے رہتی تھی۔ ماں مریں تھی نہ مریں نہ طرح بگڑی رہی۔ ”تو نہ تو تھیں نہ تھیں۔“ اس کی بڑی رات بے پندہ نیت میں مریں تھی۔

”نہی! یہ سب بہت مشکل ہے۔ دیکھنے سے میرے ساتھ لپٹا کیوں لیا؟“ ماری دنیا کی لپٹ لیتی وہ یوں نہ رہتا۔ تب جیسے وہ ”ایکے دن“ پر تیار ہوا۔ ”میں نے تو صرف اس سے محبت کی تھی۔“ وہ آج بھی دفعہ رمیہ کا نام لے کر اس کے سامنے رہتی تھی۔ ماں مریں تھی نہ مریں نہ طرح بگڑی رہی۔ ”تو نہ تو تھیں نہ تھیں۔“ اس کی بڑی رات بے پندہ نیت میں مریں تھی۔

جائے۔ خواہ مخواہ پریشان ہوگی۔“ وہ ہلکے سے ہنس دی۔

”اے! فوزان! کیا ہوا؟“ بھابی کا انداز کافی دوستانہ تھا وہ چونک گئی۔

”ہاں..... وہ رات مجھ سے کافی دیر تک باتیں کرتا رہا تھا۔“ وہ ایک لمحہ کور کی پھر ضوئی کو دیکھا۔

”نہی! یہ سب بہت مشکل ہے۔ دیکھنے سے میرے ساتھ لپٹا کیوں لیا؟“ ماری دنیا کی لپٹ لیتی وہ یوں نہ رہتا۔ تب جیسے وہ ”ایکے دن“ پر تیار ہوا۔ ”میں نے تو صرف اس سے محبت کی تھی۔“ وہ آج بھی دفعہ رمیہ کا نام لے کر اس کے سامنے رہتی تھی۔ ماں مریں تھی نہ مریں نہ طرح بگڑی رہی۔ ”تو نہ تو تھیں نہ تھیں۔“ اس کی بڑی رات بے پندہ نیت میں مریں تھی۔

”نہی! یہ سب بہت مشکل ہے۔ دیکھنے سے میرے ساتھ لپٹا کیوں لیا؟“ ماری دنیا کی لپٹ لیتی وہ یوں نہ رہتا۔ تب جیسے وہ ”ایکے دن“ پر تیار ہوا۔ ”میں نے تو صرف اس سے محبت کی تھی۔“ وہ آج بھی دفعہ رمیہ کا نام لے کر اس کے سامنے رہتی تھی۔ ماں مریں تھی نہ مریں نہ طرح بگڑی رہی۔ ”تو نہ تو تھیں نہ تھیں۔“ اس کی بڑی رات بے پندہ نیت میں مریں تھی۔

”نہی! یہ سب بہت مشکل ہے۔ دیکھنے سے میرے ساتھ لپٹا کیوں لیا؟“ ماری دنیا کی لپٹ لیتی وہ یوں نہ رہتا۔ تب جیسے وہ ”ایکے دن“ پر تیار ہوا۔ ”میں نے تو صرف اس سے محبت کی تھی۔“ وہ آج بھی دفعہ رمیہ کا نام لے کر اس کے سامنے رہتی تھی۔ ماں مریں تھی نہ مریں نہ طرح بگڑی رہی۔ ”تو نہ تو تھیں نہ تھیں۔“ اس کی بڑی رات بے پندہ نیت میں مریں تھی۔

روکنے کی کوشش میں اپنے ہونٹوں کو بری طرح کچلتی ہوئی اپنی اس کوشش میں نا کام ہوئی جارہی تھی۔

”خضوفی! کیا ہوا ہے۔۔۔ کیوں رو رہی ہو؟“ وہ تڑپ کر اس کی طرف بڑھی تھی۔ پاگلوں کی طرح جھنجھوڑنے لگی۔ جب نظریں تصویروں پر آئی تو جھمکر رہ گئیں۔ یہ اس کے نکاح کی تصویریں تھیں۔ درمیان میں وہ اور رمیز بیٹھے ہوئے تھے۔ دائیں بائیں ماما پاپا تھے۔ سرخ جوڑے میں وہ خود بھی اور ساتھ میں بلیک تھری پیس سوٹ میں کتے میں پھولوں کا بار ڈالے وہ مسکرا رہا تھا۔ ماما پاپا، دونوں اس تصویر میں بہت خوش دکھائی دے رہے تھے۔ وہ کئی لمبے اس تصویر کو دیکھنے لگی۔ آہستہ آہستہ سارے اہم کی تصویریں ہی دیکھنے لگیں تھیں۔ یہ بھی تھی کہ بڑھتی ہی جارہی تھی۔ کتنی ہی تصویریں دل کی ترقی پر گواہ بن چکی تھیں۔ پہلا نام شاید اتنی آسانی سے مٹ بھی نہیں سکتا تھا۔ ورنہ بھی وہ جو دل کی ترقی پر قابض ہونے کے پورے اختیار رکھتا تھا۔ لائق مقدس اور خوب صورت رشتہ تو دونوں کا۔۔۔ ”رمیز!“ کتنا پرکشش تھا یہ نام مگر اس نام نے اب اس سے اتنی رات بچھین لیے تھے۔ اب تو اچانک کوئی سوچ ذہن میں سامنی تو وہ خود سے لڑتے لڑتے تھک جاتی تھی۔ دل کی لوح پر لکھا یہ نام شاید بھی نہیں مٹ سکتا تھا مگر بھلا یا تو جاسکتا تھا وہ ایک عرصے سے بھلائی کی کوشش بھی کر رہی تھی مگر سب ادا حاصل تھا۔ اس کی آنکھیں بہہ پڑیں۔

”پری! حسب آپ کا رمیز سے نکاح ہوا تھا تو ماما پاپا بہت خوش تھے پھر ہمارے اس ہنسے بستے مسکراتے کھٹکھٹاتے آنکھن میں ایسی ہوا چلی کہ سب خوشی کے پھول آنکھوں کی آندھی اڑا کر لے گئی اور خزاں کا موسم ہمیشہ کے لیے ہمارے آنکھن کا نصیب بن گیا۔ آخر یہ ہر بار ہمارے ساتھ ہی کیوں ہوتا ہے؟ کبھی کوئی

زور سبب شاہ سانپ بن کر دستے تو کبھی کوئی رمیز؟ کالی بھینچہ بن کر ہمارے گھر کے آنکھن میں نقب لگاتا ہے۔ کتنا پیارا تھا ہمارا یہ گھر۔۔۔ کتنی رونق ہوتی تھی اس گھر میں۔ ماما پاپا کے مسکراتے روشن چمکتے چمکتے پرسکون چہرے میں اتنی شہنائی ہوا کرتی تھی۔ ماما پاپا اور آپ کتنی ڈانٹا کرتی تھیں مجھے میری شرارتوں پر۔ میں ہر وقت ہر احساس سے ماری ہر سوچ سے آزاد اس گھر میں چھپ جاتی پھرتی تھی۔ اور آپ ہر وقت خوش و گلن تابوں ماما پاپا کی ذات اور چمن کے کاموں میں دلچسپی لیے رکھتیں۔ اور اب تو یوں لگتا ہے جیسے ہمارے اس دیرانہ خاموش آنکھن میں برسوں سے کسی کی ایک چمک نہیں گئی کوئی پھول نہیں مہکا کوئی بنستا جھومتا سون نہیں اترتا بس کتنی ترقی ہے مسیبتوں تلافیوں اور غموں کے اگلے پڑتے ہیں اور سب نعمت ہو جاتا ہے۔ جب مطلع صاف ہوتا ہے تو صاف اس چار دیواری کے اندر ہم دونوں کا سسکتا تڑپا روتہ وجود رہ جاتا ہے۔ رجنہیں بس بھیا بھائی وقاص کی جھپٹ چھینے پر مجبور کیے رکھتی ہیں۔ آخر ہم خوش کیوں نہیں رہ سکتے؟ بابائش پر سون ہو کر ہر دم سے آزد میرا بھی بھار اس شدت سے دل چاہتا ہے کہ میں ماما پاپا کو نہیں سے ڈھونڈ۔ دل ان کی آغوش میں گر پڑے۔ اپنے اندر کے صحن میں چہل قدمی کروں۔ آپ پہلے ہی کی طرح ہنستی مسکراتی خوش رہا کریں لیکن یہ سب نہیں ہو سکتا۔ آخر پری! خوشیوں پر ہمارا بھی تو حق ہے ہمیں بھی خوش ہونا چاہیے۔ بے نا۔ بولتے ہوئے وہ روئے جاری تھی۔ ”انہ پچھ بھی نہ بول سکی۔ ساری رات کی گریہ و زاری سے بھی نیند خشک نہیں ہوئے تھے رہی سہی کہ اب پوری ہونے لگی تھی۔

”تم کیوں ان تصویروں کو دیکھتی ہو۔ جانتی ہونا ہم یہ برداشت نہیں کر سکتے پھر کیوں دوبارہ وہی

نیت ناک منظر میری آنکھوں میں آتی ہو؟ کتنی دفعہ کہا ہے تمہیں کہ ان کو بار بار دیکھا تو دیکھیں رہو گے۔ ہوں جاؤ۔ بس اب یہ اذیت ناک وہ نعمت ہو جانا چاہیے۔ خضوفی! میں یہ سب سب سے سب سے جانتے ہوں پر پتے پتے اب بہت تھک چکی ہوں۔ اب ایک جاہل ڈیڑھ گریست ناچاتی ہوں۔ ہر خوف سے ماری ہو کر آزادی کا لباس لے کر جینا چاہتی ہوں۔“ وہ خضوفی سے منہ دے سے ٹک کر سٹھکی۔ اسے تو دینے بھی دینے کے لیے بہانا چاہیے تھا آنکھوں میں درد کا ایک گہرا سمندر بہہ رہا تھا جسے وہ خضوفی کے کندھے سے ٹک کر بہا دینا چاہتی تھی۔ نوزان صدیقی برسوں سے رستے زخموں کو پھر کر پیدیا تھا۔ جس منظر کو بھلانے کی وہ برسوں سے کوشش کر رہی تھی وہ پھر تازہ کر گیا تھا۔ جو اس کی روح کو ہمیشہ چھید چھید دیتا تھا۔ اندر تک زخمی کر دیتا تھا مگر کبھی آنکھوں سے اوچھل ہی نہیں ہو پاتا تھا۔

”آپ بھائی کی بات مان لیتیں شام تک تو کافی دیر ہو جائے گی ایسا نہ ہو شام کو بخار اور تیز ہو جائے۔“ خضوفی آنکھوں کو پچھتی تصویریں اٹھاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی پھر اس کی طرف سے جواب کا انتظار کیے بغیر اندر کمرے میں چلی گئی۔ جب واپس آئی تو گیٹ پر کال ٹیل ہو رہی تھی۔ لائبریری سے آنکھوں کو صاف کرتے ہوئے خضوفی کو باہر جاتا ہوا دیکھتی رہی۔ جب واپس آئی تو اس کے ہمراہ مسز ریاض اور مسز جبار تھیں۔ دونوں ان کے محلے کی ہی تھیں۔ ان تھیں۔ کسی زمانے میں ماما پاپا کی ان لوگوں نے آپ کی خاصی ٹیک سیٹ تھی۔ اب تو ان کو ہر کوئی شک کی نگاہ سے ہی دیکھتا تھا۔

”آپ بیٹھیے!“ سیدم کے بعد انہ نے دونوں کو تو وہ دونوں بیٹھ گئیں۔ خضوفی بھی اس کے پاس

آ کر دوسری طرف بیٹھ گئی۔

”انہ! تم برا مت منانا۔ ہم دونوں تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔“ مسز ریاض نے غٹھو کا آغاز کیا۔

”جی کیسیا نئی! ہم نے بھلا پہلے کب کسی کی بات کا برا مانا ہے جواب مانیں گی۔“ وہ کتنی سے جنتے ہوئے ان کی جانب دیکھتی تھی۔

”دیکھو لائبریری! یہ شریفوں کا محلہ ہے میری تین بیٹیاں ہیں اور آنسو بیگم (مسز جبار) کی چار اس کے علاوہ محلے میں ہر گھر میں دو دو تین یا چار لڑکیاں تو ضرور ہوں گی۔“ وہ دونوں رگ کر دونوں بہنوں کے جتنے چہروں کی جانب دیکھتی تھیں۔

”جی آئی! ہم یہ بھی آپ کی طرح جانتے ہیں۔ آپ ہم مقصد کے لیے آئی ہیں یہاں کر رہیں۔“ انہ نے بھلے خضوفی نے انہیں کافی قی سے کہا تو وہ چہرہ گویا ہو گئیں۔

”بے وقوفیہ تمہارا دل کا ذاتی معاملہ۔ مگر ہم نے اپنی حیثیت سے پوچھنا ہمارا حق بنتا ہے کہ تم سے پوچھیں۔ تم دونوں بہنوں کا اس انسپکٹر سے کیا تعلق ہے۔ وہ رات کے دس بجے رو ڈیجیٹل بکے تک کیا کرتا ہے۔“ پوری صرف ایک دفعہ بولی تھی وہ معاملہ تم ہو گیا پھر ہر دوسرے دن اس کا تمہارے گھر کے چکر لگانا کیا مقصد ہے۔“ انہ نے تو اوسان خفا ہو گئے۔ وہ صرف چار دفعہ ان کے ہاں آیا تھا۔ صرف رات کو ہی تو لیٹ ہو گیا تھا۔ اسے ساری صورت حال بتاتے ہوئے دونوں کو وقت گزرنے کا احساس تک نہ ہوا تھا مگر دونوں کو اندازہ نہ تھا کہ لوگ کس کس طرح ان پر نظر رکھتے ہیں۔

”آئی! آپ غلط سمجھ رہی ہیں وہ بہت اچھے انسان ہیں۔ شہر دیکھائی کے دوست ہیں اور صرف چند بار ہی تو آئے ہیں۔ کبھی ہم سے بھی ملاقات ہو جاتی ہے۔“

الانہ نے بسکٹ اپنے حواس بحال کرتے ہوئے وساحت پیش کی۔

”شہود کا دوست ہے تو اس کے گھر جائے تمہارے ہاں کیا کرتا ہے؟ جب وہ شہود ملتا ہے تو اسی تک رہتا ہے یہاں کیوں آتا ہے؟ ہم نے اک نمر زاری ہے دھوپ میں بال سفید نہیں کیے۔ تمہیں بتاؤں اس معزز معاشرے میں جو نر کی ایسا دفعہ معتاد ہے صبر اوی جاتی ہے وہ جگا بھی نہا۔ تو بھی باکرہ اڑتیں ہوتی۔ باتیں بھی یازہ میں نہجے ہونے شتر جو اس کی روح کو اندر تک گھل کر تے جارہے پتے۔ وہ یہ سب باتیں پہلی دفعہ نہیں سن رہی تھی مگر جس شخص کے دوسلے سے اسے یہ سب جان جا رہا تھا اس کی ذات نامہ متبر غم کی بارش تھی وہ سب اس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔

”آنٹی پلیز! میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں صرف اس لیے کہ جب میرے والدین زندہ تھے تو ہم لوگوں میں رشتہ داروں سے بھی بڑھ کر خوشوار تعلقات تھے وہناپ ڈس اور آپ کی باتیں اس قابل تو نہیں کہ آپ سے منہ نہ جائے ہم آپ لوگوں کے سامنے پلے بڑھے ہیں جوان ہوئے ہیں اگر آپ نے واقعی دھوپ میں بال سفید نہیں کیے تو ہمیں بھی اچھی طرح جانا چاہیے کیا کچھ کھاتے آپ نے ہمیں؟ جس طرح ہی چاہتے ہمیں بے عزت کر کے ذلیل و رسوا کر دیں۔ خدا کے قہر سے ڈریے آپ کے اپنے گھر میں بھی بیٹیاں ہیں۔ خدا بخواتین ان میں سے کی ایک کے ساتھ ہم جیسا سوک ہو جائے تو پھر آپ کیا کریں گی؟ پلیز! دیر سے اس وقت سے ”ضوئی الانہ کے پتے زرد چہرے کو دیکھنے کا طرکے کوک بھیجی۔

”ہم خدا کے قہر سے ہی تو ڈر رہے ہیں جو تم دونوں ہمیں ابھی تک محال میں موجود ہو۔ ورنہ جس

طرح وہ اسپکٹرات گئے تک تم دونوں کے پاس تھا چاہتے تو رات کو ہی سارے محلے سمیت رنگ ہاتھوں پکڑتے۔“

”تو پھر پڑا کیوں نہیں رات وہی بیوی نہیں آئے آپ لوگ.....؟ آتے دیکھتے تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جاتا۔“ ضوئی نے اب بھی تروخ کر بات کاٹ دی تھی۔

”صرف اس لیے کہ یہ شہینوں کا محلہ ہے ایں بھیننی برداشت نہیں کر سکتا۔“

”خونہ شہینوں کا محلہ!“ ضوئی نے کافی فٹ سے دیکھا۔

”میں نے یا آنسہ بیگم نے اسے رات ڈھائی بجے قریب تمہارے گھر سے نکلتے نہیں دیکھا تھا اور پھر بھی بہت سے لوگ تھے جنہوں نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ہم لوگوں کو تمہاری ماں کی نیک نامی اور باپ کی شرافت رکھنے کے رشتے سے ورنہ تم دونوں بہت عرصے پہلے یہاں سے اپنی غلامت سمیت گریز کر چکی ہوتیں۔“ الانہ یہ الفاظ سنتے سنتے بے ہوشی ہوئی جا رہی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کی تیز دھارا سے اس کے بدن کے حصے بڑی بے دردی سے کاٹا جا رہا ہو۔

”چپ کر جا میں آنٹی پلیز! چپ کر جائیں۔ اگر آپ عزت والے ہیں تو بے غیرت ہم بھی نہیں۔ یہ شہینوں کا محلہ ہے تو کیا ہم چور اچکے بد معاشرے ہیں؟ اگر آپ جو ہمارے باپ کی شرافت اور ماں کی نیک نامی رکھنے کے لیے تو اب وہ ظہار کی زبان بھی پھر سے بولتے ہیں۔ اگر عزت اور نیک نامی کے چہرے قدم سے آپ نے پڑھ رکھے ہیں تو یقیناً دوہم نے بھی پڑھے ہوئے ہیں۔ اتنا اپنے مقام سے مت گریں کہ کل کو خدا کے سامنے جوابدہ ہوتے ہوئے بھی

شرمندگی ہو۔ آپ خود دونوں خواتین ایمان سے نہیں۔ اس محلے میں ایسی کون سی نر کی ہے جو نیک نامی عزت شرافت کے تقاضوں پر پورا اترتی ہے یقیناً نہ ہو۔ اسے نہ رے کوئی نہیں ہوئی۔ اگر آپ نے آنکھیں کھلی رکھی ہیں تو بند ہو رہی بھی نہیں ہیں۔ ہاں یہ ہے آپ انسانیت کو بھول رہی ہیں اور بھی نہیں انسانیت کا پاس ہے۔ ورنہ دیکھ جائے تو اس محلے میں کون سی باپ پر دو ملانی بی بی ہے جس کی کمرے سے راہ و رسم نہ ہو جس کا گھر سے باہر جانے والی سے نہ ہر پر کی لڑکے سے افسانہ چل رہا ہو۔ چپ کر! آنکھیں پڑی طرح کھول کر صرف اپنے درمیان تک نہ دوڑیں تو تمہارے گھر سے بیوی بیٹا بھی انہی لڑکیوں میں شامل ہیں۔“ وہ ڈرے دے بغیر کہہ لگئی۔ ہم با عزت ہیں اس نے لیے ہمیں آپ کی طرف سے یاں نام نہاں معاشرے کی طرف سے کسی کی تمہاری نیک نامی کے ریکلیکٹ کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم اپنے اللہ کی نظروں میں معتبر ہیں تو ہمیں بس ان رشتہ داروں سے اس محلے سے نکالنے میں اس کا حق ملتا ہے تو پھر جانے ہونی میں آتا ہے۔ انیس۔ ہم سب غیرت نہیں بلکہ آپ ہیں۔ جو دینی عزت اور شان کا بھارا دل رکھتے ہیں۔

”جیسے وہ کہتی ہیں جیسے انہوں کو مر جائے پر مجبور ہوتے ہیں۔ یہ معاشرہ کیا ہے؟ کیا حدود ہیں؟“

”اگر اس کے بارے میں سوچے تو آپ نیک نامی کے قہر سے ڈریے شرف کے عزت داروں میں بہت کم ہیں۔“

”لیکن انہوں میں سرفہرست ہوتے ہیں جبکہ عزت کے ذہیر آپ لوگوں کے پتے سر ہاں میں ہی عزت اور میں موجود ہوتے ہیں۔“ ضوئی غم سے کہہ رہی تھی۔

”پھر تو پھر رہی نہیں تھی۔ بلکہ ان کے

”ضوئی پلیز چپ کرو۔۔۔۔۔“ بیگم ریاض کی باتوں پر پھر کر بولتی ہوئی ضوئی الانہ کو ہر اسماں کرنی جارہی تھی۔ اس کی جان پر ہن آئی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ضوئی کی غصے سے آگ اٹتی زبان کو کسی طرح روک کر چپ کروا دے۔

”کتے ہیں پری مجھے۔“ اس نے ایک جھٹکے سے ان کے ہاتھ سے اپنا بازو چھینر لیا۔ ”آخر کیوں تو خدا دیکھ رہا ہے انہوں نے ہم میں یہ فوز ان صدیقی ہیں۔؟“ چوتھی تو نہیں ہے ہم میں۔ دراصل یہ ملک ہمیں ذلت و رسوائی کے تابوتوں میں بند سک سہا کر مرنے دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہمیں ہر حال میں محبت میں ہتھ مار دینا چاہتے ہیں جبکہ وہ اس ان کی طرف ذلت و رسوائی کی زبان و نظر استعمال کیے بغیر اسے خصوصیت سے انسانیت کا پاس کرتے ہو رہی مصیبت دور کرنا چاہتا ہے تو اب یہ ان نام نہاں معزز شریف معاشرے کے معتبر لوگوں کو برداشت نہیں ہوا۔ خدا کا خوف تو بالکل ہی ختم ہو گیا ہے ان کے دلوں سے۔ یہ وہ کسی پر بہتان تراشی کرتے ہوئے اپنے غم میں بیویوں کیلئے ہتھ مار کر صرف ہمیں نشانہ بنانے چلا آتا ہے۔ صرف اس لیے کہ ہم پر صرف ایک دفعہ دھبہ لگا تھا ہماری نیک نامی صرف ایک دفعہ شک کی پیٹ میں آئی تھی مگر یہ ہمارا باطن کیوں نہیں دیکھتے؟“ وہ پکڑ پکڑ کر رونے لگی۔ دونوں خواتین کا متصد شدید پورا ہو چکا تھا۔

”زبیر زبان چپاتی ہو تم۔ مسز جیلانج جاتی ہیں کوئی لیٹ نہیں ہے ہمیں۔ ہماری بیٹیوں پر انرا مہنگائی ہو رہی ہے جیسا کہ! ہم تو صرف شہودی وجہ سے خاموش تھے جو تم تک آئے لیکن لگتا ہے اب کوئی نہ کوئی بندوبست محالوں کو کرنا ہی پڑے گا۔“ اس دفعہ آنسہ

نیگم اپنی زبان کے جوہر دکھا رہی تھیں۔ آنکھوں کو صاف کر کے ضوفی نے تاسف بھری نظروں سے دیکھا۔

”جہ تو دیتے ہیں نے آپ کو جو بتی میں آئے آپ لوگ کریں جس مسئلہ کا آپ ذکر کر رہی ہیں انہیں بھی میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ آپ کو بھی..... لیکن خدا کا ہی خوف کر لیں اور اس وقت ہمارے گھر سے نکل جائیں۔ ایسا نہ ہو کہ میں مزید بدینیہ کی کر جاؤں کیونکہ آپ جیسی خواتین عزت کروانے کے قابل ہیں بھی نہیں۔“ وہ بھی غصے و نفرت بھری نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

بت بنی صرف دونوں طرف سے زبان اور آنکھوں سے اگتی آگ کو دیکھ رہی تھی۔

”ہمیں یوں بے عزت کر کے گھر سے نکال کر بہت برا کر رہی ہو۔ سوچا تھا زبان سے کچھ نہیں گے تو اثر ہو جائے گا۔ بات مردوں تک نہ جائے مگر تم لوگ تو کچھ اور ہی چاہتی ہو بھلا بے غیرتوں پر بھی کچھ اثر ہوتا ہے۔“ نیگم ریاض آگ بگولا انداز میں ضوفی کو دیکھ رہی تھیں۔ تاکہ کراخ میں وار کیا تھا۔ ضوفی بابا اٹھی۔ اس کی زخمی انا ایک دم مجروح ہوئی تھی۔

”خاموش رہیں اور دفع ہو جائیں آپ دونوں یہاں سے اور جو بتی پہلے خوشی سے کریں لیکن اس سے پہلے اپنی بیٹیوں کا انجام بھی یاد رکھیے گا۔ بتوں آپ کے ہم بے غیرت ہیں نا تو دھیان رکھیے گا کہیں واقعی میں ہم بے غیرت پن کا مظاہرہ نہ کر رہیں۔ اور یہ بھی یاد رکھیے گا اللہ بڑا انصاف کرنے والا ہے۔ ہم نے اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا ہے۔ اس دنیا میں نہیں تو اس دنیا میں وہ انصاف ضرور کرے گا۔ وہ سب دیکھ اور سن رہا ہے۔“ وہ دونوں اور غضب ناک لہجے میں سب کچھ کہتی گئی کچھ چند قدم آگے بڑھ کر الٹ بھونکا چہرہ لیے انہیں باہر کا رستہ دکھا رہی تھی۔ دونوں دھمکیاں

دیتی تن فن کرتی باہر کی جانب لپکی تھیں۔ ضوفی گیٹ بند کر کے آئی تو اسے اسی طرح بت بنے دیکھ کر فوراً اس کے پاس آ بیٹھی۔

”پری! کیا ہوا ہے آپ کو؟ ٹھیک تو ہیں نا آپ!“ اس نے لائبر کے گندھے پر ہاتھ رکھا۔

”پری!“ وہ اس کی بندہ ہوتی آنکھوں کو دیکھ کر زور زور سے راتی چیختی لگی تھی۔ ”پری! خوش کریں دیکھیں یہ نہیں ہوگا۔ چاہیں کریں کہ یہ لوگ آپ پلیز خود کو سنبھالیں۔“ وہ لائبر کی دھمکیاں رگڑتے سے بار بار پکار رہی تھی زور سے چپچہا رہی تھی۔

لائبر کی اس بے سند بات نے بت بنی حالت میں کوئی فرق نہ پڑا تو وہ بھائی کے پورشن کی جانب سر پٹ بھاگ گئی۔ جب وہ بھائی سمیت واپس لوٹی تو لائبر کھلم کھلا طور پر بے ہوش ہو چکی تھی۔

ضوفی نے شہر بھائی اور جانی سب بتا دیا تھا اور اس نئی افتاد پر انہوں نے بہت پریشان ہوئے۔ نیکمریاش اور نیکمریاش کی دلی توجہ سمجھیں شام کے تہ درت ثابت ہو چکی تھیں۔ جب استہوش آیا تو اس وقت شہر بھائی اور جانی اپنے گھر میں اکٹھے تھے کہ لوگوں کو مطمئن کرنے کی کوشش میں تھے۔ ضوفی نے بھی ان لوگوں کے سامنے پیشی ہوئی تھی اور لائبر وہ اس نئی صورت حال سے یکسر بے خبر تھی۔ وہ ہوش میں آنے کے بعد کتنی دیر تک کسی کی آمد کی منتظر رہی جب کافی دیر تک ضوفی بھیا بھائی وغیرہ میں سے کوئی بھی اس کے پاس نہ لونا تو وہ خود ہی بے جان ہوتی ناگوں و حسرتی باہر آ گئی۔ سارا گھر خالی تھا۔ وہ ضوفی کی تلاش میں بھیانک پورشن میں آ گئی لیکن وہاں لوگوں کا ایک ٹکڑا دیکھ کر اندر بھانٹ بھانٹ کی آوازیں سن کر پچھ پچھانے لگی۔

شہر بھائی اہم تہہ کی عزت کرتے ہیں مگر اس شخص کی یوں لڑکیوں کے گھر میں آمد کا آخر کیا مقصد تھا؟“ وہاں موجود لوگوں میں سے ایک بہت تیکھے انداز میں بولا تھا۔ منٹوں میں گزشتہ گزری اذیت لائبر کو بتانے لگی۔

”بت بنی! جی! میں آپ کو پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ اس شخص سے کافی کبر کی بات ہے۔ یہ لوگ بات بات پر آپس میں..... جب ہمارے گھر پر ہوتی ہوئی تھی تو اس نے بت بنی سے سنبھال لیا۔ یہ..... ان کی بیٹیوں سے رسوا ملاقات ہوئی تھی۔ لائبر نے دوسرے شخص کے سلسلے میں یہاں آیا تھا۔ سب کچھ یہاں آیت مجھے اطلاع دے کر اور میری باتوں میں آیا ہے۔ مجھے اس پر بھی اعتماد ہے اور اپنی بات پر بھی۔ کئی رات بھی جب وہ آیا تھا تو اس وقت بت بنی کی طبیعت کافی خراب تھی میں اور مادہ جیسے اندر ہی تھے۔ وہ ہمارے پاس ہی ادھر آ گیا۔ کافی دیر میں اس سے باتیں کرتا رہا تھا جبکہ بچیاں اندر ہی تھیں۔ وہ بہت شریف انسان اور نیک انسان ہے۔“

میانے دونوں انداز میں کہا۔

”میرا خیال ہے اب آپ کو میری بات سے مطمئن ہو جانا چاہیے اگر آپ ثبوت مانگتے ہیں تو وہ ف کیجیے گا“ آپ کو چاہیے تھا کہ آپ رات کو ہی اندر کا رخ کرتے اور سب دیکھ لیتے۔ اسی وقت سب معاملہ صاف ہو جاتا۔ نہ میں اب اس وقت یہ لمبی پوڑی تاویلیں اور وضاحتیں پیش کر رہا ہوتا اور نہ آپ دھڑ دھڑا شریف حضرات میرے اس غریب خانے پر جمع ہونے کی زحمت فرماتے۔ جہاں تک بچیوں کی تعلیمات کا تعلق ہے تو وہ میری ذمہ داری ہیں اور میں اپنی ذمہ داری سے بہ احسن واقف ہوں آپ لوگوں کو یہاں ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں بھی کوئی گنا گزرا

عام انسان نہیں ہوں اگر آپ کوئی انوکھا ٹرالا قدم اٹھا میں گے تو میں بھی مجبور ہو جاؤں گا۔ اگر ہماری بچیوں کا بال بھی بیکا ہوا تو نتیجاً آپ کو بھی بھگتنا پڑے گا۔ میں یہ صرف کہہ ہی نہیں رہا اگر آپ نے میری بات اور معذرت قبول نہیں کی تو میں یہ عملاً بھی کر دکھاؤں گا۔ جس شخص کے حوالے سے آپ سب یہ کہہ رہے ہیں اس کا بھی اس معاشرے میں ایک خاص مقام ہے۔ اس ایریے کا پورا کنٹرول ہے اس کے پاس۔ اگر اسے ایک اشارہ کروں تو یقیناً آپ کو یہ مناسب نہیں لگے گا ورنہ میں صرف اپنی بیٹیوں کی وجہ سے خاموش ہوں۔“ شہر بھائی بہت بے ہوش ہو چکی تھیں۔ اس نے لائبر کی اب اس کے اندر بہت کچھ نہیں تھی۔ بہت ہی تلیف سے وہ جیسے پر خار راستوں پر چلتے واپس اپنے کمرے میں لوٹی تھی۔ جس شخص کے حوالے سے ان کے ساتھ یہ سب کہا جا رہا تھا وہ شخص نجانے کیا سوچے بیٹھا تھا۔ مگر افسوس یہ ظالم دنیا.....!

وہ یوں بستر پر گری جیسے برسوں کی بیمار ضعیف اور لاغر ہو۔

(جاری ہے)



(گزشتہ اقساط کا خلاصہ)

پارس عرف پر کی مردم تو جہی اور سوتیلے رشتوں کی بدسلوکی کا شکار ہے۔ وادی جان اس کے لیے گھر بھر میں واحد محبت کرنے والی شخصیت ہیں جبکہ اپنے والد فیاض صاحب سے اس کا رابطہ واجبی سما ہے۔ فیاض صاحب کی دوسری بیوی صاحبہ فطرتا حاسد فطرت اور خیر خیر پرست ہیں۔ ان کے یہی اوصاف ان کی بیٹیوں کا حال اور معاذ میں بھی بدرجہ اتم موجود ہیں۔ بہتہ پر کی وادی جان کی حیثیت گھر بھر میں

قسط نمبر 7

بیلے کے پیلے پیلے

اقرا عظیمی احمد

قرب سے نہ دہ کے ہوتے ہیں

بہار سے بہتر انا کے ہوتے ہیں

کول جات ہیں مت برا کہنا

لوک پنے خطا کے ہوتے ہیں

مشہور ہے۔ پانی جان سے پر کی کا اختلاف اس وقت ہوتا ہے جب آب مندریلیا سے ان کے پوتے مغفل کی بوجھ شادی آمد کی اطلاع پر وادی پر کی کو اپنا لڑا مغفل کے لیے خالی کرتے کو جتن ہیں۔ اپنے کمر سے اسی والی والی کے سبب پر کی انکار کرتی ہے۔ بعد ازاں آمادہ ہو جاتی ہے۔

رجہ ایک باپ اور حسین و جمیل لڑکی ہے جس کا تعلق مذہبی اور پابند ہے۔ اس کی دوست سے اپنے کزن سمان عرف کی کی جانب مائل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ وادی گاہ بے گاہ سے رجہ کے ہر کے پندہ اڑھتے ہوئے ماحول کی ممانعت کر کے رجہ کو اس سے متنفر کرنے کی دوشل کرتی ہے۔ رجہ کے گھٹے میں ہارن نامی ایک حسین و جمیل نون کے چرچے ہیں جو کروار کے حوالے سے مشکوک کہلائی جاتی ہے۔

مغفل کی مدد خاصی ہنگامہ خیز ثابت ہوتی ہے۔ پر کی کے ذہن میں مغفل اور اپنی بچپن کی لڑائیاں تازہ ہیں۔ پرانی چپقلش، مغفل سے عناد کے باعث وہ مغفل کی آمد کے بعد بھی کافی عرصہ اس سے چھپ کر رہتی ہے مگر ایک روز مغفل اسے اپنے سامنے لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے البتہ پر کی کی مغفل سے رحمانی برقرار رہتی ہے۔ والدہ مغفل پر مہفتت ہے اس کی وجہ سے اور اس کے انٹینس کے سبب۔ پر کی کی والدہ فیاض صاحب سے علیحدگی کے بعد اپنے خالہ زاد صندرم جمال سے شادی کر چکی ہیں جو ایک



We at Paksociety.com
giving you the facility to
download urdu
novels, monthly digest, roman
series etc with direct links
and alternatively 21 other
mirrors.
for complaint about site not
opening contact us @
admin@paksociety.com or
message at 0336-5557121

انہیں اب تھا۔ وہ کس کو بتاتا رات کے آخری پہر اس گھر کی عزت سیاہ رات کی سیاہی پھیلا کر اس گھر سے فرار ہو چکی
 ہے۔ کہاں؟ اور کس کے ساتھ؟ یہ وہاں سرری رات اس کو دستار باند تھا۔ وہ جانتا تھا بات سب بات کام ہو
 جائے تو وہاں کی بات ہے پری کو پار سے اس سے ہر چھوٹے بڑے کام کرانے کی اور جب صبح وہ اس کو گھر میں نہ
 پائیں گی تو.....!

اس سے آگے سوچ کر اس کی سانسیں بند ہونے لگتی تھیں۔

سحر میں بھٹکتے ہی مسافر کی طرح وہ کمرے میں چکر لگاتا رہتا رہتا سوچتا رہا۔

پری کہاں جاسکتی ہے؟ کس کے پاس جاسکتی ہے؟ کون ہے ایسا بندہ اس کا؟

وہ سب گھر والوں کے بیدار ہونے سے قبل ہی پری کو اس گھر میں لانا چاہتا تھا۔ بلاشبہ ان دونوں کے تعلقات
 ایک دوسرے سے ہمیشہ کی طرح آج بھی خراب تھے اس کی ٹانگ میں آج بھی پری کا نام نہ تھا۔ بے شک وہ بھی
 اس کے لیے تافکر مند نہ ہوتا اگر وہ ایسی بات حرکت نہ کرتی تو..... اوہ بہت اٹھیا حرکت کرتی تھی۔ معاس کے
 ذہن میں تھا وہ سارا دور سے یاد آگیا وہ پری کو اس کی مانی کے باں ڈرپ کرتے گیا تھا۔

وہ دیکھتا جانتی ہے اس کے بارے میں اس کا اور کوئی نمکناہ نہیں ہے۔ یہ خیال آتے ہی اس کے اندر ایک برق سی
 دوڑتی تھی۔

موسم میں خنکی بڑھتی تھی۔ اس نے جیٹ پینٹ ہوئے کھڑکی سے باہر نکا وہ زانی تھی ابھی رات نے ابھی سے
 دیر سے بننا شروع کیا تھا کاروں چلی اٹھا اگر وہ بہت غیر محسوس انداز میں چلتا ہوا جوتے پہن کر
 پارکنگ کے پاس آتا تو باہر تیزی سے ہند پھیل رہی تھی جس سے ان کی ہوا اس میں مزید بڑھ گیا تھا اگر وہ موسم کے
 اس تیز رفتاری سے متاثر نہیں ہوا تھا۔ اس کے اندر جو آگ ابھرتی تھی یہ خنکی اس آگ کو بجھانے کے لیے
 قدر کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس کی چاروں طرف پر پوری رفتار سے دوڑ رہی تھی۔

اس نے بھی سوچا نہیں ہوئی تھی۔ انا دھکا کاریوں سڑکوں پر رواں دواں تھیں۔ وہ بہت جلد پری کی ٹانگوں سے ہٹ کر
 پہنچ گیا تھا چونکہ دار نے اپنے کہیں کی کھڑکی کھول کر اسے دیکھا اور پہچان کر سلا م کیا۔

”خاتن بابا! نیگم صاحبہ سے ملنا ہے۔“

”صاحب! نیگم صاحبہ تو کل سے شہریت باہر گئی۔“ جواب دینے پر پوچھنے والے نے اس کے اوسان خفا کو ڈھلایا۔

”کس سے؟“ ”کیا پری بھی تم سے ملے؟“ ”اگلا جواب اس کے پیش اڑانے کے لیے کسی ہم سے کم نہ تھا۔“

”تیس صاحب! نیگم صاحبہ کیلا گیا ہے۔“

”تم نے خود دیکھا ہے؟“ اس کی عجیب حالت تھی۔

”جی صاحب! ام نے خود دیکھا ہے اپنا ان گناہ گانا کھوں سے.....“ طغزل کو ساری دنیا گول گول گھومتی محسوس ہوئی۔



نیم کے درخت پر چھوٹا ہونا نہیں ور کر رہی تھی۔ شہر پر چڑیاں اس کی شاخوں پر ایک دوسری سے اٹھتھیلیوں
 کرنے میں مصروف تھیں۔ ان کی چہکار سے کھن گون رہا تھا۔ گھر میں اس وقت سب حد خاموشی تھی اور اس
 سناٹے میں کوئی چیزوں کی چہکار وہاں پائپ پر بیٹھے خانم کو بہت سکون پہنچ رہی تھیں۔ اس نے جیب سے نوٹ

نکلے اور نکلے گا۔

”سو دوسرا ایک ہزار تین سو پچاس روپے..... اتنے کم روپوں میں ایک خوب صورت انگوٹھی بھی نہیں آنے کی نہیں پاتا، وہ اپنی رخ کو سونے کا پورا سیٹ لاکروں۔ کتنی خوش ہوگی وہ جب میں اس کو سونے کا سینہ لاکروں گا۔ وہ حیران ہو جائے گی اور جب وہ حیران ہوتی ہے تو اور بھی حسین دکھائی دیتی ہے۔“ وہ ہاتھوں کو تکیہ بنا کر چارپائی پر ایٹ کر سونے کے تھوڑے گم ہو گیا۔

”رخ“ نے میں بھی اتنی حسین لگتی ہے جتنی مسکراتے ہوئے تھی۔ وہ مجھ سے تو ہر وقت خفا کرتی ہے اور مجھے پسند بھی نہیں کرتی۔ نہ مری تو نہیں وہ مجھے اچھی لگتی ہے تو میں بھی اسے اچھی لکوں۔“ وہ مسکراتے ہوئے خود کلامی میں مصروف تھا۔ ”ضروری تو یہ ہے کہ وہ مجھے اچھی لگتی ہے اور ساری زندگی اچھی لگتی رہے، محبت میں میں دین نہیں چلتا۔ محبت سودا تو نہیں ہے کہ ایک بیچتا ہے ایک خریدتا ہے۔ محبت تو ایک قسم ہے اس کو فتح کرنا آسان کام نہیں ہوتا اور میں رخ کے دل کے دروازے پر اس وقت تک دستک دیتا رہوں گا جب تک وہ دروازہ میرے لیے نہیں ہوجاتا۔“

فاطمہ نماز سے فارغ ہو کر باہر آئیں تو کانا سواں طرح لیے، جیلا کر پیار سے گویا دیکھیں۔ ”کانا نام اس طرح ہے اس لیے ہو بیٹے! میں تمہارا کرتی ہوں آرام سے لیو! وہ تمہارے لیے مٹریں۔“ انہیں نہیں تانی جان! میں جارہا ہوں آپ تعیہ مت لائیں۔“ وہ ان کو دیکھتے ہی اتار اٹھ گیا۔

”نامب فاولی کے بعد ابھی آئے ہو اب کہاں جا رہے ہو؟“ پتھر دیر آرام کر لینا پھر چلے جانا۔ کسی دوست کی طرف ہی جانا ہو گا نا!“

”میں تانی بان دوست کی طرف نہیں جاؤں گا۔ اب تو وہ توں سے کبھی بھی آتے جاتے ملاقات ہو جاتی ہے۔“

”پتھر کہاں جانے کا ارادہ ہے جس کی خاطر تم آرام بھی نہیں کر رہے ہو؟“ فاطمہ حیرت سے گویا ہوئی۔

”وہ“ میں نے ایک سپر اسٹور پر بات کی ہے دن میں وہاں پر نوکری رکھوں گا۔ معقول تنخواہ مل جائے گی یہاں سے تو میری تنخواہ دینی ہو جائے گی۔“

”کانا نام! انسان ہونے میں نہیں ہو جو چوبیس گھنٹے کا نہ سوئے۔ بندہ اپنی استقامت کے مطابق ہی کام کرے تو بہتر ہے ویسے بھی ہم کو ایسی کوئی ضرورت نہیں کہ ہمیں اس کی خاطر تم خود کو مشین بنا لو۔“

”تانی جان! آپ کو کیا معلوم یہ سب کس کی ضرورت کے لیے اور اپنی خواہش پوری کرنے کے لیے ہی تو کر رہا ہوں۔“ وہ دل ہی دل میں ان سے منطاب ہوا تھا۔

”ایک تو وہ رخ سے بہت ٹھک ہوں میں۔“ وہ آنگن میں پھیلے نیم کے پتے جھاڑو سے سینٹے ہوئے بیویڑائیں۔

”کوئی غلطی ہوگئی اس سے؟“ ماہ رخ کے نام پر اس کا دل دھڑکا تھا۔

”غلط نہیں، کانا خیال کو اس نے میں نے کیا گھر داری سیکھتی ہیں گھر کو بناتی سنوارتی ہیں اور وہ پڑھائی میں بھی رہتی ہیں۔“ انہوں نے جھنجھلا کر کہا تھا۔ وہ مسکرا کر اٹھ گیا۔

وہ اندر سے فرار حاصل کرنا چاہتا تھا تبھی بلا متصدد کا مختلف سرکوں پر دوڑاتے پھر رہا تھا۔ وہ سب برداشت کر سکتا تھا۔ جیلنے کا حوصلہ رکھتا تھا مگر داد کو کوئی تکیہ نہ پہنچے۔ وہ آزدہ ہوں ان کا دکھ کسی قیمت پر وہ برداشت نہیں کرتا تھا۔ اس کی نگاہیں تیزی سے اندر ادھر سے زور سے دلی ہلکی کے چہرے پر پڑ رہی تھیں کہ شاید ان میں کوئی پری ہو۔

رات سے شام ہوئی تھی۔ اس نے ان جھپوں کو تبھی چھان مارا تھا جہاں تبھی اس کا زور بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ کہیں نہ تھی۔ پری شاید کسی پرستان کی پری کی طرح اوجھل ہوئی تھی۔ بوجھل قدموں کے ساتھ اب وہ گھر کی طرف اٹھ رہا تھا۔

وہ رقتہ رکتے ہی سب چہروں کو اس نے پریشان و متشکر پایا تھا۔ دونوں پھوپھوں کو فیملیز کے ساتھ موجود پا کر۔

”تے میں میری نہ تھی کہ پری کے فارغی خبر ان تک بھی پہنچ گئی ہے۔“

”ہاں چلے گئے تھے طفل! اب بے حد پریشانی سے فیاض صاحب اس کے قریب آ کر سنجیدگی سے گویا ہوئے۔“

”وہی جان تھی میں؟“ وہ آواز تھی سے گویا ہوا۔

”طبیعت بگڑ گئی تھی ان کی۔“

”پتھر! کیا وہ اسپتال میں ہیں؟“ وہی ہوا تھا جس کا خدشہ ان کو اب تک ستاتا رہا تھا۔ بھلا دادی اتنا بڑا مددگار کس طرح برداشت کر سکتی تھیں وہ ان کی بات قطع کر کے بولا۔

”نہیں ڈاکٹر! پری پیس اب رکے یہ ہے۔ اب ان کی طبیعت بہتر ہے وہ فینڈ کے انجکشن کے باعث دیر ہیں۔“

”شکر ہے اللہ کا!“ اس نے گہرا سانس لیا۔

”آپ فریش ہو کر آئیں ضروری بات کرنی ہے آپ سے۔“ انہوں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر

کہتے ہوئے کہا تو اس کو خیاں آیا وہ سارا دن نائٹ سوٹ میں مختلف جعبوں پر مارا مارا پتھر تار رہا تھا اس کو نہ پہنے اس کا خیال رہا تھا نہ بے ترتیب حلیے کا۔۔۔۔۔ وہ ہر بات سے بے پروا بس پری کو ڈھونڈنے میں سرگرداں رہا تھا۔

وہ رات وہاں رہے مگر ان کے سب سے پریشان تھے۔ ”کھانے کی تھیں پتھر۔“ وہ پتھر پتے استفسار کیا۔

”پتھر تو تم آگے ہم صبر کرنا ہے جانی کو کال کرنے والے تھے۔“ چھوٹی چھوٹی مرنے اس کی جانب دیکھتے رہے۔

پری کی وجہ سے میری بچی کی بچی نوشی میں رکاوٹ پڑ گئی ہے نامعلوم سسٹم میں بھڑکی میں جھنجھلا رہی تھی۔

”سبابت کا مزاج بری طرح بدلا ہوا تھا دوسروں کے چہروں پر بھی تاثرات پتھر پتھر تھے کھانا بخوشی

میں کھایا گیا۔

”ارے کتنا کم کھایا ہے تم نے؟“ اسے اٹھادیکھ کر صبا حث نے کہا۔

”بھوک نہیں ہے آنٹی!“ اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”اماں جان کی فکر ہوگئی ہے تم کو۔“

”جی۔۔۔۔۔ میں ان کے پاس جا رہا ہوں۔“

”میں یہ نہ ان کے لئے نہیں بنوں۔“

نامعلوم کیوں جس دن میں تمہیں کسی پارٹی میں انوائٹ برقی ہو اس دن ہی تمہارا ہمیں چہ نہتہائی منہ مرقی

”میرے ہر قدم پر آتے ہیں وہ بھی میرے اُتارے۔ اُن کے لیے اُن میں بھی تو ہیں وہ تو قہرِ مہرِ مہر کی۔“

یہاں اس شخص بھی نہیں ہوں کہ تمہیں تمہارے کمرے کے دروازے پر چڑھ کر اندر پرست باندھنا میں باہر سے ہی بہار آئل دیکھ لوں گی۔“ جویریہ کا سادہ لہجہ طنز سے پاک تھا وہ اس سے محبت بھی کرتی تھی اور اس کی خوب صورتی سے مرعوب بھی بہت زیادہ تھی۔

کئی بلی بیٹھ بھی بیوی نہیں۔ جو یہ کہتی تھی آج اس سے سب کا اعلان کر رہی تھی مرنے والی بھی ایسی
 نہ تھی کہ سوچ رہی نہ تھی کہ تم پر جس طرح کی باتیں ہوں گی۔ یہاں سے کہہ دو کہ تم نے کئی بلیوں کو مار دیا ہے۔

ولی بات نہیں میں تمہیں وہیں خرچہ نزدیک ہوں مانتہ مت کرنا میں نہ نہیں جہوں کی کہہ جا کر مجھے پار
جاتا ہے۔“

5-11-10001	83	141
------------	----	-----

”خبر! اماں سو رہی ہیں۔ آئیں! کچھ باتیں کرتے ہیں۔“

اس جگہ سے اکثر پرمی ہوئے ہیں۔

”اے دوست! فون آیا کہ اس نے چٹلی کے شہر کا پروگرام دیا تھا اور جی دوست تھے میں نے سمجھتا ہوں کہ یہ وقت میرے دورِ مکر صغریت فرشتہ ہیں۔“

پیشہ و مشاغل کے لیے

آنجیل 86 دسمبر ۱۱-۱۲

برائی پڑتیں۔

وہ گھر پہنچی تو شام ڈھل رہی تھی، غافلہ اس کے انتظار میں دروازے کے چکر لگا رہی تھیں اس کو گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر انہوں نے غصے میں اتنی دیر ستانے کی وجہ پوچھی تو وہ چڑ کر بولی۔
"ابن! میں کو غمناک بس میں آتی ہوں، بونے میرے لیے کوئی کار نہیں لے رہی جو مجھے ہانپ پر پہنچے کہ پیٹ ٹرا سپورٹ میں تو دیر سویر ہوئی جاتی ہے۔"

"باب باب! اب اپنے باپ کو کلمہ دے پوری کرے، ذرا لے تاکہ مہرانی کے لیے کار اور ڈرائیور رکھے۔ آج ہارلی آرزو جلی بنے کل ہوائی جہاز کی فرمائش کرنا ناشکری لڑکی۔"
ان کے جزا انداز پر وہ اندرونی سر کی جانب بڑھتی۔



شٹی کا ماما آج بہت بہتر تھا۔ صندریہ جمال کے ساتھ بھی انہوں نے خوش گوار وقت گزارا تھا۔ سارا دن انہوں نے صندریہ سے باہر گزارا تھا، تفریق مقامات پر پچھ رات وہ ذرا ایک اتنی پختہ رہتے تھے، صندریہ نے کہا۔
"جی! بار آپ کو اتنا خوش اور مطمئن دیکھ کر مجھے بے حد مسرت ہو رہی ہے، آخر اس خوشی کا راز کیا ہے؟"
"راز معلوم کرنا ضروری ہے کیا؟"

"جی جناب! تاکہ وہ راز معلوم ہو جائے تو ہم آپ کو حیات اس طرح بہت مسکراتا زندگی سے اظہار دیکھتے رہیں۔" صندریہ جمال کے لہجے میں محبت ہی محبت تھی۔
"ہو راز معلوم ہو جائے وہ راز پھر راز کہاں رہتا ہے؟"
"ہم کسی خزانے کا راز تو نہیں مانگ رہے، آپ سے جناب! ہم تو راز مانگ رہے ہیں جو خوشیوں کے خزانے ہماری زندگی میں بھر دے اور ہم اس طرح ہی خوش و مطمئن رہیں۔"
شٹی جواباً مسکراتے ہوئے گویا، وہی تھیں۔

"سعود نے اپنی ضد چھوڑ دی ہے اس ہندوؤں کی سے شادی کرنے کی آپ نہیں جانتے اس کی من ضد نے کس قدر الجھا رکھا تھا۔"

"آپ سے کس نے کہا..... سعود نے اپنی ضد چھوڑ دی ہے؟" ایک دم ہی صندریہ جمال کے مسکراتے چہرے پر حیرت کی آگئی تھی ان کے بدلتے لہجے میں پتہ چلا کہ اسے اس پر حیرت تھی، شٹی نے کہا۔
"مجھ سے کس نے کہا..... مگر وہ بار بار کا لڑ رہا تھا، میں نے اس کی اور اب ایک نشتہ سے فی موٹی ہے اس کا منہ اب ہے اس کو سمجھاتی ہے وہ ایک غیر مذہب کی لڑکی سے شادی کر کے پریشانی کے علاوہ کچھ اور حاصل نہ کر پائے گا اس لیے یہ نہ کا لڑ رہا ہے ورنہ میلو!"

"شٹی! میں اس منطق کو نہیں مانتا جس کے سبب مذہب کے نام پر دودلوئی کو ملے نہیں دیا جائے۔ سعود پوچھا۔
محبت میں بہت آگے نکل چکا ہے۔" شٹی ناگوار انداز میں صندریہ جمال سے بولی تھیں۔
"یہ بات فلاسفی کی نہیں ہے، ہماری مذہبی حدود کی ہے، ہماری شناخت کی ہے، ہم اپنی ذاتی پسند ناپسند میں سمجھ

تے ہیں، مذہب کا مقام جہاں پڑا جاتا ہے، وہاں ہم سمجھوتا نہیں کر سکتے۔"
"اچھا! آج تک میں نے نہیں سنی نماز تک پڑھتے نہیں دیکھا۔" وہ طنز یہ انداز میں ان سے مخاطب ہوئے۔
"نماز اللہ کے لیے ہوتی ہے اور اس کے لیے ہی ادا کی جاتی ہے نہ ورنہ نہیں جو نماز پڑھتے نظر نہ آئے، وہ نماز ہی ان کے حق اور میں شکر کرتی ہوں اپنے رب کا جس نے مجھے مسلمان پیدا کیا اور میری دعا ہے میری ذات بھی یہاں نہ ہو۔" ان کا اچھے عامانوں نے مختلف اور مضبوط تھا۔

"میں مانتا ہوں ہم مسلمان ہیں اس پر ہمیں غرہ ہے مگر۔" صندریہ جمال اب متردد ہو چکے تھے۔

"مجھ کو یہ کبھی ہمیں اس جگہ پر بھی سمجھوتا کرنا پڑتا ہے جہاں کچھ ممکن نہیں ہوتا۔" وہ ان سے نرمی سے گویا ہوئے۔
"مطلب؟" وہ ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی تھیں۔
"مطلب یہ کہ کبھی ہمیں اس جگہ پر بھی سمجھوتا کرنا پڑتا ہے جہاں کچھ ممکن نہیں ہوتا۔" وہ ان سے نرمی سے گویا ہوئے۔

شٹی کو ان کی سائیں بند ہونے لگی ہیں، دل پر زبردست غریب لگی تھی وہ گہری جہی سانسوں کے درمیان پہنچتی تھیں۔

"کس کی اجازت سے یہ سب ہوا.....؟"
صندریہ جمال نے فوری جواب نہیں دیا، ایک گانا میں سمجھنا پانی لے کر ان کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔
"ریلیکس..... پلیز..... پہلے پانی پی لیں۔"
"نیرب! میں جو آگ لگی ہے وہ پانی سے بجھنے والی نہیں ہے۔" انہوں نے کاس دھوا چھال دیا وہ اس وقت یہ نشتہ میں تھیں۔

"میں پوچھ رہی ہوں اس اجازت اس نے دی ہے، ابھی وہ ہماری دی کی پائنتی پر زندگی گزار رہا ہے، ان کی ذمہ داری وہ ہماری سپورٹ کے بغیر نہیں اٹھا سکتا، پھر یہ سب کس طرح ہوا؟" وہ صندریہ جمال کے متقابل لہڑی ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھ رہی تھیں۔

"میں نے اجازت دی ہے، میں نے کچھ نشتہ مریکا ہی گیا تھا۔"
شٹی ٹیب کی نظروں سے انہیں دیکھتی رہی تھیں۔ ان کی نظروں میں بہت بہتر تھا، بے رنج، غصہ نہ مت!



آج دوسرا دن تھا وہ دوا کی جان کا سامنا کرنے سے متر اب تھا۔ پرسوں رات سے کل سارا دن اور رات کے تک وہ کما ہونڈ نے میں لگا رہا تھا، ہر جگہ ہونڈ نے کے باوجود بھی ناقامی اس کا مقدر ٹھہری تھی، گھر میں کس کو پوری کی فکر اس کے لیے تلاش کا ذریعہ بنتا اور اس کو بدل اس بات پر بھی تھا کہ اتنی بڑی بات فیاض چچا سے چھپائی گئی تھی۔
"جی جب وہ اس سے بات کر رہے تھے تو ان کے انداز میں ایسی کوئی بے چینی و اضطراب نہ تھا جو اس قسم کی بات حال میں محسوس ہوتا ہے جب کہ وہ خود اس کے لیے فکر مند تھے کہ وہ صبح سے بنا پائے غائب ہو گیا تھا اور اس طرف ان کو دوا کی جان کی اچانک بڑھنے والی طبیعت کی فکر تھی ان کی گفتگو میں پری کا کوئی ذکر نہ تھا۔
اس نے بھی عہد کر لیا تھا کہ اب تک وہ پریکٹس نہ ہونڈ نہیں لے گا، جہنم تک سکون سے بیٹھے گا نہیں۔ یہ ارادہ

جی۔۔۔؟“ وہ بڑی طرح گھبرائی تھی۔

”کچھ تو کہا ہو گا تا جو تم اس قدر روٹی ہو کتا نکھیں سو تائی ہیں۔ تم، تمنا خواہو تو نہیں رو سکتی ہو؟“

”جی نہیں، کچھ نہیں کہا، میرے سر میں درد ہے۔“

”کان کھول کر سن لو میرے گھر میں یہ بے حیائی نہیں چلے گی، میری بیٹیوں کا ساتھ ہے اور میں نہیں چاہتی تمہارے چہن دیکھ کر میری بیٹیوں پر کوئی انگلی اٹھائے، بہن تو تم ان کی کہانی بونا، نہ بھلے سو ٹیلی سہی۔“ وہ اسے گھورتی ہوئی چلی گئیں۔



دادی جان نے اسے سینے سے اس طرح لگایا جیسے رسول بعد ملاقات ہوئی ہو۔

”کیسی قیامت بیت گئی میری جان پر طغراں!“ وہ اسے سینے سے لگائے زار دقتہ رروٹے نکھیں اور طغراں نے تڑپ کر ان کو اپنی حصار میں لیا تھا اور نرمی سے آنسو صاف کرتے ہوئے کہنے لگا۔

”مت رو میں دادی جان! میں سب برداشت کر سکتا ہوں مگر آپ کے آنسو میں نہیں دیکھ سکتا پینا، دادو! اب ٹھیک ہو گیا ہے سب۔“

”کیا کیا دوسرے دل میں خائے ٹمڑے بڑے خیالوں نے اسے موار دیا تھا مجھے اندازہ نہ تھی ان کے ساتھ ایسا نہ ہو۔“ وہ کہہ رہی تھیں۔

”پری! دادی کو بچھو ہو جاتا تو میں تمہیں جان سے مار دیتا۔“

”بھئی ولی ایسا کرتا ہے کیا؟ یہی تربیت ہے میری؟“

”پری! آپ کی تربیت کا نہیں اپنی مائی کی ذہنیت کا، شریا ہے۔“

”نائب عادلہ نے بتایا تم کمرے میں نہیں ہو تمہارا موبائل بھی وہیں ہے تن سے دو پہر دو پہر سے شام ہو گئی تو میرے حواس میرا حوصلہ میری ہمت سب جواب دے گئی اور مجھے ہوش ہی نہ رہا۔ سب جگہ فون کیے ماما آصفہ گھبرائی ہوئی آگئیں تمہاری گمشدگی کا سن کر فیض الگ پریشان رہا اور تو اور عادلہ کے سسرال والے اسی دن آنے والے تھے رسم کرنے کے لیے ان سے معذرت کی گئی۔“

”یہ کیا کہہ رہی ہیں دادو!“ اس کے سر پر ہم بلاست ہوا تھا۔ ”پرسوں سب میری وجہ سے پریشان تھے، آپ کی طبیعت میرا وجہ سے خراب ہوئی تھی۔“ اس کے ذہن میں آنندھیاں چنے لگی تھیں۔

”خراب نہ ہوگی؟ حالات دیکھ رہے ہو یہاں کے؟ پھر تمہاری عادت ہے مجھے بتا کر جاتے ہو کہیں بھی جاؤ اور فون بھی بار بار کرتے ہو۔ تمہارا اس طرح جانا وہ بھی شب خوابی کے لباس میں بغیر موبائل کے ہم سب کو ہی بے حد پریشان کر گیا تھا، میں تو ہوش دھواس کھوئے بیٹھی تھی ماما نے بتایا تم آئے بھی تو بہت پریشان دیکھتے ہوئے تھے۔ کھانا بھی تم نے برائے نام ہی کھایا اس لیے کسی نے تھ باز پرس کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ آج بھی دو دن بعد تمہاری یہ بیماری ہی صورت دیکھ رہی ہوں میں۔“

دادی پوری روئیداد ساری تھیں اور اس کے ذہن میں شور تھا۔

”دادو! پری کا معلوم ہے وہ کہاں ہے؟“

”وہ اپنی مائے کے ہاں گئی ہوگی، جس طرح تمنا سب ہوئے تھے اس کی شام کو میں نے اس کو اس کی مائے کے ہاں لے دیا تھا دو پندہوں کے لیے وہاں رہنا چاہتی تھی۔“ دادی کے پاس زیادہ بیٹھا نہ گیا اس سے۔ وہ وہاں سے آ کر ان میں صوفے پر بیٹھ گیا تھا اس کے اندر انسانی تپیلی ہوئی تھی۔

کس گورکھ دھندے میں پھنس گیا تھا وہ۔۔۔!

رات کی تاریکی میں جو اس نے دیکھا وہ اس کی نگاہوں کا دھوکا ہرگز نہ تھا سیاہ چادر میں منہ چھپائے لڑکی کو لان۔ نر کر گیٹ سے باہر جاتے اس نے دیکھا تھا۔ وہ ننگے پاؤں اس کے پیچھے ہٹا تھا مگر وہ اس سے زیادہ برق رفتاریت ہوئی تھی جو اس کے گیٹ سے باہر نکلتے سے بل کر پھینک دیتی تھی اور اس کو یقین تھا وہ پری ہی تھی جو مباحثہ آٹمی کی باتوں سے دل برداشتہ ہو کر گھر چھوڑ کر پھینک دی گئی تھی مگر اب وہ کوئی دے رہی تھی پری کو اس کی خواہش پر اس کی مائے کے ہاں ڈرائیور چھوڑ آیا تھا۔

گھر میں عادلہ عازرہ موجود تھیں عازرہ اپنے رشتے سے بہت خوش تھی اور عادلہ بھی بہن کی خوشی میں خوش تھی پھر وہ کون تھی جو رات اس گھر سے گئی اور بھرپور پلاننگ سے گئی کیونکہ جانے سے قبل اس نے تمام لائٹس آف کر دی تھیں اور یہ کہ کوئی ایک باگ کو پہلے ہی سیٹ کر رکھا تھا۔

”وہ جو کوئی بھی تھی جہنم میں جائے! میں نے پری کے ساتھ بہت زیادہ زیادتی کر ڈالی ہے وہ پچھتی رہی اپنی ذمہ داریوں سے، میں اس وقت اتنا جذباتی دردیوانہ رہا تھا اس وقت میرے پاس ریوالتورہ دوتا تو میں شاید اس کو شوٹ کر دیتا۔“ اس نے سر ہاتھوں میں تھام لیا۔



آسمان ستاروں سے بھرا چمک رہا تھا۔ چاند بھی خوب روشن، مگر مل تھا دھیرے دھیرے چلتی ہوا سے نیم کے پتے شاخوں سے گرتے تھے۔ فطیمہ اور فیصل ٹمہ میں شادی میں مدعو تھے۔ شریا زیادہ ٹمہ کے لیے روٹیاں بنا رہی تھی وہ روٹیاں پریشانی آسمان کو تک رہی تھی۔ دل میں سب پناہ خواہشوں کا جھوم تھا وہ خوشیوں کا جہاں رکھتی تھی۔

خوشیوں کا وہ پناہ گاہ ہے جس کی جہاں انہیں نہیں ہوتی ہے۔

زندگی ختم ہو جاتی ہے خواہشیں تم نہیں ہوتی ہیں۔

نوب سے خوب ترقی تلاش میں انسان خاک نشین ہو جاتا ہے۔

تہمت پر اس نے مڑ کر دیکھا تھا مگر آ رہا تھا اس کے چہرے پر سب زاری پھیل گئی وہ نہ بناتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔

”سمان اللہ! آج دو چاند ایک ساتھ روشن ہیں یہ آسمان پر دوسرا زمین پر۔“ کلام کا لہجہ محبت سے پور تھا۔ وہ اس کے سامنے دوسری چارپائی پر بیٹھتے ہوئے گویا ہوا۔

”سیاہ قلم! بکواس شاعری مت کیا کرو۔“ اس نے تڑخ کر کہا۔

”میں شاعری نہیں کر رہا، سچ کہہ رہا ہوں ایمان ہے۔“

وہ رخ نے کوئی جواب نہیں دیا، سب پروائی سے بیٹھی پاؤں بلاتی رہی۔ اس کا دوپٹا گود میں پڑا ہوا تھا جس کو دیکھ کر مائے نے کہا۔

”رخ! اپنی اور دھنی کو درست کرو اور سر پر پھیلاؤ۔“

تاریخ

”وہ باتم مجھ کو سمجھ دے رہے تھے۔“

اپنے آگے دیکھ کر سب نے ہنس ماری تھی۔ اس کی بات اس کو پتہ لگانی بچے کے شہ متدہ ہونے کے ڈھائی سے غرائی تھی۔

”نہیں نہیں میری بیٹی جرات! میں تو کہہ رہا ہوں، مڑھنی درست کر لو تم جب اور مڑھنی سر پر اور حتی: دو تو بہت اچھی لگتی ہو۔“

”ہو نہ! تمہیں معلوم ہے جہاں میں پڑھنے جاتی ہوں وہاں تو مڑھیاں اور مڑھنی اور مڑھ رہی نہیں آتیں۔“ وہ پنا درست کرتے ہوئے اس نے فریاد انداز میں کہا تھا۔ ظالم نے پیچھے ہٹ کر لہجے میں کہا۔

”چھوڑو، یہ کیا تمہاری طرح خوب صورت نہیں ہوں گی۔“ وہ غلاموں میں دیکھ کر بول رہا تھا مگر اس نے نخوت سے سر جھٹک دیا۔



خاصی دیر تک وہ ٹھنڈے پانی سے منہ دھوتی رہی تھی۔

”نامہ حلوہ تاج کا من میرے لیے کیوں آئی آزمائش کے لیے ہے؟ میں تاؤ سے بھر پائی تھی۔ پتہ ٹاپک رہے در اندر وہاں سے وہاں پہنچا کر بیرون گزرا۔ اس کے سامنے ایک چوٹی پر وہاں کی پھر میں شاپٹ سینڈ پانی بھی لیتی تھی۔ یہ غلاموں یا غلامیوں کا شہید ہونے کی تلاش رہا تھا۔ مگر کیوں؟“ وہ منہ دھوتے ہوئے کہتی تھی۔

”وہ بتاتی ہے کہ اس نے غلاموں کو سزا دل کر رہا تھا وہ کیا کہہ رہا تھا؟“ اس نے فریاد کی بات کرتے ہوئے کہا۔ اس نے میں وہی منہ دھوتے ہوئے اس کے قابل نہیں رہی تھی۔

اس نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ کر زوہب سے کہا۔ ”چہرہ دیکھنی نہ دیا۔ اسے اس نشان سے جس رنگ میں دیکھ دیا۔“

”مگر بھی نہیں باتیں کرتی ہیں۔“ غلامہ مبینہ انداز بہت ہی اشیاء پر دو بھر رہی تھی اس شخص کے ساتھ باہر جوتی پہننے والی ہوں جس دانہ انسانیات کی توہین ہے۔“ وہ بدولی سے سوچتی ہوئی واش روم سے نکل کر برداری بھر رہے تھے۔ اس کی طرف جارہی تھی جب اچانک ہی ایک جانب سے نکل کر طفل اس کے سامنے روک کر کھڑا ہو گیا۔

”پری اہلیز میری بات سنو۔“ اس کے لہجے کی گھن گرج ”نفرت و حقارت التجا یہ لہجے میں بدل گئی تھی۔

پری نے اس کو لٹے بھر حیرت سے دیکھ کر پھر طنز یہ بویا ہوئی۔

”آپ کی یہ داشت تھی کمزور ہے طفلان! پتہ دیر لگی ہی آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ میری آواز سن بھی پسند نہیں کرتے۔“

”سوری۔۔۔۔۔ ویری سوری۔۔۔۔۔ میں بہت۔۔۔۔۔“ وہ اس کی بات قطع کر کے اسی کے انداز میں گویا ہوئی تھی۔

”مجھے آپ کے سوری کی ضرورت نہیں ہے اور آپ میری بات یاد رکھیے گا آپ کو میری آواز پسند نہیں ہے اور مجھے آپ پسند نہیں ہیں۔“

”جانتا ہوں تم مجھ کو پسند نہیں کرتیں میرے لیے یہ فی اظہار نہیں ہے لیکن اس وقت بات پسندنا پسند کی نہیں رہی ہے ایک مسئلہ دیکھا ہے میں چاہتا ہوں ہم دونوں مل کر اسے حل کریں۔ ابھی تم دادو کے پاس ہو کر آ جاؤ ان یہ مدت بتانا کہ ہمارے درمیان کچھ ٹھنڈائی ہوئی ہے۔“

اس وقت وہ بہت اچھا اچھا بچہ حد پریشان تھا اگر ان کے درمیان وہ پتہ نہ نہ ہوتا جو پتہ دیر قبل ہوا تھا تو وہ اس کی تمام حرکتیں بھلا کر اس کی بات سنی اور شاید وہ بھی پرتی مگر۔ اس وقت اس کے دس میں طفل اس کے لیے اتنی بدورت تھی کہ وہ حقیقتاً اس کی جانب دیکھ کر نہیں رہی تھی۔

”جتنی مجھے دادی سے محبت ہے اتنی محبت تو بولی ان سے سنی نہیں سکتا اور وہ سب کچھ غصے میں دیکھ کر کہتا کر اس صدمے سے دوچار نہیں کرنا چاہتی۔“ وہ بھی زبانی تیر اندازی میں طفل اس کے کم نہ تھی۔

”تین ہفت کے مود میں نہیں بول جاؤ گی آج میں انتظار کر رہا ہوں اپنے کمرے میں۔“ اس کے لہجے میں ایدہ تھی۔

پری کے شفاف چہرے پر بے حد مریہ و زاری کے دھن ہوئی۔ ”نہیں نہایں زور ہی تمہیں۔“ تو اس نے کبھی نہ تھی۔ وہ سب شہ منہ دھوتھا۔

”قیامت تک انتظار کرتے رہیں میں نہیں آؤں گی۔“ وہ کہہ کر چلی گئی۔



”خیریت تو ہے شئی! تم اس وقت آئی ہو ابھی سوئے تھیں۔“ اس نے کہا۔ ”شربت بہاں نے جو انہیں رات سے وقت میں حالت میں طے آتے دیکھا تو بے حد توجہ دینی نہیں۔“ ”صنوبر بہاں بہاں ہیں۔“ بیان کے اندر وہ نے تہہ ہر۔ ”وہ ان کے قریب بیٹھ کر پریشانی سے پوچھ رہی تھیں۔

”نامہ مت لیں میرے سامنے اس دہائے شمس کا۔“ وہ آواز آئی ہوں میں اس و امرا اس کے منہ کو بھی۔ وہ حتی انداز میں کہہ رہی تھیں۔ ”مشت جہاں بول رہے نہیں۔“

”نہ یہ ہے آخر! پتہ بتاؤ بھی تو! پتہ پتہ آسمان نہیں ہوتا عورت کے لیے جو تم کہہ رہی ہو۔ پتہ پتہ آئی۔“ وہ ان کے قریب بیٹھتے ہوئے رہا نیت سے سمجھاتے ہیں۔

”مگر! چھوڑو! نصف عورت کے لیے ہی کیوں مشکل ہوتا ہے۔ مرنے کے لیے تو سب آسمان ہوتا ہے۔ مرنے توڑنا۔“ وہ توڑنا اعتبار توڑنا۔ ”رشتہ توڑنا۔“ سب مرد کے لیے ہی کیوں آسان ہے؟“ ”شئی! اس وقت بری طرح ٹھہری ہوئی تھیں۔

”صنوبر بہاں نے مجھے ایسی کوئی امید نہیں ہے کہ وہ کوئی یہ کام کرے گا جس سے میرے اعتبار و اتنا کو کوئی میں پہنچے۔“

”مما! عورت خود ماں ہو یا بیوی اس کی سب سے بڑی کمزوری یہی ہے کہ وہ مرد کو قہل اعتبار سمجھتی ہے اس پر دھما کرتی ہے اور مرد ہماری اسی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ہمارے جذبول سے کھیلے ہیں ہماری خوشیوں کو قہل کرتے ہیں ہماری آرزوؤں کو پامال کرتے ہیں یہی ان کی فطرت ہے یہی ان کی اصلیت ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ ٹھیک ہے میری جان! صبح بات کریں گے۔ ابھی تم آرام کرو بہت پریشان لگ رہی ہو تو

میں تمہیں کمرے تک چھوڑاؤں۔" وہ پیار سے ان کا ہاتھ پکڑ کر بیڈروم میں ان کے بال سہلائے لگیں۔
 "مما! مجھے خوشیوں کا سونہا نہیں آتی؟ جب بھی میں ہنستی ہوں تو رونا پڑتا ہے مجھے۔" آنسوؤں کی دھاری سے
 ان کے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔

"تم بچہ محبت سوچو بس سوچاؤ" میں ہوں نا تمہارے پاس تمہاری ماں!
 "آپ ہر دھڑکی دھوپ میں میرے لیے سایہ بن جاتی ہیں ممما!"
 "ماں ہی لیے ہوتی ہے کہ اپنے بچوں کے دکھوں کی دھوپ خود پر لے کر اپنے وجود کی چھاؤں ان کو دے
 دے۔" وہ ان کے آنسو صاف کر کے ممتا بھرے لہجے میں کہتی تھیں۔
 "لیکن میں کیسی ماں ہوں؟ اپنی بیٹی کی خاطر لوگوں کے سپرد کر آئی۔ اپنے جسٹ کے دھوکے خیز اس کو دے کر
 اس کے جسٹ کے کٹھن بھی لے آئی؟ میں ماں بننے کی حق دار نہیں ہوں۔" وہ زار و قطار رونے
 لگیں عشرت جہاں کو ان کو سنبھالنے میں بہت دقت ہو رہی تھی مگر ان کے سونے کے بعد وہ کمرے میں آ گئیں تو
 فون بج رہا تھا۔

"ہیلو بابا! وہ بیوی کی آئی ہے اور کہاں جا سکتی تھی؟" دوسری طرف صفدر جہاں تھے۔ "نہیں نہیں
 ابھی آپ مست آؤ جب تک اس کا مونا ٹھیک نہیں ہو جاتا اس کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ ورنہ وہ خود کو نقصان پہنچا
 لے گی۔" وہ کسی لہری سوچ میں گم نہیں ہو سکتی تھیں۔



آصف پاپوہ کے بیٹے معید سے اس کی قربتی دوتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ جید کو پانے میں اس کی مدد کرے گا
 اور لہجہ کی بات ان دونوں کے مٹاؤہ کسی تیرے کی سماعتوں تک پہنچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اب وہ دونوں سر حل پر بیٹھے
 گفتگو کر رہے تھے۔ منفرات نے اس سے پوچھ بھی نہیں چھپایا تھا ایک بات ایک ایک لفظ بہ سنایا تھا جس نے
 معید کو بھی پریشان کر رکھا تھا۔

"یہ تو ایک پراسرار سی بات ہے گھڑت رات کی تاریکی میں ایک لڑکی ہنسی سے پوری پلاننگ کے ساتھ اور
 نائب ہو جاتی ہے۔ نہ لڑکی کا پتا ہے اور نہ یہ معلوم کہ وہ کس کے ساتھ ٹی ہے جب کہ لڑکیوں کی لڑکیاں بھی
 موجود ہیں۔"

"اور گھر میں موجود قیمتی سامان اور جیواری بھی چوری نہیں ہوئی ہے۔ پہلے میں پری کو سمجھا تھا مگر وہ مسئلہ آج حل
 ہو گیا پھر کون تھی وہ؟" گھر کی ملازمہ بھی نہیں۔ "منفرات نے آتی جاتی لہروں پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔
 "مجھے دکھ ہے تم نے پری کو غلط سمجھا تمہارا رویہ اس کے ساتھ ہمیشہ ہی خراب رہا ہے مگر آج تو تم نے حد ہی
 کر دی۔ جانتے ہو صبا ست آئی اس کو گھر میں رکھنا نہیں چاہتی ہیں ناموں جان اس کو کتنی آنٹی کے پاس اس لیے
 رہنے کی اجازت نہیں دیتے کہ وہاں اس کا سوتیلا باپ ہے جب یہاں آنٹی ایک عورت ہو کر اس کو برداشت کرنے کو
 تیار نہیں ہیں تو۔" تو پھر سوچ لو سوتیلا باپ باپ نہیں ہوتا صرف مرد ہوتا ہے۔ "معید نے گہری سانس لے کر آہستگی
 سے کہا۔ معید کا تجربہ سو فیصد درست تھا۔ مرد کی فطرت کیا ہے وہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ بھی ایک مرد تھا۔
 "اچھا بس ختم کرو اب اس سب کو۔" وہ اپنے طربیہ انداز میں کھڑا ہو گیا۔

"تمہیں بھی اچھا نہیں لگا نا مجھے بھی نہیں لگتا ہے۔ جب آنٹی کی آنکھوں میں اس کے لیے نفرت دیکھتا ہوں کسی
 کی نہیں معلوم ہے پری سے میری بہت اچھی دوستی ہے میں اس کو اس کو فون کرتا ہوں، تحائف دیتا ہوں۔ مگر بہت
 پراسرار۔"

"چپ کر کیوں؟ کیا آپھی دوستی نہیں ہے انھیں نہیں ہے۔"
 "صبا ست آنٹی کو بھٹک بھی پڑتی تو میرا پتہ نہیں ہوگا شامت بے چاری پری کی آجائے گی جو میں کسی صورت
 ان کا پتا۔"

"تم اس سے محبت کرتے ہو یا وہ تم سے محبت کرتی ہے؟" نا معلوم اس وقت کیا تھا اس کی آنکھوں میں معید
 نے اس کو دیکھتا رہا تھا کچھ تو قنف کے بعد بننے لگا۔
 "ضروری نہیں وہ کم از کم ایک دوسرے سے محبت کریں تو وہ محبت لیتی مجنوں والی محبت ہی تو محبت کے اور بھی
 ہیں اس پائیزہ روپ ہیں۔"

"میرا دل کہتا ہے تمہاری یہ مسئلہ لیلی" یہی اس پر اسرار مسئلہ کو حل کروائیں گی مگر مجھے معلوم ہے وہ میرا ساتھ
 ہی بھی نہیں دے گی۔" آدھا کھنڈہ وہ سر ہوا کر کوئی پلاننگ کرنے کے معید کا رے لے کر چلا گیا تو طغزل اس ہٹ کی
 طرف آ کر جو معید نے حال میں خرید تھا۔

ہار فرائے بھرتی آ رہی تھی ساتھ ساتھ چتا سمندر خوب صورت لک رہا تھا۔ معید نے ایک خوب صورت ہٹ
 سے قریب کار روکی تو پری نے کہا وہ اسے یہاں کیوں لایا ہے؟

"آؤ نا! موسم بہت اچھا ہے پھر ایک خاص بات کرنی ہے۔" وہ کار سے نکل کر ہٹ کی طرف بڑھ رہے تھے جو
 آہستہ آہستہ۔

"تمہیں معلوم ہے ممما کو معلوم ہو گیا تو۔"

"ناؤ سے کہہ کر آیا ہوں وہ معلوم ہونے نہیں دیں گی۔" اس نے ہٹ میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔
 "ہٹ تو بہت خوب صورت ہے مگر یہ تو بتاؤ بات کیا ہے آخر؟" وہ دونوں اندر ایک کوریڈور سے گزر کر بڑے
 روم میں پہنچے تھے۔ وہ لیونگ روم تھا جو بہت دل کش انداز میں ڈیکوریٹ کیا گیا تھا۔ وہ ستائشی نظروں سے
 اس کی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی کمرے میں بھاری پردوں کے باعث نیم تاریکی تھی۔

"یہاں اتنے بھاری پردے ڈالنے کی ضرورت ہی کیا تھی معید!" گیسٹ بندہ ہونے کی آواز پر اس نے مڑ کر
 کہا۔ "معید غائب تھا۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔"

"معید نے یہ کیا حرکت کی؟" ابھی وہ گیسٹ تک جانا ہی چاہ رہی تھی کہ چٹ کی آواز سے پورا کمر روشن ہو گیا اور
 منہ اطمینان سے کمرے کے شخص کو دیکھ کر وہ سہم کر بولی۔

"آپ! یہاں؟"

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)



ایک اعنایت

سلٹی فہیم گل

جس شہر میں جگہ جگہ پہ کئی سائباں رہے
دکھ ہے وہاں رہے بھی تو ہم بے اماں رہے

ایسے انا پرست تھے کہ مل نہیں سکے
میں دھرتی ہو کے رہ گیا وہ آسمان رہے

”یا اللہ! میں کیا کروں؟“ اس نے انتہائی بے بسی سے ہاتھ اٹھا کر آسمان کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔
”تم کچھ مت کر دسوئے اس کے کہ چنوب میں پانی لو اور اس میں ذوب مرو۔“ جتنی بے بسی سے اس نے ہاتھ اٹھائے تھے اتنے ہی سکون سے شفق نے اسے مشورہ دیا تھا۔ جواب اس نے کھور کر اس کی جانب دیکھا۔
”براہ مہربانی اپنے یہ نادر و نایاب مشورے مجھے مت دیا کرو احسان ہوگا تمہارا مجھ پر۔“ کسی عقل کے اندھے کو ڈھونڈ لو جو تمہارے ان نادر و نایاب مشوروں کو کسی کام میں لاسکے۔ میرے پاس تمہارے ان فضول مشوروں کو سننے کا وقت نہیں ہے۔“
”آ..... ہا ہا ہا! پر ائم منسٹر لگی ہو کہیں کی! وقت نہیں ہے میرے پاس۔ چلو اب اٹھو یہاں بیٹھ کر تماشا بنانا ہے کیا؟“ اس کی نقل اتارتے ہوئے اس کا بازو پکڑ کر زور سے کہینچا۔

ان دنوں وہ نوکری کی تلاش میں سرگرداں تھی۔ اتنی ڈھیر ساری ڈگریاں اکٹھی کرنے کے باوجود خوار ہو رہی تھی لیکن ابھی تک کہیں سے کوئی حوصلہ افزا جواب نہیں ملا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کی اہلیت

دیکھتے ہوئے لوگ اس کا منٹوں میں تقرر کر لیں گے مگر یہ اس کی خام خیالی ہی تھی۔ اب تو وہ کھسنے لگی تھی۔ تبھی اس کی بچپن کی دوست شفق نے اسے اپنے اسکول چلنے کی پیشکش کی اور وہ کچھ سوچ کر اس کے ساتھ چلی آئی تھی مگر یہاں جو کچھ ہوا تھا وہ اسے ششدر کرنے کے لیے کافی تھا۔ شفق نے اسے یقین دلایا تھا کہ یہاں اسے نوکری ضرور مل جائے گی اور ممکن تھا کہ اس کی جاب ہو بھی جاتی مگر وہ خود غلطی کر بیٹھی اور غلطی بھی کوئی چھوٹی موٹی نہیں بہت بڑی۔ جب وہ شفق کے اسکول میں داخل ہوئی تو اسکول کی حالت دیکھ کر اس نے ناک بڑوں چڑھائی تھی اور گویا ہوئی۔

”یہ..... یہ اسکول ہے؟ اف خدا! نام دیکھو اور حالت دیکھو اس اسکول کی... لگتا ہے کسی دور افتادہ بستی میں کوئی الگ تھلگ سا کھنڈر ہے جس میں نیا نیا تعلیمی نظام شروع کیا جا رہا ہو جہاں صرف نام نہاد علم ہے۔ اساتذہ اور طلبہ کا کچھ اتا پتا نہیں..... کیا ہے یہ سب شفق! تم یہاں پڑھاتی ہو؟ اور تمہارے خیال میں میں یہاں جاب کروں گی؟ تم نے یہ سوچ بھی

کیسے لیا۔
 "نہیں کرو مابین بہت ہو گیا۔ خبردار اب اگر مزید
 چہ بولیں تو..." شفق نے تیزی سے اس کی بات
 کاٹتے ہوئے چہ چھٹلاتے ہوئے کہا۔
 "کیوں نہ بولوں میں...؟ اور ایک بات تو بتاؤ
 تم اتنی بھاری بھر کم خواہ تمہیں وہ جو رہا کتنی دیتے
 تین یا؟" اس کی بات پر شفق کڑے تیور سے اس کی
 جانب پلٹی تھی۔
 "ابھی پانچ خ موشی سے چو اُڑی ہے سن لیا تو
 تمہیں تو جاب سے نہ ملے تھے وہ کتنی فرصت میں
 نہ ورفارم کر دیں گے۔ درجہ حالت ان لوگوں چل
 رہے ہیں ان میں فراغت نہ ملے گی پرستی ہے۔ یہ
 اسکا اچھا بے اسف حق بن کر رہا ہے غلطی اتنی اور تیز
 دار ہیں اور سب سے بڑھ کر خواہ بہت تیزی سے رہی
 ہے۔ جس سے ہاتھ دھونے کافی الحال میرا کوئی ارادہ
 نہیں ہے۔"
 "ہاں! میں تو گویا کسی ریاست کی شہزادی ہوں تا
 اور تمہیں یہ اسکول اچھا لگ رہا ہے؟ واہ! کیا حسن نظر
 ہے۔ انتہائی صنادی پسند مس شفق کمال صاحب کو یہ
 "نند" اچھی لگ رہی ہے۔ حیرت آمیز لہجے کی
 تیزی تمہارے اس اچھے اسکول کی تمہارے پر پیکل کی
 اور "اس" اس درجہ صاف کوئی پر شفق نے کسی
 قدر بے کسی سے اس کی جانب دیکھا تھا بھی اس کی
 نگاہ پیچھے کھڑی شخصیت پر پڑی تھی۔ اس کی اوپر کی
 ساس اوپر اور نیچے کی پیٹ رہی تھی۔ آنکھیں پوری
 کی پوری چلنے لگی تھیں۔
 "نہیں کیا ہوا؟ کوئی بھوت نظر آیا ہے یا؟"
 اس کی بھیانک شکل پر اس نے طنزاً مسکراتے ہوئے
 استفسار کیا تھا۔
 "خدا تمہیں پوچھے مابین! یہ تو کسی "بھوت" سے
 ڈر رہا۔ وہ ان کی بات پر استہزاء سے مسکراتی تھی۔

بھی بڑھ کر ہیں یا اللہ! اب میری نوکری تو ہی بی سکتا
 ہے ورنہ اس نے تو کوئی سر نہیں چھوڑی۔" اس کی
 بات کا دل ہی دل میں جواب دیتے ہوئے اس نے
 رب کو پکارا تھا۔ شفق کو مسلسل خاموش دیکھ کر مابین
 نے کسی قدر حیرانی سے پیچھے مڑ کر دیکھا تھا۔ اس کی
 نظروں کے عین سامنے دراز قامت شخصیت کھڑی
 تھی۔ خاصے بارعب اور بد ہار قسم کے لکڑی
 تھے۔ پیچھے کچھن کے لگ بھگ ٹرنز میں اسید رہنا
 جبکہ ماتھے پر سن آلود تھا۔ آنکھیں لال سرخی سے
 سے یا پھر تھیں ہی لہجے۔ مابین کو ان کے تاثرات
 خاصی حیرت میں مبتلا کر رہے تھے۔ کافی دیر وہ ان
 کے بولنے کا انتظار کرتی رہی مگر وہ کسی جانب ہلکا
 خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کوئی پھر نہ بولا۔ خواستہ ہی
 پہل کرنا پڑی۔
 "جی فرمائیے! آج صبحے شانستہ انداز میں منتظر
 کیا تھا۔
 "میرا نام حشمت ہے۔ میں اس اسکول کا
 پرنسپل ہوں اور اس کتابانی بھی ہوں۔" انتہائی سرد انداز
 میں انہوں نے اپنا تعارف کرایا تھا۔
 "اور آپ ہیں اس اسکول کے بانی؟" اس
 کے لہجے میں طنز سمیت یا تھا مگر ان کی عمر کا سا نہ لگتے
 ہوئے مینہ کا داروہو نہیں کیا تھا۔
 "جی بالکل اس اسکول کا بانی ہوں میں۔۔۔۔۔ یہ جو
 اسکول کے نام پر جو دروں کا بارہ دیکھائی دیتا ہے اور
 بے نام پر جنس دھاوا اسی کھنڈر نما اسکول کا بانی اور
 پرنسپل ہوں میں اور اس اسکول کے اساتذہ کو ہم
 بھاری بھرم خواہیں دیتے ہیں جو فوروں وہاں کے
 لیے نہیں بلکہ بچوں کو بہترین تعلیم دینے کے لیے۔"
 "یہاں نیچے پڑھتے ہیں سر! کھائی تو کوئی نہیں
 دے رہا۔" وہ ان کی بات پر استہزاء سے مسکراتی تھی۔

"کوئی کھائی اس لیے نہیں دے رہا کیونکہ یہ
 مال نہیں ہے بلکہ یہاں کالج کے لیے مہارت تعلیم
 دینا ہے اور ساتھ ہی بائبلز۔" میرے خیال میں
 اس شخص نے ابھی آپ کو اسکول اُکھایا نہیں
 ہے۔" اس کی بات پر شفق کا دل چاہتا تھا اپنا سر پینٹ
 ہے۔ اس مابین کو م لازم یہ تو بتانا چاہیے تھا کہ یہ
 میں نہیں ہے وہ شہ مندر کی سے رہو کا بی بی۔
 کوئی بات میں آئیے میں آپ کو اسکول اُکھاتا
 ہوں۔" ان کی اس درجہ سناحت پر وہ چہ پل ونا
 کی اور دوسرے ہی پل سر جھکتے ہوئے ان کے
 پیٹ پر۔
 "میں نے پھر غلط تو نہیں کہا جو دیکھا اسی پر
 نہیں دیکھ رہی ہیں۔" دل ہی دل میں اس نے ویو
 دھونکی دی تھی۔
 "آئیے! مس مابین دیکھیے یہ ہے ہمارا اسکول۔"
 وہ ہال آئی گیت کے سامنے رک کر وہ نہیں پیچھے
 لے کر اشارہ کرتے ہوئے آگے بڑھے تو گیت
 نے اندر داخل ہوتے ہی اس کے منہ سے بے ساختہ
 "کیا کھات برآمد ہونے کو بے تاب ہوئے تھے۔
 مائے بی مرثی غنوں کی روشنی ہوئی تھی جو انتہائی
 خوب و شفاف اور خوب صورت تاثر دے رہی تھی۔
 ان نے بھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اینٹوں کی بنی روش
 کی خوب صورت دکھائی دے سکتی ہے۔ پارے
 کی ان میں سبزہ نئی سبز و تھا۔ اطراف میں پتھروں
 کے ملے اور قطرہ در قطرہ درخت بہت بھسے لگ رہے
 تھے۔ اسکول کی عمارت انتہائی شاندار تھی وہ باہر سے
 دیکھ کر مبہوت رہ گئی تھی۔
 پورے اسکول کا ایک ایک کمر انہوں نے اس
 پر تھا۔ ساتھ ساتھ طلبہ کی تعداد بتانا نہیں بھولے
 گئے۔ گویا ٹھنڈے ٹھنڈے انداز میں اس کی خوب عزت

افزائی کی تھی۔ جتنا طنز ان کے لہجے میں تھا اس سے
 بڑھ کر مٹا اس لفظوں میں بھی اگر اس کی جگہ کوئی اور ہوتا
 تو شاید ان کے طنز کو اتنی جلدی سمجھ نہ پاتا۔ لیکن یہ سچ
 تھا کہ وہ شہ مندرہ کی بھر کر ہوئی تھی۔ وہ غلط تھی۔ مگر
 اس سے پہلے کہ وہ ان سے سوری کہتی وہ شفق کی
 جانب متوجہ ہوئے تھے۔
 "آپ اپنی کلاس میں جائیے مس شفق! اور آپ
 مس مابین۔ اب آپ کی اس اسکول کے بارے
 میں کیا رائے ہے؟" ان کے اجازت دیتے ہی شفق
 شہر کا کھمبہ ادا کرتے ہوئے اپنی کلاس کی جانب بڑھ
 گئی تھی ورنہ بھی تک وہ خود کو یہاں سے فارغ ہی
 تصور کر رہی تھی۔
 "آئی ایم سوری سر میں غلط تھی۔ جب شفق اور
 میں گیت سے اندر داخل ہو میں تو مجھے لگا وہی اسکول
 ہے اس لیے میں اتنا چہ بول گئی۔" وہ لگ بھگ ایک
 دو بار شفق نے ٹوکا بھی تھا۔ کمر میں اپنی ہی مٹن
 میں بولتی چلی گئی۔ آئی ایم سوری سر! "شفق کا دفاع
 کرتے ہوئے وہ معذرت خواہانہ لہجے میں گویا ہوئی۔
 "کوئی بات نہیں۔ اب آپ جاسکتی ہیں۔" انتہائی
 شجیدگی سے کہہ کر وہ اپنے آس کی جانب بڑھ گئے
 جبکہ وہ ہکا بکا سی کھڑکی روٹی۔ ان کے اس انداز کی
 اسے بالکل بھی امید نہ تھی۔ راہداری میں تنہا کھڑی وہ
 خود کو خاصا بے وقوف سا تصور کر رہی تھی۔ بھی اس کے
 موبائل پر مین پیپ ہوئی تھی۔ شفق کا مین تھا۔
 میرے کمرے میں آ جاؤ یا میں ہاتھ پر کمر انمبر
 دو۔" اس کا مین پڑھتے ہی اس نے گہری سانس
 خارج کی اور اس کے کمرے کی جانب چل دی۔
 "تم سنا بولتی ہو مابین! اور بولتی بھی نہ سوچے سمجھے
 ہو۔ دیکھ لیا تا بنا سوچے سمجھے بولنے کا نتیجہ؟ کچھ بھی
 اول فوس بننے سے قبل مجھ سے پوچھو تو لیتیں کہ اسکول

کون سا یہ ترمیم کی مثال بھی لکھیں چرے لگی ہوئی تھی، لکے نہیں جاتا تو چاہیے تھا، لیکن تمہاری بھی تو عادت ہے نا کی لائق تو نہیں اپنی ہی رالگ اپنی رہتی ہو اب بچہ تو۔۔۔

”پلیز شفٹ اپ کر وتم۔ تمہارے پرنسپل صاحب نے پیام سنائی ہیں کہ اب تم بھی شروع ہوئی ہو؟ ویسے شک امید بھی نہیں تھی کہ یہاں مجھے جا پست کی۔“

”تمہیں جاب ضرور مل جاتی، مجھے پوری امید تھی، تم نے خود اپنے پیروں پر کھار کی ماری ہے کی اور کا کیا تصور۔۔۔“

”اچھا نا! اب بس بھی کرو صبح سے ہی میرا دن خراب چل رہا ہے۔“ اب جو بچا ہے اسے تو خراب مت کرو۔ مجھے کوئی اچھا سا مشورہ ہی دے دو۔

”مشورہ دیا تو ہے۔ پیو پھر پانی میں ڈوب مرو۔“ سنجیدہ سے کہہ کر شفقت اپنا سامان میٹھی کی بجائے پتھر ہونے کی کھنٹی بنا کر لے گئی۔ مابین بس اسے دیکھ کر رہ کر بولی پھٹیں۔

کیونکہ سلی اسی کی تھی شفقت کا کہنا کچھ غلط بھی نہ تھا۔



ماہی ماہین کہیں تھکی ہوئی ہوا جلدی باہر آؤ تمہارے لیے ایک اچھی خبر ہے۔ اور خاصی ناقابل یقین بھی۔ انوہ ماہین اب نکل بھی آؤ۔ اندر جا کر سو گئی ہو یا۔

”آفت آئی ہے۔ صبر نہیں ہوتا۔ اونہو مہتمم نے صاحبہ شریف لائی ہیں۔ میں بھی بھلا یہ سن کر آفت کا زور کیونکر ہوا۔“ پتھر سے لکے ہوئے ہونے سے چہرہ صاف کرنے کی تھی۔

”ہونہ! یہ خاصی پرانی بات ہے۔“ وہ استہزائیہ مسکراتی تھی۔

”میں سنجیدہ ہوں ماما! اس کی بات پر کسی قدر برامانتے ہوئے شفقت نے سنجیدگی سے کہا۔

”تو میں کب مذاق کر رہی ہوں؟“ اس نے کندھے اچکائے۔ شفقت نے غور کر دیکھا تھا مگر بولی پھٹیں، احتیاجاً چپ ہوئی تھی۔

”اوکے آئی ایم سوری اچھا بتا، کیا خوشخبری دینی ہو میرے لیے۔۔۔“ ابھی بھی طنز اس کے لبے میں نمایاں تھا مگر وہ اظہار انداز کر گئی۔

”تمہیں اتنا شکر کرنے ہوا ہے۔“

”میری صرحت سے پوچھی تھی۔“

”کیوں۔۔۔؟“ جتنے جوش و خروش ہاتھ میں شفقت کی جانب سے ہوا تھا اتنے ہی سہاگن سے مابین نے استفسار کیا تھا۔

”اس کیوں؟“ سے تمہارا کیا۔۔۔ ہے ماما، کسی نہ ہر ہے جاب ہے، لے لے انہوں نے لکھیں ہوا ہے۔ انہوں نے انداز سے شفقت کے جوش و خروش کو نظر انداز کر دیا تھی مگر اس کی قدر برامانتے ہوئے وہ گویا ہوئی تھی۔

”یار اس میں برامانتے کوئی کیا بات ہے؟“ میرا

حیرت سے جانتے اب دیکھو نا، میں نے ان سے اس قدر اعتبار اٹھایا تھا جو وہ کابڑا کشیدہ فکریں کر رہے تھے کیا۔ اور خود انہیں بھی نہیں پتا تھا یہ میں نے مجھے جاب کے لیے با نا خاص حیرت انگیز بدلہ دیا تھا بات ہے۔ چارپائی پر بیٹھتے ہوئے اس نے کہا۔

”کوئی حیرت اور فرائی بات نہیں ہے ہمارے پرنسپل صاحب ایسے ہی ہیں۔ چہرے پر ہمہ وقت رعب طاری رہتا ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ بہت سخت گیر قسم کی شخصیت ہیں۔ اب کیا فیصلہ کر لیں ان سے کچھ بعید نہیں ہے۔ دیکھا نہیں تھا ان

میں تو کبھی تھی میری جاب گئی مگر انہوں نے ایک لفظ بھی نہیں کہا، تمہیں بھی پتہ نہیں کہیں مجھے بر بھروسہ کرو۔“

”لیکن شفقت! اب میرا دل نہیں مان رہا۔“ وہ اس یقین دلانے والے انداز پر بھی کچھ خاص مطمئن نہ ہوئی تھی۔

”اسی کی تھی تمہارے دل کی۔۔۔ اسکول اچھا ہے نا، اچھی ہے اسٹاف تعاون کرنے والا ہے اور ب کے لیے یہی تو تمہاری ذمہ داری تھی۔

”وہ تو ہے شفقت لیکن تم جانتی ہو مجھے ملنے وطنہ پسند نہیں ہیں۔ غلط بات مجھ سے بالکل نہیں ہوتی۔ اگر انہوں نے مجھے سابقہ باتوں پر مزید دیا تو پھر میں چپ نہیں رہوں گی جانتی تو ہونا تھا۔“ شفقت نے پیٹ کر رہ گئی۔

”ف! کیا احمق لڑکی ہے یار وہ بزرگ ہیں۔ لازمی پر ہیز گار تمام ٹیچرز کو بیٹیوں کی طرح سمجھتے ہیں۔ تمہارے خیال میں وہ تمہیں جھگڑالو عورتوں کی طرح لعن طعن کریں گے؟ حد ہو گئی یار! یہ الگ بات ہے کہ ان میں رعب و دبدبہ ہے، شکل سے خاصے نہ والے لگتے ہیں مگر حقیقت میں وہ بڑے نرم خو ہیں اور سب سے بڑھ کر صاف گو انسان بھی جو بھی ان کو منہ پر ہی کہہ دیتے ہیں اور گزرتی ہوئی باتوں کو ہاتھ نہیں دہراتے، مجھے تو لگتا ہے تمہاری صاف دلی ہی انہیں پسند آئی ہے۔“ اب کے شفقت نے اپنی وضاحت سے بات کی تھی تا کہ اسے جو جھک رہی تھی مگر۔۔۔!

”تمہیں یقین ہے شفقت! وہ ایسا کچھ نہیں کریں گے، یاد آتی مجھے جانا چاہیے؟“ وہ ابھی بھی شششش کر رہی تھی۔

”صد فی صد یقین ہے مابین! تم ایک بار چل کر

تو دیکھو۔

”اوکے! میں کل تہارے ساتھ چلاؤں گی۔“ اس کی یقین دہانی پر مابین رضائے چند پل سوچا اور پھر فیصلہ کرتے ہوئے گویا ہوئی۔
”مذاہب ہوئی مابات۔“ شفیق نے کہا۔

”ویسے تم اتنی کیوں چپک رہی ہو؟ میرے جانے کا سن کر ایسے خوش ہو رہی ہو جیسے قارون کا خزانہ مل گیا ہو۔“ کسی قدر مشکوک سے انداز میں دیکھتے ہوئے اس نے استفسار کیا۔

”میں اتنی خوش اس لیے ہوں ڈیڑھ کیونکہ اب امکول جاتے ہوئے میں خود کو تنہا محسوس نہیں کروں گی تم ہمیشہ کی طرح میرے ساتھ ہوگی۔ جاتی ہونا اکیلے میں میں کتنا لمبا لاتی ہوں۔“ شفیق اس کے مشکوک سے انداز پر دل کی بات زبان تک لے لاتی تھی۔

”شفیق! تم بھی ناخدا کرتی ہو۔ کب تک ڈرتی رہو؟“ خود میں تنہا دہرایا کرو۔ مجھے دیکھو اگر مجھ میں تم پر وہ سب لوگ اعتماد پیدا کرتے تو آج منہ چھپا ہے۔ کچھ کے کسی کوئے میں چھپی بیٹھی ہوتی تاحیات کوئی کسی کے ساتھ نہیں رہتا۔ زندگی کے کسی موڑ پر بھی انسان تنہا رہ سکتا ہے تب اس کے ہی باقی کا سفر طے کرنا پڑتا ہے کوئی کسی کا ساتھ نہیں دیتا انسان میں اتنا ہمت و ہونا چاہیے کہ وقت پڑنے پر زندگی کا تنہا مقابلہ کر سکے۔“ ایک بچہ بھی جب چان شروع کرتا ہے تو ایک مقررہ وقت تک اپنی ماں کی انگلی پکڑ کر چل سکتا ہے پھر جب پوری طرح سیکھ لیتا ہے تو انگلی پکڑ کر چلنا چھوڑ دیتا ہے۔ اور پھر میں کب تمہارے ساتھ رہوں گی جبکہ چھ عرصہ میں تمہیں اپنا رشتہ ملے گا اور تمہاری شادی ہو جائے گی تب بھی تو تمہیں ”بس بس یار اتنا کافی ہے۔ تمہاری یہ نادروں مایاب

باتیں میں نے پلو میں باندھ لی ہیں۔ ویسے بھی ڈیڑھ سال ہو گیا ہے مجھے اکیلے جاتے ہوئے اب عادت ہو گئی ہے اور میں نے اکیلے آنا جانا سیکھ لیا۔ لیکن پھر بھی تمہارا ساتھ ہوتا تو کیا بات ہے۔“ اس نے پورے خصوص سے کہا۔ مابین نے اس کی محبت دل کی گہرائیوں سے محسوس کیا تھا۔ اسے شفیق پر فخر کر رہا تھا۔
”تو جی شفیق!“

”یقیناً تو نہیں مگر شاید۔“ اب کے اس بھر پور سنجیدگی پر شفیق نے شہریت سے انداز میں کہا کہ وہ چند پل اسے سنجیدگی سے دیکھتی رہی تھی پھر دونوں نے ہی ایک ساتھ زوردار قہقہہ دیا تھا۔

”میں اندر آسکتی ہوں سر!“ آہستگی سے دروازے پر دستک دیتے ہوئے اس نے اجازت طلب کی تھی۔

”جی ہاں آئیے۔“ حسام نے دروازے سے داخل ہوتی ہوئی پرشش لڑکی کو دیکھا تھا۔ جبکہ وہ جانب مابین بھی بری طرح ٹھکی تھی۔ اس کے بغیر میں یہاں احتشام علی احمد کو دنا چاہیے تھا مگر یہ وہ

”جی فرمائیے!“ اپنی حیرت کو چھپاتے ہوئے اس نے اس لڑکی سے استفسار کیا تھا مگر دوسری جانب سے جواب نہ ارد۔

”جی۔۔۔۔۔!“ وہ کسی قدر بے خیالی میں گویا ہوئی۔
”آپ کو کوئی کام ہے؟ میرا مطلب ہے کیا جان سکتا ہوں کہ آپ کون ہیں اور کس سلسلے تشریف لائی ہیں۔“ استفسار ہوا تھا۔

”میرا نام مابین رضا ہے۔ احتشام سر نے جواب کے لیے بلایا تھا مگر وہ تو۔۔۔“ وہ ایک دم

”جی اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کما گے کیا کہے۔“ ادھر آپ مابین رضائیں مجھے بتایا تھا انہوں نے مابین کے والدین آٹن کی طبیعت کچھنا سنا۔ اس لیے مجھے آنا پڑا پلیز تشریف رکھیے۔“ اس نے رتے ہوئے آخر میں اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس کا رویہ خاصا حوصلہ افزا تھا۔ مگر جانے سے پہلے اس نے محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ نیت ہی نیت تھی اس کی جانب بڑھائی تھی۔

”میں نے تو پہلے ہی آپ کا تپا ہے یہاں ہے۔“ اس کی کارروائی تھی جو پوری ہوئی ہے۔ اس نے اسٹول جو ان کے سامنے تھا اتر آ کر آپ کے سامنے بیٹھ گیا۔ ”جی میں نے انداز میں اس کے دواغیب پر کمر بستہ ہو کر بیٹھیں۔ اس نے اپنے پیرائے متاثران انداز میں مڑ دیا تھا۔

”جب میں خود جب سے یہ آتی ہوں تو اس کے لیے میں لڑوں کی ہلاکت اس کا انداز ہی قدر یہ تھا۔ وہ وہاں سے شرم دیتے ہوئے زیرب

آپ غلط سمجھی ہیں۔۔۔۔۔ دراصل میرا کہنے کا مطلب تھا اگر آپ کو یہاں کے اصول اور تنخواہ وغیرہ مناسب لگے ہوں تو۔۔۔۔۔“ مسکراہٹ لبوں میں لہرائے اس نے بغور مابین رضائیں کو دیکھا۔

اسی لیے تو یہاں آئی ہوں کیونکہ مجھے سب بہترین لگا ہے۔ ظاہر ہے اب اتنا پڑھ کر پانچ سو ہزار روپے ہوں گی کیا۔۔۔۔۔“

”شکر ہے کما آپ نے یہ نہیں کہا کہ آپ کو سیلری۔۔۔۔۔ کوئی غرض نہیں ہے آپ کا مقصد علم کی پیمائش ہے۔ اپنا فرض ادا کرنا ہے یعنی وہ یہاں جاتے رہو وغیرہ وغیرہ۔ آپ کی صاف

”کوئی اچھی لگی۔“

”خیر یہ فرض تو ہم تنخواہ لے کر بھی بخولی بھا سکتے ہیں۔ آٹن کے دور میں بغیر معاوضہ کے کوئی کسی کو کچھ کر کے نہیں دیتا۔ ہوں گے کچھ جو انسانیت کے نامے مفت تعلیم دیتے ہوں مگر ہمیں ان کا بھی تو حق ادا کرنا ہے جنہوں نے پیٹ کاٹ کاٹ کر ہمیں پڑھایا ہے ہم بھی تو مفت میں نہیں پڑھے اور پھر ہم بیک وقت کلاس لوگ منت میں کام کرنے لگے تو کوئی انسانیت کے نامے آ کر ہمارے پیٹ نہیں بھرے گا۔“ اب یہ منت مانتے کہ۔ لیکن آپ بھی تو مفت میں بیٹھیں وغیرہ نہیں دے رہے جیسے آپ نیچے زواچھی تنخواہ دے رہے ہیں ایسے ہی بچوں سے بھی تو مصوبت ہوں۔۔۔۔۔ میں نے ٹھیک کہا نہ نہ۔“ اس نے کسی قدر طنزیہ انداز میں اس کی جانب دیکھا تھا اور پورے اعتماد سے استفسار کیا۔

”ہاں جی ہاں!۔۔۔۔۔“ خیر آپ تل۔۔۔۔۔ اب آپ گا۔ اب آپ جاسکتی ہیں۔“ اس کی بات پر زیادہ بحث کے بغیر سنجیدگی سے اسے جانے کے لیے کہا تھا۔ وہ تنہا اپنے مکان کی دروازے پر گیا ہوئی۔
”ہونہ! آج ہمیشہ زور دوتا ہے۔“

حسام نے خاصا چونک کر اسے دروازے تک جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ باہر جا چکی تھی مگر حسام کی نظریں وہیں جم ہی گئی تھیں۔

”السلام علیکم بابا جان!“ لاؤنج میں داخل ہوتے ہی اسے سب سے پہلے احتشام علی احمد دکھائی دیے تھے۔ وہ مسکراتے ہوئے انہی کی جانب چلا آیا تھا۔
”آگے بیٹا! علیکم السلام کیسے ہو بچے۔“ احتشام علی احمد نے معمول کا سوال دہرایا تھا۔
”بابا جان پلیز! آپ بار بار میری طبیعت مت

”وائی!“ اس نے بغور ان کے چہرے کو پڑھ لیا۔

سب نما ہوں ہے یہ حرکات چھپیں نہ رہ سکیں۔

...
...
...

٥٢٠١١

میں بس کی تھی۔

”میڈم! آپ کو احتشام صاحب آفس میں بلا رہے ہیں۔“ اس وقت وہ بچوں کو حساب کے مسائل حل کر رہی تھی جب جین احتشام صاحب کا پیغام لے چکی تھی۔

”تو میری دیر قبل تو میں ہو کر آئی ہوں۔“ پر سوچ انداز میں خود کو کالی کرتی نہ کہ آفس کی جانب چل دی۔ آہستگی سے دروازہ پر دستک دیتی۔

”جی آئیے پلیز۔“ احتشام سر کی بجائے حسام کو دیکھ کر وہ پری طرح چٹکتی تھی۔ دوسرے ہی پل اس کی پیشانی پر شکنیں پڑنا شروع ہو گئیں۔ وہ ہنسنے پر جھکا تھا مگر کان مابین کے قدموں کی آہٹ یہی لگے ہوئے تھے۔ اس انداز سے دیکھ کر خود بخود گراہٹ اس کے لبوں پر آن رکھی تھی۔ مابین کا دل چاہا تھا میں سے واپس لوٹ جائے مگر پھر کچھ سوچتے ہوئے اندر چلی گئی۔

”احتشام سر نے بلایا تھا مجھے؟“ اس نے کسی قدر مزید انداز میں دریافت کیا تھا۔ حسام نے مسکراہٹ لبوں میں دبائی تھی۔ آنکھوں میں شرارت سے سنجیدگی سے گویا ہوا۔

”یقیناً نہیں نے بن بلایا ہوگا میں نے کب کہا کہ میں نے آپ کو بلایا ہے؟“ اس کی بات پر وہ ایک پل کو تپکی ہوئی تھی دوسرے ہی پل دھنکی سے بولی۔

”جانتی ہوں ذرا دیر میں آپ کو بتایا نہیں بلکہ پوچھا ہے۔ وہ مدھر ہیں؟“ اس نے اپنی طرف سے حسام کو شرمندہ کرنا چاہا تھا۔ مگر وہ شرمندہ ہونے کی بجائے محظوظ انداز میں مسکرا دیا تھا۔ اس کی اس مسکراہٹ پر وہ جل ہی تو اٹھی تھی۔ جانے یوں اسے

لگتا تھا کہ حسام کی نظروں میں اس کے لیے ہمدردی ہے۔ وہ اس کی ظاہری کمزوری کو ہمدردی بھری نگاہوں سے دیکھتا ہے جو کہ اسے بہت برا لگتا تھا۔

”ٹھیک ہے جب وہ آجائیں گے میں بھی آؤں گی۔“ چہا چہا کر کہتے ہوئے وہ جانے کو مڑی تھی لیکن حسام نے پکار لیا۔

”انی اے سوری مائین! آپ پلیز ناراض مت ہوں وہ بس آتے ہی ہوں گے آپ بیٹھ جائیں۔“ اس نے شرمندگی سے کہا تھا۔ ”پلیز بیٹھ جائیں مائین! اما آپ میری وجہ سے پرسنوں نہیں ہیں تو میں باہر چلا جاتا ہوں۔“ اب کے وہ گہری سنجیدگی لیے گویا ہوا تھا۔ وہ جب بھی اس سے بات کرتا اسے ہمیشہ وہ خود سے شرمناک لگتی تھی۔ وہ اسے خوش کرنے کے لیے بھی شرمناک ہو جاتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جیسے اور لوگوں کو دیکھ کر اس کے چہرے پر شرمناک آجائے۔

”ایک ہی جگہ اس کے لیے بھی آئے گا شاید۔“

”جی ہاں اس کی ضرورت نہیں ہے میں بیٹھ رہی ہوں آپ کو نہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ بھی آپ کی موجودی سے مدد دیتی ہے۔ یہ کوئی معنی نہیں رہتی۔

”یہ تو بہت اچھی بات ہے لیکن... کیا میں آپ سے ایک بات پوچھ سکتا ہوں؟“ کچھ کہتے کہتے وہ یقیناً رکھتا تھا۔ اور پتہ سوچتے ہوئے استفسار کیا تھا۔

”پوچھیے!“ اس نے گنگے کینڈر پر نظریں جماتے ہوئے آہستگی سے بولی۔

”آپ مجھ سے کچھ زیادہ ہی خار کھاتی ہیں وجہ پوچھ سکتا ہوں؟“ گہری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے دریافت کیا تھا۔ وہ استہزائیہ مسکرا دی۔

”بالکل! دراصل آپ کی نظریں مجھے پسند نہیں

”اے!“ اس نے بغیر کسی مروت کے جھٹ سے کہہ دیا اور یہ سچ بھی تھا کیونکہ وہ واقعی اس سے خار کھانے لگی تھی۔ سچ بولنے کے جواب میں بھٹکتا اسے اس جانب سے ہاتھ دھکی دیتے تو اسے وئی پروا نہیں تھی۔ ایک لمحے اسے اب کچھ بھی انوکھا نہیں لگتا تھا۔ جبکہ حسام اس کی اس درجہ صاف گوئی پر راز بردار لگتا تھا۔

”یامنتہ! میری نظروں میں ایسا یہ ہے جو ایک بوجھ نہیں۔“

”ہمدردی!“ وہ اتنا ہی کہہ کر خاموش ہو گئی۔

”ہمدردی! مطلب؟“ وہ پوچھا۔

”جی ہاں! آپ کی نظروں میں مجھے اپنے لیے ہمدردی دیکھائی دیتی ہے جو مجھے ہرگز پسند نہیں ہے۔“ اس نے سختی سے کہا۔

”اس نے لفظ سختی پر خاصا زور دیا تھا۔ حسام دکھ سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

”آپ کو یہ کہنے سے...“ اس سے قبل کہ وہ کچھ کہتا احتشام علی احمد چلے آئے۔ اس نے اپنے لب لہجے اور اٹھ کھڑا ہوا۔

”میں چلتا ہوں بابا جان!“

”کیوں بیٹا! خیریت...؟“ وہ حیران رہ گیا۔

”جی ہاں! دراصل مجھے تھوڑی دیر کے لیے آفس سے واپس پر میں آپ کو اسپتال لے چکی ہوں۔“

”ٹھیک ہے بیٹا! جیسی تمہاری مرضی۔“ ایک دیر ہی نہ گزری کہ حسام نے اور تیزی سے اٹا پھا گیا۔ مابین نے نخوت سے سر جھکا تھا۔

بات ہوئی تمہاری اس سے... رات کا... کھاتے ہوئے احتشام علی احمد نے بیٹے سے

استفسار کیا تھا۔

”نہیں!“ اس کے حرکت کرتے ہوئے ہاتھ پل بھر کر دھکتے تھے۔ دوسرے ہی پل وہ مختصر سا جواب دے کر دوبارہ سے کھانے میں مشغول ہو گیا۔

”کیوں؟“ انہوں نے پوچھا۔

”آپ کو لگتا ہے جو آپ سوچ رہے ہیں وہ تو بھی جائے گا۔“ ان کی جانب بغور دیکھتے ہوئے اس نے معنی خیزی سے استفسار کیا۔

”بالکل! ضرور ہوگا۔“ انہوں نے پر یقین لہجے میں جواب دیا۔

”کر اس نے انکار کر دیا تو...؟“ اس نے ایک عام سا سوال کیا جس میں بہت سے معنی پوشیدہ تھے۔

”اسے چھوڑ دو تم بتاؤ۔“ تمہاری طرف سے تو اتنا نہیں بتاؤ۔“ اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے انہوں نے سنجیدگی سے دریافت کیا انداز مشکوک تھا۔

”بابا پلیز! میں بھلا کیوں انکار کروں گا جبکہ میں پہلے ہی اوکے کر چکا ہوں۔“ وہ ان کے مشکوک سے انداز پر جھنجھلا رہا تھا۔

”تو پھر وہ بھی انکار نہیں کرے گی مجھے یقین ہے۔“

”اس لیے کیونکہ اس میں ایک واضح کمزوری ہے مگر اس میں... اس کے پاس ہاں“ اسے ملاوہ کوئی اور راستہ نہیں بچتا۔ بے نا! اس نے گویا طنز کیا تھا۔

”نہیں بلکہ اس لیے کہ خلوص دل سے کچھ بھی کیا جائے تو اس کے رد ہونے کا خدشہ نہیں ہوتا درہم شخص ہیں۔“ انہوں نے انتہائی سکون سے جواب دیا۔

”مگر وہ مجھے مخلص نہیں سمجھتی اسے لگتا ہے کہ وہ مستحق ہے اور میں ہمدرد۔ وہ مجھ سے خار کھاتی ہے

”بابا پیڑ! آپ بھی اسی کی طرح لی بیہ کر رہے ہیں میں اس معذوری کا کہہ رہا ہوں کہ اسے لگتا ہے میں اس کی معذوری کی وجہ سے اسے ہمہ ردی بھری نظروں سے دیکھتا ہوں اس پر تو اسے حساس ہوا جبکہ میں نے تو ابھی اس کی فطرت کی کمزوری کو محسوس ہی نہیں کیا۔“ اسے حقیقت کی بات بری لگی تھی۔

کوئی بات نہیں اور اب آپ جلیز نے اس سے
 بات کرینے کے لیے نہیں کہیے گا۔ جانتے ہو یا
 کوپا یہ کہتی ہے وہ نہ اسف و نہ ساقی بات منہ پر
 جھڑپ سے رہتی تھی ایسے سروے انداز میں ہے
 کہ جمل کر کے سترہ سو چار سو میں حد ہوئی ایسی تھی
 یہ صاف کوئی کہہ دی توڑ دے۔ خود کو معذور نہ سمجھتی
 ہے۔ میں جب نہ پاتی ہے تو خود مجھے لگتا ہے کہ
 میں معذور نہیں کیونکہ میرے پاس اس کی بات کا
 کوئی جواب نہیں ہوتا۔ تو ایک دم بچوں کی طرح منہ
 چھاتے ہوئے دل کی کڑواں اس نہال رہا تھا۔ احتشام
 کی انداز پر لب مسکراتے رہتے تھے۔ وہ جھنجھار سا
 رہتا۔

”میں ان کے جذبات سمجھتا ہوں مس شفق الیکسن
 انہیں بھی تو میرے جذبات سمجھنے چاہئیں تاہر باروہ
 میرے خلوص کو خاطر نگ دے جاتی ہیں۔“ وہ بے بسی
 سے گویا ہوا تھا۔

”میں کیوں نہیں؟“ آپ کو لگتا ہے کہ وہ
 میری بات سن لی؟ ہرگز نہیں۔
 ”سن لی؟ کیوں نہیں سن لی؟ آپ تو لگتا ہے بہتر
 پردہ ہی خوفزدہ ہیں اس سے۔“ اس نے دیکھے انداز
 وہ خوفزدہ انداز میں مسکرائی تھی۔

”اے آئی ایم سوسوروی مایا مجھے باطل یا نہیں سمجھتے؟“
 ”تم بابہ میرا بھتیجہ کی طرح ہو۔“

کس شکل میں ڈال دیدیا جان! "دل ہی دل
 کہتا ہوئے اس نے گہری سانس خرق کو کھئی۔

❀ ❀ ❀

ہوتی تھی۔ مگر اکیسواکے چھاپا گیا مہینہ تھا
 وہ یہ کہانی کے لئے کہتے تھے۔ ساتھ ہی دوسرے
 نے کہہ دی تھی۔ یہ کہانی حقائق میں تو نہیں لیکن بعد
 اسباب میں اس میں بہت بڑے کام کرنے کی تھی
 اس کے تلاش میں اندر چھلی تھی اور ان میں انسان
 کے لئے بہت سے پیار اور شفقت تھے۔ ہر انداز میں
 اس کے بات کرتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ ہی ان کا
 ہر ایک یہ بولے ہوئے ہوتا تھا۔ اسے ان کا انداز
 ہے۔ یہ کہانی بہت ہی دلچسپ ہے۔ یہ کہانی اس سے
 بہت زیادہ دلچسپ ہے۔ اس کے لئے کہانی تھی۔

[illegible]

یہ کیا بات ہے مرا جس کے لیے آپ کو اتنی
بے بندہ بنی پڑ رہی ہے؟
اے آپ کے رشتے کے متعلق بات کر رہی ہے

”آپ نے جواب نہیں دیا بیٹی!“ اسے خاموش دیکھ کر انہوں نے دوبارہ پوچھا تھا۔

”در اصل بیٹا! میں آپ کے والدین سے آپ کو اپنے بیٹے حسام کے لیے مانگا چاہتا ہوں۔“ بغور اس کے تاثرات جانچتے ہوئے نے تے انداز میں کہا تھا۔ یہاں پر مرثیہ جانب ماہینہ یہ ت سے کہہ نہ سکی روئی تھی۔ لیکن یہ تھک رہی تھیں اسی لیے تھی۔

نہیں جیسا کہ امت یونسؑ - خواہ مخواہ موت
کہاں کہے بہت عطف ہوگا کہ اگر غلط

آپ
نور حیران پریشان کی بس اتالی

110	دسمبر ۲۰۱۱ء	انچل
-----	-------------	------

We at Paksociety.com
giving you the facility to
download urdu
novels,monthly digest,imran
series etc with direct links
and alternatively 21 other
mirrors.
for complaint about site not
opening contact us @
admin@paksociety.com or
message at 0336-5557121

ہمیں کوئی حق نہیں کہ ہم اس سے شکوہ کریں جب وہ اتنا بچہ نوازتا ہے تو ہم شکر ادا نہیں کر سکتے لیکن جب ایک ہی دے تو شکوؤں کے ڈھیر لگا دیتے ہیں اس بات پر میں خوف زدہ ہو جاتا ہوں۔ وہ رحیم و کریم کتنا عظیم ہے کہ دیتا چلا جاتا ہے دیتا چلا جاتا ہے شکر نہ کرنے پر بھی نوازنا نہیں بھولتا جبکہ ہم اتنی پستیوں میں گرے ہوئے ہیں کہ ہم لیتے لیتے سمجھتے نہیں اور جب بچھڑے تو شکوؤں کے ڈھیر لگا دیتے ہیں۔

”میں نے بھی خدا سے شکوہ نہیں کیا سہ! میں نے تو ہمیشہ اس کا شکر ادا کیا ہے آج جانے کیوں آپ کی بات پر یہ لفظ میرے منہ سے نکل گئے وہ بھی نا انصافی میں کیونکہ آپ کی بات نے مجھے شاکہ کر دیا تھا۔“

”ہاں شاید ٹھیک بھی ہے لیکن اس میں زیادہ حیران ہونے کی کوئی بات نہیں ہے آپ میں ماشاء اللہ تمام خوبیاں موجود ہیں خوب صورت ہیں نیک سیرت ہیں تعظیم یافتہ ہیں اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیے۔“

یہ سب خوبیاں تو باقی ٹیچر زمیں بھی ہیں سہ! میں ہی کیوں؟

”آپ بالکل ٹھیک بہہ رہی ہیں بیٹا! لیکن مجھے بہو نہیں بیٹی چاہیے جو میرے خالی مکان کو ایک ہنست ہستا ہر بندے جیسا پہلے تھا خوشیوں کا گہوارہ مسکراہٹوں کا چہرہ! جسے لوگوں کی باتوں نے اجاڑ دیا۔ وہ کھوئے کھوئے سے گویا ہوئے تھے۔“

”کیا مطلب سہ! اس نے ابھی ان کی کسی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ ابھی تو وہ ان کی ابھی باتوں کو ہی سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔“

”ہاں بیٹا! میرا ہنستا گھرا جڑ گیا، سمجھواؤں کی باتوں نے اجاڑ دیا۔ میرے تین بچے تھے عظام تانیہ اور حسام عظام اور تانیہ حسام سے بڑے تھے ان کی

ماں تب ہی گزر گئی تھی جب یہ سب تعلیم حاصل کر رہے تھے ذہین تو حسام بھی تھا مگر میرے دونوں بڑے بچے انسانی ذہین تھے پوزیشن ہولڈر تھے۔ ہم بہت خوش تھے بڑی پرسکون زندگی گزر رہی تھی و خامیم بی اے کر رہا تھا جبکہ تانیہ بی اے میں تھی کہ اس کے رشتے آنا شروع ہو گئے مگر جس رفتار سے آتے اسی طرح انکار کر کے چلے جاتے، محض نکار ہی نہیں کرتے بلکہ ہماری عزت نفس کو بھی پھل کر جاتے۔ تانیہ تو وطن پرست اور تانہ تھی بھری نکالوں سے دیکھتے ور ساتھ ہماری ذات کو بھی نشانہ بناتے کیونکہ میری بیٹی معذوری تھی۔ لوگ کہتے!

”اتشام صاحبہ! کہ آپ کی بیٹی پڑھی لکھی اور خوب صورت ہے لیکن اس کی معذوری وہ بہن میں رکھ کر سہ جیسا ہی کوئی منہ سب رشتہ تلاش کریں! خواہ خواہ ہر کسی کو زحمت مت دیا کریں۔ اپنا بھی وقت ضائع کرتے ہیں اور ہمارا بھی۔ اور میں محض خاموش سہ بھکا کر رہ جاتا اور میری بیٹی چند سے میرے بچے ہوئے سر کو دیکھتی اور چپ چاپ وہاں سے چلی جاتی۔ ہر بار یہی ہوتا اور ہر بار ہم یہی ٹھل دہراستے۔ میں جانتا تھا اسے یہ سب کرتے ہوئے تکلیف ہوتی ہے لیکن میں مجبور تھا اپنا فرض ادا کرتے ہوئے اسے بہتر باتھوں میں سوپنا چہتا تھا تاکہ اپنی زندگی خوشی خوشی گزارے۔ ایک دفعہ اسی سسے میں ایک فیملی آئی۔ خاصہ دولت مند لوگ، لیکن ان کا بیٹا ان پڑھ جاہل شاید آٹھ کلاسیں پڑھ رکھی تھیں مگر اس کی حرکتیں بتا رہی تھیں کہ وہ آٹھ جہا غنیمتیں بھی بس نام کی ہی ہیں۔ دولت سے مجھے کوئی سروکار نہیں تھا۔ مجھے تو اپنی بیٹی کے لیے پڑھ لکھا معزز اور مخلص لڑکے چاہیے تھا۔ ایسا جو اس کی معذوری کو کبھی اس کے لیے طعنہ نہ بنائے۔ میں نے انہیں رشتہ دینے سے انکار

”ہم نے تو اپنے بیٹے کی خوشی کے لیے آپ کی بیٹی کا نکاح اپن قبول کر لیا اور تو اور آپ کے بیٹے کی آکھ بھی نظر نہ کر رہی ہم نے سوچ کر کی لگاری اور بھائی بھینکا ہے تو کیا ہوا ہمارا بیٹا تو خوش ہے نا مگر آپ ہنس رہے ہیں۔“

تھا وہ بالکل غیر ارادی طور پر یا نادانستہ اپنی معذور
 ٹانگ دوڑا کر رہی تھی۔ میں نام نہاد سر ہٹا گیا۔ پتھر
 بعد وہ لوگ بہت ساری باتیں سن کر چلے گئے تب
 تا یہ اٹھی تھی اور میرے قریب آ کر میرے قدموں
 میں بیٹھ گئی۔

”آئی اچھے سوری یاد جان! ریکی دیری سوری!
میری وجہ سے آپ کو اتنی باتیں سننا پڑیں میری ہی
وجہ سے آپ کو ہمارے جوہدے نا پڑتا ہے۔ ان کی بات
پر میں نے نہ اٹھا کر اس کی جانب دیکھتی تھی۔
”تمہیں بیٹا ایسا بائیں“

”آج مجھے بولنے دیں بابا جان پتہ آج میں بولنا چاہتی ہوں۔ صرف آج۔۔۔۔۔ پھر کب نہیں بولیں گی“
 ”مجھی نہیں! لوگوں کی باتوں پر پراشانت ہو کر میں بابا داد خانہ نہیں کہتا تھا۔ میں ہوں تو مخدوری ماما کی فوج تاجدار میں میں عمل نہیں ہوئی۔ اہوہری ہوں۔“ وہ اتھار یہ انداز میں بول رہی تھی اور میں فطریہ اس کا ٹھکانہ سن رہا تھا۔

"میں اللہ سے شکوہ نہیں کرتی کیونکہ اس نے
 مجھے نامکمل بنایا ہے تو بہت سی نعمتوں سے بھی تو ناز
 ہے مگر لوگوں کو یہ نہیں سمجھتے کہ کیونکہ ان کے بچے جسمانی
 دوز پر مغرور نہیں ہیں بھلے ن میں تپتی ہی خاموش
 کیوں نہ ہوں خامی تو ظاہری ہی، دیکھو، اس کی با
 س اپنی خبر ہی کمزوری کو برتر چھپانا نہیں چاہتی،
 ہی چھپا سکتی ہوں یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اس
 کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مسامتہ ہوتی ہے مگر لوگوں
 میں سمجھتے۔ مگر میں آپ کو شہد نہیں کرنا چاہتی میں
 میں چاہتی آپ کا سر میری وجہ سے بھٹکے میری وجہ
 سے لوگوں کی

”تمہیں بیٹی! ایسا مت سوچو! لوگوں کو قیامت ہے۔“
”حق بابا! لوگوں کو حدت ہے، ہاتھ باندھ کر رہنا نہیں۔“

چھوڑیں گئے اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اب
میں لوگوں کو باتیں کرنے کا موقع نہیں دوں گی۔“ چند
بل کے لیے وہ خاموش ہوئی تھی پھر عظام کی جانب
موجہ ہوئی تھی۔ ”مجھے معاف کر دینا بھائی! آج تک
کبھی کسی نے آپ کی آنکھ کو نشانہ نہیں بنایا مگر آج
میں کو میری وجہ سے ان لوگوں کی باتیں سننا پڑیں
آئی ایم ریلی سوری۔“ اس نے عظام کے آگے ہاتھ
بڑھائے تھے۔ اس نے تڑپ کر اس کے ہاتھ کو اپنے
بائیں ہاتھ میں لیا تھا۔

”نہیں کر یا یہ مدت کہو ہمیں تلافی ہونی ہے۔
تم معافی کیوں مانگ رہی ہو لوگوں کو تو عادت ہے
کے بالکل برا نہیں لگتا۔ مجھے تو اس لیے غصہ آیا تھا کہ
اس کی ہمت کیسے ہوئی تھیں یہی جتنی فکر یہاں سے
نہ کیا ہوتا تو میں ان جاہلوں کا دماغ درست کر دیتا۔“
”کوئی بات نہیں بھائی! اب تو عادت ہو گئی
ہے۔“ میں..... میں جاؤں بابا!“ عظام کو جواب
دے کر اس نے اچانک مجھے مخاطب کیا تھا۔ میں ایک
دم چونک سا گیا۔ جانے کیوں میرا دل ڈوب کر
ابھرا تھا، میں یگانگت بے چین سا ہو گیا، مگر یہ نہیں
جانتا تھا کہ کیوں.....؟ اس کی باتوں میں بہت سے
معنی پوشیدہ تھے جنہیں ہم سمجھ نہیں پائے تھے اگر سمجھ
جاتے تو آج وہ ہمارے ساتھ ہوتی۔ ”بات مکمل
کرتے ہوئے انہوں نے اپنی آنکھوں کی نمی کو
انگوٹوں کی پوروں سے صاف کیا تھا۔ ”وہ چلی گئی تھی
گئی تو اپنے کمرے میں تھی مگر اسی رات یہ دنیا بھی
پھوڑ گئی اور ہم کچھ بھی نہ کر پائے۔“
ماہین کا دل دھک سے رہ گیا۔

”ایا مطلب سر؟“

”اس نے بھاری مقدار میں خواب آور گولیاں
کھائی تھیں۔ ہمیں تو تپ تا چلا جب وہ ابدی نیند

سوچتی تھی۔“ ماہین کا دل دکھ سے بھر گیا تھا۔ بے ساختہ اس کی آنکھوں میں پانی جمع ہونے لگا تھا جسے اس نے سر جھکا کر ہاتھ سے رگڑ ڈالا تھا۔ ”جب پہلی بار میں نے آپ کو دیکھا تھا تب آپ پر مجھے اپنی بیٹی کا گمان ہوا تھا تب ہی میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ آپ کو اپنے گھر میں لے کر آؤں گا کسی ہمدردی کے تحت نہیں بلکہ پورے خلوص سے اپنے گھر میں بیٹی لانا چاہتا ہوں میں نہیں چاہتا اب کوئی اور بیٹی ایسے ہی اپنے باپ کے جھکے ہوئے سر سے شرمسار ہو کر دنیا سے منہ موڑ لے۔“

”میں اتنی باتیں سن چکی ہوں سر کہ اب کسی بات کا شوق نہیں ہوں ورنہ میرے گھر والے دوسروں کی باتیں سن کر مجھے ہی طنز بھری نظروں سے دیکھتے ہیں تو پھر لوگوں کی باتوں کا کیا اثر لینا.....“ اس نے استہزائیہ ہنستے ہوئے کہا۔

”یہ ضروری تو نہیں بیٹا کہ ساری زندگی فشریہ نظروں کا سامنا کرو اور لوگوں کی باتیں سنو وہ بھی بنا کسی قصور کے۔۔۔۔۔؟“

”جی سر! ضروری تو نہیں ہے اسی لیے تو میں کسی کی باتیں نہیں سنتی، اگر کوئی زیادہ کڑوی بات کر دے تو جواب ضرور دیتی ہوں، اللہ کے کام میں ہم کوئی دخل نہیں دے سکتے، مگر لوگوں کو ان کے اندر کا آئینہ دکھانے میں ہمارا بھی تو کوئی کردار ہونا چاہیے نا، انہیں کوئی حق نہیں کہ وہ ہماری کمزوری پر جو منہ میں آئے کہہ کر چلتے بنیں اور ہم اپنے ناکردہ گناہوں پر شرمندہ ہو کر سر جھکا دیں۔“

”ٹھیک کہا ہے! مجھے اچانک ایسی بات ارمیری
 بیٹی سمجھ لیتی تو شاید آج.....! خیر آپ نے میری بات
 کا جواب نہیں دیا بیٹا!“ گہری سانس خارج کرتے
 ہوئے انہوں نے دوبارہ وہی سوال کیا۔

116. آنجیل

”یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ وہ تمہیں پسند کرتا ہو؟ خوب صورت ہو، نیک سیرت ہو، خامیاں تو ہر کسی میں ہوتی ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ کسی میں ظاہری غامی ہوتی ہے اور کسی میں پوشیدہ، لیکن بات صرف اتنی ہے کہ تم فضول کی باتوں کے سبب اتنا اپنا رشتہ تھوڑے کے چکر میں نہ دو، نہ تو وہ قاف کا شاہد ہے اور نہ تم میں کوئی نی ہے۔“ اس کی بات پر شوق کی تیوری پر ہنس پڑے تھے۔

”اس کا مطلب ہے مجھے سوچنے کا بھی کوئی حق نہیں ہے۔ میں اپنی زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ ایسے ہی کر دوں۔ صرف اس سے کہ میرے پاس اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے؟ بے ناشق!“ اس کی بات پر شوق لمحہ بھر کو گڑبڑا سی گئی دوسرے ہی لمحے ڈھٹائی سے گویا ہوئی۔

”یوں مت کر، بات کو کسی اور رخ سے مت دیکھ میرے بے کا ایسا ہوئی صاحب نہیں تھا۔ حسام برائے سے بہتر ہے، یہی بہت اچھی ہے، وہ پر محسوس ہیں اس سے بڑھ کر تمہیں اور کیا چاہیے؟“ یہی کہ بچے سے آئی تمہیں دیکھنے کے لیے دیکھوں کو بلائیں اور وہ تم میں نقص نکال کر انکار کر کے جلتے ہیں۔ اور اگر فرض کرو کسی نے ہاں کہہ بھی دیا تو کوئی تم سے تمہاری مرضی باگش نہیں پوچھتے گا لیکن یہاں بات الگ ہے، بڑے کو تم نے دیکھ لیا ہے والد صاحب انتہائی شخص انسان بھائی کا بیرون ملک اپنا کاروبار ہے اور جانتی ہو جس اسکول میں ہم ٹیچنگ کر رہے ہیں وہ غریب اور ضرورت مند بچوں کے لیے بنایا گیا ہے، میں فیصلہ نہیں دیتے ہیں جبکہ اس فیصلہ مفت تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ تمام کی تمام نیچر ضرورت مند ہیں جنہیں وہ اچھی خاصی خواہ دیتے ہیں اس سے بڑھ کر اخلاص کہاں ہوگا؟ ہر لحاظ

سے بہتر رشتہ ہے اب اگر تم سوچنے بیٹھ جاؤ تو تمہاری مرضی مثبت سوچو تو تمہیں سب شے گے کا یقین کرو۔“ مفت تعلیم کا سن کر کراسے کچھ روز قبل حسام سے کہو گئی اپنی بات یاد آئی تھی۔ ذرا سی ندامت ہوئی تھی مگر نظر انداز کر گئی۔ ”اور میرے خیال میں حسام تمہیں پسند بھی کرتا ہے۔“

”یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟“ مابین نے چونکتے ہوئے اس کی جانب دیکھا تھا۔ وہ بڑبڑا سی تھی۔ ”بس ایسے ہی مجھے محسوس ہوا ہے۔ اس کی باتوں سے۔“ ”وہ تو مجھے بھی محسوس ہوتا ہے۔“ گھر پر سیدھی نہیں ہمدردی!“ اس نے چڑ کر کہا تھا۔ ”تمہاری سوچ ہی فضول ہے، ابھی پتہ اچھا مت سوچنا۔ بارش ہوں میں رہو تم اپنی فضول سوچوں میں م۔“ ”یونہی انداز کر رہی ہوں تم۔“ وہ معنوی غصے سے اٹھ کر چلی گئی تھی۔ ”جدا مابین“ بچتی رہی۔



”بابا جان، آپ سے ایک سوال کیا تھا ابھی تک اس کا جواب نہیں ملا۔ سوائس میں ہے یا ہم میں کوئی کمیوٹ ہے؟“ اس وقت وہ اسٹاف روم میں تنہا تھیں، کاپیاں چیک کر رہی تھیں جب حسام اندر آئے ہی گویا ہوا۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا تھا۔ حسام نے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اس کے دیکھنے پر گھر انھوں نے کا زام یہ نہ پیدا تھا۔ مابین نے خود ہی جھپٹے ہوئے نظریں چرائی تھیں۔

”جی نہیں! تو سوال مشکل سے اور شاید آپ کو وہ میں کوئی کمیوٹ لیکن سوچنے کا حق تو ہر کسی کو ہے۔“ تو پھر مجھے کیوں نہیں؟“ جواباً اس نے خاصی غصے سے استفسار کیا تھا۔ ”ہاں حق ہے آپ کا لیکن دوسروں کے

تعارف کی مدت تک کوئی زور دے تو ہونا چاہیے نا جبکہ آپ تو خود شک و شبہات میں گھری ہوئی ہیں۔ ایسے میں جواب لینے والے ”ہاں“ اور ”نا“ کی صلیب پر گھر رہیں گے جواب دینے والے کے لیے میں پھٹو رہی ہوں چاہیے تاکہ اگر بندہ سکھ کی سانس ہی لے لے۔“ اس کی گہری سانس پر مابین کے لبوں پر گراہت و زکنتی تھی۔

”میں نے سکھ کی سانس پر تو کوئی پابندی نہیں رکھی، صاحب۔“

”آپ نے تو نہیں آپ کے ”شک“ نے پابند کر دیا ہے۔ ویسے حسام کافی ہے صاحب! لگا کر رہی نہیں۔“ اس کی بات کا گہرے لیے میں آپ دیتے ہوئے سچ کی تھی۔ مابین خاموش ہی رہی تھی۔

”ویسے ”ہمدردی“ اور خلوص میں فرق نظر آیا پھر ہی وضاحت کی ضرورت ہے۔“ اس کی مسلسل بات پر وہ اصل بات کی جانب آیا تھا۔ ”پہلے ہی اب نہیں ہے۔“ وہ نظریں چرا تے تھے۔ ”یہ سب گویا ہوئی تھی۔“

اس کا مطلب ہے جس خلوص سے سوال کیا گیا ہے اس نے اسے دل کی پوری صدا مندی سے ”ہاں“ ہی ہے۔ ”چمکتی ہوئی آنکھوں سے“ سے دیکھتے تھے مگر اگر استفسار کیا تھا۔

”شاید!“ وہ شہریر سے انداز میں مسکرائی۔ ”کیا مطلب..... آدھے ادھورے میں لٹکا رہی؟“ وہ فوراً سنجیدہ ہوا۔

”دل احتشام سر نے کیا تھا آپ کی تو صرف بات درمیان میں ہے اس لیے آپ کو آدھا ادھورا جواب دیا ہے پورا جواب تو احتشام سر کو میرے گھر والے دیں گے۔“

”واقعی!“ اس کے جھکے ہوئے سر کو دیکھتے ہوئے بے یقینی سے استفسار کیا تھا۔

”جی بالکل! اب آپ جاسکتے ہیں، بے پاس اور بھی کام ہیں کرنے کو۔“ اسے سنجیدگی سے جواب دے کر وہ کافی پر ہتھ اور ہچکٹی تھی، وہ چند لمحوں کے مکررات سے اس کے نرم نکلی ہاتھوں کو دیکھتے رہا پھر ہیرے سے خدا حافظ کہہ کر چلا گیا۔

”میں یہ تو نہیں جانتی کہ آپ کی آنکھوں میں اور حقیقت ہمدردی ہے یا خلوص، لیکن اس روز شوق کی باتوں سے مجھے لگا کہ پہلے میں نے بھی اپنی معذوری پر کوئی شکوہ نہیں کیا مگر اب شاید میں کسی کے خلوص کو ٹھکرا کر ضرور شکوے کی مرتکب ہو رہی ہوں۔ میں عام لڑکیوں جیسی نہیں ہوں، ہم جی جیوں کو ”آتش“ پر ”پر“ کہتے ہیں اور ہر ”آتش“ پر ”پر“ کی قسمت میری جیسی نہیں ہوتی۔ جب خدا مجھے نہیں لڑکی کو تپا پڑا تو رہا تو پھر میں، شہر اپنی کیوں کروں۔ اس کی عنایت کو شکر ہے کہ ساتھ قبول کیوں نہ کروں۔ جس کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصیبت ہوتی ہے میں نہیں جانتی آگے میری قسمت میں کیا ہوگا لیکن فی الحال میں خدا کی اس عنایت پر دل سے خوش ہوں۔ اور ہونا بھی چاہیے یہ خیال ہے آپ کا۔“



انابتا بیک حیرت سے اپنے سامنے کھڑی خاتون کو دیکھ رہی تھی اور پھر مٹی کی طرف !
”یہ خاتون یہاں کیسے؟“ وہ سوچ رہی تھی۔

”چونکہ مست یہ دامیان سوری کی والدہ ہیں۔“ مٹی نے اسے حیرت میں دیکھ کر کہا۔
”میں جانتی ہوں یہ دامیان سوری کی والدہ ہیں! مگر یہ یہاں کیسے؟“ ان کو دیکھ کر وہ حیران نہیں تھی مگر وہ اس بات پر حیران تھی کہ وہ یہاں کیوں اور کیسے ہیں؟

”مٹی یہ کیا ہے؟“ اس نے مٹی کے قریب ہڑے ہو کر پوچھا۔ آواز اتنی مدہم تھی کہ دامیان کی مٹی نہیں سن پائی تھیں۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی: دامیان کی مٹی آگے بڑی اور اسے ساتھ لگا کر اس کے گال پر پیار کر لیا۔

قسط نمبر 22

اسی خیل

عشنا کوثر مراد

خود نماؤں میں گھر گیا ہوں میں
کن خداؤں میں گھر گیا ہوں میں
کوئی پہچانتا نہیں مجھ کو
آشناؤں میں گھر گیا ہوں میں

”ماشاء اللہ! بہت پیاری بچی ہے۔“ انہوں نے اس کا چہرہ ہاتھ میں تمام کر کہا۔ وہ اپنی مٹی کی طرف حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ اس گھر میں تو دو ہی لڑکیاں تھیں ایک وہ ایک پارسا۔ پارسا کے لیے تو دامیان کا رشتہ آ نہیں سکتا تو پھر.....!

وہ ساکت سی کھڑی رہ گئی۔

دامیان کا رشتہ اس کے لیے؟

اس سے زیادہ وہ سوچ ہی نہیں پار رہی تھی۔ دماغ جیسے ماؤف ہو رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

معارج تغلق اسے مٹی کے گھر لے جا رہا تھا۔ وہ خاموشی سے چہرہ پھیرتے چپ چاپ بیٹھی تھی۔ اس کی طرف سے ناراضگی کا بھرپور اظہار تھا اور دل جیسے بھر آ رہا تھا۔ وہ کس کرب سے گزر رہی تھی اس کا اندازہ اس نے آنکھوں سے بہہ کر آنے والے آنسوؤں سے ہو رہا تھا۔ اس کا دل کس بات پر اور کیوں بھر آیا تھا۔ وہ نہیں جانتی۔

تھا۔ مگر چپ چاپ اس کے چہرے پر ایک نگاہ ڈالی تھی۔

”اب یہ ڈرامے بازی کس لیے؟“ معارج تعلق نے انداسکریں سے نگاہ ہٹائے بغیر کہا مگر وہ پتہ نہیں بولی۔ معارج تعلق کو اس پر ترس آ گیا تھا۔ اس لیے کچھ کچھ بغیر نشو اس کی طرف بڑھایا۔ انا نیامک نے اس کی سمت دیکھ کر ہلکا سا ہنسنے لگا۔

”مجھ کو زبرداریوں کرنے کا کوئی تجربہ نہیں۔ لہذا شلو اور آنکھیں پونچھو۔“ جانے وہ کیا جتانے کی کوشش رہا تھا۔ انا نیامک نے اسے گھورا۔ ”یہ ساری ڈرامے بازی کس لیے ہے؟“ انہیں مٹی کے گھر لے جا رہا تھا وہاں قیام کرنے کا پلن بن رہا ہے۔ کیا یہ ایسی کی شق جاری ہے؟“ وہ غائبانہ کی سمت سے کان بند کر لیا۔ چلتی تھی اسے مزید سننے کا ارادہ نہیں تھا۔ تھی تھی۔ بھی پھر آج کر دیا

جہاں میں ہم ہوئے کیوں تم غیروں سے

میرا ہے تم بولنا پتہ ہونوں سے

نہ تم بولنا پتہ ہونوں سے

پھر بھی میں سمجھوں میں کیا نہیں

اویہ کی جان

انا نیامک نے جانے کیوں پائیہ آف کر دیا تھا۔ معارج تعلق کو جیسے اس کی مقلدیت کرنے کی عادت ہو چکی تھی جیسے ہی اس نے پائیہ آف کر دیا تھا اسی سرعت سے جانا اس کی جانب دیکھنے دوبارہ آج کر دیا تھا۔

میر کی جان

اویہ کی جان

تیرے بن جوان آیا

کالے نہ وہ کٹ پایا

کی تیری کھل کی چلی ہے

تیرے بن جو شام آئی

بڑی دل کی تہائی

میری آنکھیں پھر کی جاتی ہیں

پتھر تم مجھ سے خفا

پتھر میں بھی ہوں

ہے کیا اس کی وجہ

میں کیا ہوں

نا جانے وقت کی مرضی ہے کیا

کیوں ہیں لی

یہ دوریاں

میری جان

اویہ کی جان

”فہم نہ تھی؟ وہ خوشی محسوس کرتا تھا اس کی مخالفت کر کے۔ یا اسے اچھا لگتا تھا۔ وہ اس کے ساتھ کسی جگہ میں نہیں تھی۔ پھر وہ کیوں اس کو جانے کے جتن کر رہا تھا؟“ انا نیامک اسے خاموشی سے دیکھ رہی تھی۔

”اب اس احتجاج کی وجہ کیا ہے؟ ایسے کیوں؟“ میری پوچھ سزا تعلق؟“ وہ اس کی سمت دیکھنے بنا ہوا۔ انا نیامک نے اس کی آنکھیں چاروں طرف پھینکی ہوئی تھیں اور ہر طرف سے دیکھتی تھیں۔ وہ اس کی سمت رہا تھا۔ انا نیامک نے اسے گھورا۔ ”یہ ساری ڈرامے بازی کس لیے ہے؟“ انہیں مٹی کے گھر لے جا رہا تھا وہاں قیام کرنے کا پلن بن رہا ہے۔ کیا یہ ایسی کی شق جاری ہے؟“ وہ غائبانہ کی سمت سے کان بند کر لیا۔ چلتی تھی اسے مزید سننے کا ارادہ نہیں تھا۔ تھی تھی۔ بھی پھر آج کر دیا

جہاں میں ہم ہوئے کیوں تم غیروں سے
میرا ہے تم بولنا پتہ ہونوں سے
نہ تم بولنا پتہ ہونوں سے
پھر بھی میں سمجھوں میں کیا نہیں

انا نیامک نے جانے کیوں پائیہ آف کر دیا تھا۔ معارج تعلق کو جیسے اس کی مقلدیت کرنے کی عادت ہو چکی تھی جیسے ہی اس نے پائیہ آف کر دیا تھا اسی سرعت سے جانا اس کی جانب دیکھنے دوبارہ آج کر دیا تھا۔

میر کی جان
اویہ کی جان
تیرے بن جوان آیا
کالے نہ وہ کٹ پایا
کی تیری کھل کی چلی ہے
تیرے بن جو شام آئی
بڑی دل کی تہائی
میری آنکھیں پھر کی جاتی ہیں
پتھر تم مجھ سے خفا
پتھر میں بھی ہوں
ہے کیا اس کی وجہ
میں کیا ہوں
نا جانے وقت کی مرضی ہے کیا
کیوں ہیں لی
یہ دوریاں

انا نیامک نے جانے کیوں پائیہ آف کر دیا تھا۔ معارج تعلق کو جیسے اس کی مقلدیت کرنے کی عادت ہو چکی تھی جیسے ہی اس نے پائیہ آف کر دیا تھا اسی سرعت سے جانا اس کی جانب دیکھنے دوبارہ آج کر دیا تھا۔

میر کی جان
اویہ کی جان
تیرے بن جوان آیا
کالے نہ وہ کٹ پایا
کی تیری کھل کی چلی ہے
تیرے بن جو شام آئی
بڑی دل کی تہائی
میری آنکھیں پھر کی جاتی ہیں
پتھر تم مجھ سے خفا
پتھر میں بھی ہوں
ہے کیا اس کی وجہ
میں کیا ہوں
نا جانے وقت کی مرضی ہے کیا
کیوں ہیں لی
یہ دوریاں

میر کی جان
اویہ کی جان
تیرے بن جوان آیا
کالے نہ وہ کٹ پایا
کی تیری کھل کی چلی ہے
تیرے بن جو شام آئی
بڑی دل کی تہائی
میری آنکھیں پھر کی جاتی ہیں
پتھر تم مجھ سے خفا
پتھر میں بھی ہوں
ہے کیا اس کی وجہ
میں کیا ہوں
نا جانے وقت کی مرضی ہے کیا
کیوں ہیں لی
یہ دوریاں

میر کی جان
اویہ کی جان
تیرے بن جوان آیا
کالے نہ وہ کٹ پایا
کی تیری کھل کی چلی ہے
تیرے بن جو شام آئی
بڑی دل کی تہائی
میری آنکھیں پھر کی جاتی ہیں
پتھر تم مجھ سے خفا
پتھر میں بھی ہوں
ہے کیا اس کی وجہ
میں کیا ہوں
نا جانے وقت کی مرضی ہے کیا
کیوں ہیں لی
یہ دوریاں

میر کی جان
اویہ کی جان
تیرے بن جوان آیا
کالے نہ وہ کٹ پایا
کی تیری کھل کی چلی ہے
تیرے بن جو شام آئی
بڑی دل کی تہائی
میری آنکھیں پھر کی جاتی ہیں
پتھر تم مجھ سے خفا
پتھر میں بھی ہوں
ہے کیا اس کی وجہ
میں کیا ہوں
نا جانے وقت کی مرضی ہے کیا
کیوں ہیں لی
یہ دوریاں

”تم نے کہاں اتنی دیر کر دی؟“

”میں عدنان بیک کے ساتھ بورڈ میٹنگ میں تھی۔ اب اس نے پرنس پلان بنانے کی ذمہ داری مجھے سونپی۔ میں پچیس سال کی ساری فائز نکال کر دیتی رہی۔ اس میں وقت کا پتہ ہی نہیں چلا۔“ پادشاہ پودری بتایا اور دونوں ہاتھوں سے کنپٹیوں کو دبائے لگی۔

”عدنان بھائی تو ابھی نہیں آئے۔“

”باب جرنی سے ایک وفد آیا ہے انہیں کے ساتھ میٹنگ کے لیے لے گئے۔“

”جس آئے والے ہوں گے۔“

”تمہارا سر دکھ رہا ہے تو کاظم سے کہہ کر چائے بنا دوں۔“ انالینا نے اپنے منسوب کیسٹنگ انداز پر چہچہا۔

”یہاں پر پیسے میں شاد رہے۔ بہت تھک گئی ہوں۔“ وہ پرس اور سیٹل اٹھا کر اٹھی۔

”ملک سے تم کمرے میں باؤتیں کاٹھم لے چائے کا اتنی دوس۔“ انالینا بیک نے ہمارے پارے پادشاہ پودری پر ہنسی سے ہنسی کر کے کہا۔

”یہ یہ اور بات۔“

”کیا کیا تمہارا امین سوری نے اور اس کے پیچھے کیا سباب تھے۔ کیا وہ صرف سے نیپا دھنا چاہتا تھا۔“

”جیہ۔“ وہ بلی کو بے حد کرتا تھا اور اس کے ساتھ خوش تھا پھر اس کے ساتھ رہنا یہ معنی رکھتا تھا۔

”وہ اس کی خوش سیول کر رہا تھا۔“

”یہ سب کیونکر کیا تھا اس نے؟“

”اور وہ بھی اتنا پیسہ دیا کہ وہ جانتا تھا کہ اس کے لیے کی کا پروپوزل آچکا ہے۔ وہ اسے ٹھہرا کر رہی تھی۔ اس سے بھاگ رہی تھی بات نہیں کر رہی تھی۔“

”سارے رابطے توڑ دیئے تھے تو یہ پروپوزل بھجوانا یہ معنی رکھتا تھا؟“ وہ مسلسل ایک ہی کتے پر سوار جا رہی تھی۔

”وہ تو اس کی پیڈ پین کے پروپوزل کی توقع کر رہی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ اس کی طرف سے کوئی آیا ہے۔ اس نے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔“ یہ پروپوزل کی اور کی طرف سے بھی آ سکتا ہے۔ خاص کر درمیان سوری کی طرف سے۔ جس کے بارے میں اس نے بھی سوچا بھی نہیں تھا۔

”یہ جاری نہیں ہو رہا کال پک کرنے کی زحمت نہیں کر رہا تھا۔“

”یہ کیا ہنسی ہے ایک تو پروپوزل بھجوا یا اس پر فون بھی پک نہیں کر رہا۔“

”اسے بہت غصہ آ رہا تھا مگر اس کا بس نہیں چل رہا تھا۔ اس لیے درمیان سوری نظروں کے سامنے تھا۔ وہ اس کا حشر کر رہی ہوئی۔ اس کی ہمت بھی کیسے ہوئی۔“

”جلے پاؤں کی بلی کی طرح وہاں سے یہاں چکر کاٹ رہی تھی۔ ذہن مسلسل متحرک تھا۔“

☆ ☆ ☆

”نہ تعلق نانا کے ساتھ بیٹا ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف تھا۔ وہ کافی کا کپ لے کر می کے پاس گیا ہوا تھا۔“

”کچھ کہنا چاہتی ہو؟“ می نے اسے بغور دیکھا۔

”پاپ کیسے پتا چلا کہ میں کچھ کہنا چاہتی ہوں؟“ انالینا ملک چوکی۔

”میں اس سوال، مجھے تمہارے چہرے سے صاف پتا چل جاتا ہے۔ زائرہ ملک مسکرائی تھیں اور اس کا چہرہ

”تم مگر تھپتھپایا۔ پوری نمرانہوں نے انیہا کے لیے یوں ہی زائرہ کی تھی مگر کیا صدمہ ملا تھا۔۔۔؟“

”جان دونوں ہاں میں کی قسمت ایک جیسی تھی؟“

”وہ ساری پینٹنگز، یوار سے اس نے ہٹائیں؟ اس نے سامنے کی دیوار دیکھتے ہوئے پوچھا۔“

”ہاں، وہ پینٹنگز۔۔۔؟ وہ بلی نے ہٹائی ہیں۔ زائرہ ملک نے مسکراتے ہوئے کہا۔ انالینا ملک چوکی۔“

”کیونکر؟“

”وہ ملک نے خاموشی سے لمحہ بھر کواٹ دیکھا تھا پھر سہولت سے بولیں۔“

”بہت آگے لڑی تے۔ آج کل میرے ہی ساتھ رہ رہی ہے۔“

”پانگ گیسٹ ایئر کب رکھا آپ نے؟ اس کی کیا ضرورت تھی۔“

”یہاں۔“

”پانگ گیسٹ نہیں ہے۔ وہ فریڈ ہے۔ اس ملک میں اس کا بولی جانے والا نہیں ہے اسے رہنے کی جگہ

”تھی۔ اس لیے میں نے اسے اپنے گھر پر رہنے کی اجازت دے دی۔ زائرہ ملک نے بتایا۔“

”مگر آپ کو کتنی رہنے کی ضرورت ہے۔ آج کل کسی پر اعتبار نہیں کیا جاتا زمانہ ٹھیک نہیں ہے۔“ انالینا

”نے ہاں۔ زائرہ ملک اسے سچائی بتانے سے ریز کر رہی تھیں۔“

”نہیں ایسا نہیں ہے، وہ اچھی لڑکی ہے میں نے اسے گھر میں جگہ دے کر بونی نہیں کی تھی اس سے ہوئی

”اس لیے کہ اس کا بہت پیاری بچی ہے، شہر سے جانے کے بعد میں بہت تنہا ہو گئی تھی اس کے آنے سے میرا

”اتنا اچھا گزر جاتا ہے۔“ زائرہ ملک نے سہولت سے بتایا۔

”یہ ہے۔۔۔ مگر پھر بھی خطا رہنا زیادہ بہتر ہے۔“ انالینا ملک نے کہا اور خاموش ہو کر کپ میں کافی کی سطح

”انالی خالی نظروں سے دیکھنے لگی۔“

”کچھ کہنا چاہتی ہو؟“ می نے اسے چپ دیکھ کر پوچھا تو اس نے سر اثبات میں ہلادیا اور اٹھ کر ان

”لے اس آں بیٹھی۔“

”میں! مجھے آپ سے کوئی ضروری بات کرنا ہے۔“ وہ جیسے لہجے میں بولی۔ زائرہ ملک نے خاموشی سے اس

”ف دیکھا اور پھر آہستگی سے سر ہلادیا۔“

”ہاں، بولو۔۔۔!“

”میں! وہ جیسے غصہ جمع کر رہی تھی اپنے خور پر تیار ہو رہی تھی۔ کچھ بتانے کے لیے۔۔۔ زائرہ ملک اسے منتظر

”لوں سے دیکھ رہی تھیں۔“

”مئی! رئیس اگھانی انگل نے مجھے میری مہندی والے دن کال کی تھی جب میں پارلر میں مہندی کی آفر کے لیے تیار ہو رہی تھی۔“
 زائرہ ملک رئیس لاکھانی کو جانتی تھیں تبھی چونکتے ہوئے بولی تھیں۔
 ”کیا کہا تھا انہوں نے....؟“

”انہوں نے مجھے ایک خاص مقصد سے فون کیا تھا“ انا یا سر جھکا کر بولی۔ زائرہ ملک اسے بغور رہی تھیں۔
 ”کس خاص مقصد سے....؟“ وہ چونکیں اور انا یا ملک اپنے اندر ہمتوں کو مجتمع کرنے لگی تھی۔

☆.....☆.....☆

یلماز کمال اس کے سامنے آن کھڑا ہوا تو وہ حیرت سے سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی تھی۔ نگاہوں میں سوال تبھی یلماز کمال بولا۔

”گاہ! تم سے ایک بات کرنی ہے۔ آؤ ساتھ چلو“

”ایسی کیا ضروری بات ہے، میں بول دوں۔“ وہ اس کی جانب دیکھنے سے عمل بہتتاب کرتے ہوئے بولی۔
 ”دوہری باتیں رات میں نہیں ہو سکتیں، بھابھو! بچوں جیسی باتیں مت کرو“ اس نے تنبیہ لہجے میں کہا۔
 ”ایسی کون سی ضروری بات ہے جو یہاں نہیں ہو سکتی؟“ وہ غلط لہجے میں بولی۔
 ”بے ایک ضروری بات جو یہاں رات میں نہیں ہو سکتی۔ تم ہر بات پر الجھتی کیوں ہو؟ میں کہیں تم کو برا کرنے نہیں لے جاؤں گا“ وہ تپ کر بولا۔

”میں تمہارے ساتھ بلاؤ، جب کسی جھٹ میں الجھنا نہیں چاہتی۔“

”جھٹ میں الجھنا بھی نہیں چاہتی اور جھٹ بھی کر رہی ہو؟“ وہ جتاتے ہوئے بولا۔

پارسا چوہدری نے ایک گہری سانس خارج کی اور پھر کوئی دوسری راہ نہ پاتے ہوئے اس کی جانب دیکھنے نہ بولی۔

”چلو! وہ اس کے ساتھ چلے گا۔ قدرے ویران گوشے میں آکر اس نے بیٹچ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ چپ چاپ بیٹھ گئی اور منتظر نظروں سے یلماز کمال کی سمت دیکھا۔
 ”بولو، کیا بات ہے؟“

”تمہاری اماں کا فون آیا تھا، اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، انہیں ہارٹ ایک ہوا ہے۔“

”کیا!“ پارسا چوہدری کے پاؤں تلے سے جیسے زمین پل میں سرک گئی تھی۔

”کال رات فون آیا تھا، میرے پاس تمہارا نمبر نہیں تھا غالباً تم نے بدل لیا ہے“ وہ اس کے ساتھ بیٹھی پرسکون لہجے میں بولا۔

پارسا چوہدری سر جھکائے بیٹھی تھی اور آنکھوں سے آنسو ٹوٹ کر ررتے تھے۔ یلماز کمال نے اسے اس سے دیکھا تھا۔

”کیسی طبیعت ہے ان کی“ اس کے حلق سے آواز بس نام کو نکلی تھی۔

”زیادہ بات نہیں ہوئی، چاہتی تھی اس اطلاع ہی تھی اور سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔“ وہ بولا۔

پارسا چوہدری نے بھی تو اس کا سر برقی طرح چدرا یا زمین جیسے جھوم رہی ہو۔ وہ اڑکھڑائی تو یلماز کمال نے سہارا دیے کو ہاتھ بڑھایا مگر اس نے ہاتھ جھٹک دیا اور اٹھ کر وہاں سے نکل گئی۔

☆.....☆.....☆

”مئی! آپ کو میرے ساتھ ہاسپتال چلنا ہوتا“ زائرہ ملک چپ چاپ سی سر جھکائے بیٹھی تھیں۔ سب انا یا ملک نے ان کے ہاتھ پر بہت نرمی سے ہاتھ رکھا تھا۔

”انا یا! میں ہاسپتال نہیں جانا چاہتی تھی اور تمہیں بھی یہی مشورہ دوں گی کہ وہاں مت جاؤ جو چیزیں ختم ہوئی ہیں ان کا دوبارہ آغاز کرنے سے کوئی فائدہ نہیں“ وہ متانت سے بولیں۔ وقت نے انہیں ایک شہر آؤ دیا تھا۔ ان کے اندر چاہے کتنے بھی مدد جزر تھی.... مگر وہاں سے عمل پر سکون آھائی دے رہی تھیں۔

”مئی! ہر بات میں فائدہ یہ نقصان نہیں دیکھ جاتا، یہ بات آپ ہی نے تو سکھائی ہے کہ جب کوئی مشکل حل نہیں ہو تو اس کی مدد کرو۔“ انا یا ملک نے ہاتھ لکر زائرہ ملک کی خاموشی رہیں۔

”مئی! چیزیں اس طرح کہنے سے ختم نہیں ہوتیں۔ چاہے آپ انکار کریں میں نہ مانوں مگر یہ چیزیں جھٹلائی نہیں جاسکتیں اور پھر یہ وقت ایسی باتیں سوچنے کا بھی نہیں ہے“ انا یا ملک ماں کو قائل کرنا چاہ رہی تھی۔

”رئیس لاکھانی نے تمہیں فون کیوں کیا تھا، مجھے کیوں نہیں بتایا.... اسے ایسی باتیں تم سے کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“ زائرہ ملک بولیں۔

”مئی! وقت بہت مزرچہ ہے، اب میں نا سمجھ نہیں ہوں اور آپ کو کسی بات کو مجھ سے چھپانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں باقی میری ماں کوئی کمزور عورت نہیں ہے، بچپن میں ہی باتیں آپ مجھے نہیں بتانا چاہتی تھیں۔ یہ وہ اس وقت میں نہ سمجھتی۔ چیزوں کو سمجھنے پتی تھی مگر اب ایسا نہیں ہے۔“ انا یا ملک نے نرمی سے ہر کر ماں کی طرف دیکھا۔

”انا یا! میں نہیں چاہتی تم ان باتوں میں الجھو۔“ زائرہ ملک نے کہا۔

”مئی! یہ معاملہ مجھ سے بدانتیں ہے، اس کا معاملہ مجھ سے بس اتنا ہی ہے جتنا کی آپ سے.... ہم دونوں ایک ہی عورت بندھے ہیں۔ آپ ہال تو بہت نرم ہے، بہت جلد معاف کر دیتی ہیں آپ، پھر اب اتنی سخت دل کیوں ہو رہی ہیں؟“ انا یا ملک نے پوچھا۔

”انا یا! بڑیا بہتہ یہی ہوگا کہ اس ہر موضوع پر بات نہ کریں۔ میں رئیس لاکھانی سے بات کروں گی۔ اسے میں اس طرح الجھانے یا ہماری زندگیوں کو متاثر کرنے کا حق نہیں۔“ زائرہ ملک کا ہجڑہ تھم تھا۔

”مئی! اس میں لاکھانی انگل کی کیا غلطی ہے؟ انہیں لگا یہ رشتہ ہم سے وابستہ ہے تو اس سے متعلق سب سے زیادہ ہمیں بتانا ضروری تھا۔“

”مگر اس نے تمہیں کیوں بتایا.... سے کیا حق تھا میری بیٹی کی زندگی کو یکدم میوں سے سب کرنے کا تم نے اسی دن مجھے فون کر کے کیوں نہیں بتا دیا؟“ زائرہ ملک کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

”مئی! یہ معاملہ مجھ سے الگ تو نہیں، پھر آپ کو حیرت کیوں ہو رہی ہے اور جو بھی ہو بہر حال آپ میرے

ساتھ ہسپتال چل رہی ہیں۔ "انا کیا بولی اور زائرہ ملک اسے دیکھ کر رہ گئی تھیں پھر قدرے توقف سے بولیں۔

"تم نے معارف کو تو پتہ نہیں بتایا"

"میں اسے یہ بتاؤں گی مگر یہ زائرہ کیوں نہیں مانا! کسی اور کو ان معاملات سے کچھ لینا دینا نہیں۔ زائرہ ملک ناموشی سے سر جھکا کر بیٹھی تھیں۔ جب انا گیا ملک زائرہ کی طرف دیکھتی ہوئی نرمی سے بولیں۔

"میں اتنی ناگوار نہیں ہوں کہ اپنے سے جڑے معاملات کی تشہیر یہاں وہاں کرتی پھر رہی اور آپ کو بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب میں وہ چھوٹی سی نا سمجھ بنا گیا نہیں ہوں۔ ہمیں کسی بھی معاملے سے گراؤ ایک دوسرے سے نظر چڑانے کی ضرورت نہیں۔ انا کیا ملک بہت تجھداری سے کہہ رہی تھی۔ زائرہ ملک جی کو دیکھتی رہ گئی تھیں۔

☆.....☆.....☆

مئی ڈیڑی نے اس پروپوزل کے بارے میں کیا ملے یہ تھا اور انہیں کیا جواب دیا تھا وہ نہیں جانتی تھی مگر اس کے اندر کی بے باکی بڑھتی جا رہی تھی۔

اس نے دامیان سوری سے کئی بار بات کرنے کی کوشش کی تھی مگر وہ کال پک کر ملے پر رخصت مند کھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ کیس بھی نہ کر رہا تھا وہاں بھی نہیں تھا۔

یہ چوبیس بجی "انا کھیاں وہ کیوں کھیل رہا تھا وہ نہیں جانتی مگر وہ اس کا سامن کیوں کرنا نہیں پتا۔ وہ اس بات کی اشد حسرت سے کوئی نہیں تھا۔

"وہ... نہ تو اس کے لیے اتنی بے چین کیوں تھی..."

وہ یہ پروپوزل قبول کرنے یا رد کرنے کے معاملہ تو اس کا اپنا تھا۔ مگر وہ پروپوزل بھوانے کی ہمت رکھتا تھا تو وہ بھی رد یا تنہا کرنے کا اختیار رکھتی تھی۔ جب یہ حق اس کے پاس محفوظ تھا تو اس میں تا پریشان ہونے کی ضرورت کیا تھی۔

اس نے خود اپنے آپ کو بھایا اور پرسکون ہونے کی کوشش کرنے لگی۔

"مئی! آپ اس کینیڈین پروپوزل کی بات کر رہی تھیں؟ شام میں مئی جب کچن میں کاظم کے ساتھ شام کی چائے کا اہتمام کر رہی تھیں وہ پوچھنے لگی۔

"ہاں انہوں نے بات کی تھی مگر اب دامیان کا پروپوزل بھی تو ہے...؟

"تو...؟" انہیں بیگ چوٹی۔ مسز بیگ نے اسے نگاہ اٹھا کر دیکھا۔

"بیٹا! وہ اچھا لڑکا ہے پھر بات یہ ہے کہ تم اسے ساروں سے جانتی ہو، دیکھا بھالا ہے۔" مئی نے کہا۔

"تو کیا مطلب تھا اس کا؟" انہیں بیگ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"انا بچا بچے! یہ چیزیں بچوں کے سوچنے کی نہیں ہیں، بہت تجھداری کی ضرورت ہوتی ہے ان سب معاملوں میں۔"

"تو کیا طے کیا آپ نے؟" انہیں بیگ کے اندر ایک بے چینی پھیل رہی تھی۔

"ابھی تو کچھ نہیں سوچا مگر دامیان اچھا لڑکا ہے، ایک بھالا ہے۔" مئی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مئی! آپ جانتی ہیں اس کا بھانوی میب کی طرف ہے۔ وہ محبت کرتا ہے اس سے میں نہیں جانتی اس نے کتنے مشتق بنائے کیوں نہیں؟" مگر یہ پروپوزل ٹھیک نہیں ہے۔" انہیں بیگ صاف گوئی سے بولی۔

"مئی میب! یہ وی فارن لڑکی ہے نا جو تمہاری برتھ ڈے پر ہمارے گھر آئی تھی۔"

"ہاں۔۔۔ جی۔۔۔؟" انہیں بیگ نے جانتی۔

"مگر دامیان ایسا کیوں کر ہے۔ مگر وہ پہلے سے ہی کے ساتھ انوار تھا تو اسے پروپوزل بھوانے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ بچہ تو نہیں ہے کہ ایسی باتیں نہ کہتے۔ وہ مسز بیگ نے کہا۔

"مئی! اس نے سب نہیں جانتی میں اور یہ مئی بیگ نہیں ہے۔ میں جانتی ہوں میں اس پروپوزل کو قبول کرنے کی کیا ہوں۔" وہ بتاتے ہوئے ہوں۔

"مگر وہ مئی کے ساتھ نہ ہوتا تو کیا تم سے قبول کرتیں؟" مئی نے پوچھا۔ وہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگی اور اس چپ اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

"مئی! اگر یہ یہ حق کی بات ہے اور میرے پاس اختیار ہے تو میں دامیان سوری کو اس قابل نہیں سمجھتی۔" وہ دو دو گانڈ میں ہیں۔

"انا بچا بچے! لڑکیوں کے لیے پروپوزل آتا معمول کی بات ہے۔ تمہیں کچھ کس بات سے ہو رہی ہے پروپوزل آنے سے یہ دامیان کا پروپوزل آنے سے؟" مئی نے نرمی سے پوچھا۔

"ہم اس موقع میں بات کیوں کر رہے ہیں مئی! دامیان دنیا میں کوئی واحد آدمی نہیں اور اگر یہ اگھوتا بھی ہے تو میں اسے بھی اپنی زندگی میں شامل کرنا نہیں چاہتی۔ میں اسے اس قابل نہیں سمجھتی۔" انہیں بیگ نے کہہ کر باہر نکل گئی۔ مئی نے اسے حسرت سے دیکھا تھا۔

☆.....☆.....☆

"عدن! مجھے ایک مادی نوادید اس میں مل سکتی ہے؟" عدن بیگ نے چونک کر سر اٹھایا اور اسے دیکھا۔

"نہ! وہ مل سکتی ہے کوئی یہ جیسی؟" عدن بیگ نے پوچھا۔

"ہاں! مجھے ضرورت ہے" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"پیسے ضرورت کے لیے ہی خرچ کیے جاتے ہیں، میرے علم میں یہ بات ہے۔"

عدن بیگ نے اسے بیٹھے کا اشارہ کیا تو پارسا چوہدری چائے کرتی بیٹھ گئی، اس کا انداز کھوپ کھوپ ساتھ اور آنکھوں کے پوٹے سو جے ہوئے۔

"تم ٹھیک ہو؟" عدن بیگ نے پوچھا پارسا چوہدری نے سر اثبات میں ہلایا۔

"تم روٹی ہو؟" عدن بیگ نے اس کے چہرے کو غور دیکھا۔ اس کا پوچھنا تھا کہ اس کی آنکھیں پھر سے بھر گئی ہیں۔ وہ میر جھکا کر بیٹھی رہی جیسے اپنی کمزوری کا پتا کسی کو لگنے نہ دینا چاہتی ہو۔ عدن کو اس کی حالت میں قہقہہ لگی۔ کچھ اپنی سیٹ سے اٹھ کر اس کے قریب آیا اور اسے پوری توجہ سے دیکھنے لگا۔

پارسا چوہدری! بند باندھن ضروری ہے جہاں تک ممکن ہو گرجب برداشت باقی نہ رہے تو کوئی بند باندھنا اصول ہوتا ہے۔ تمہیں کوئی پریشانی ہے تو اس کا حل ڈھونڈنا چاہئے۔ مگر اس کے لیے تمہیں شہر سے ہٹنا پڑے گا۔ وہ مقامات یہ ہیں۔

پارسیا کی آنکھوں سے بہت سی خوشی سے آنسوؤں کا گرج رہا ہے۔ مگر اس نے پہلے کہ بے قدر رہو۔ بعد میں بیگ نے اپنی پادریوں پر چن لیا اور پھر وہاں اس کی طرف بڑھا۔

”میں جب تک کوئی اور بات نہیں کروں گا جب تک تم یہ رونا دھونا بند کر کے مجھے بتاتی نہیں۔“

”میں جتنا چاہتی ہوں آپ بتا دیں اگر مجھے سیڑی کے پیسے ایسا سال سکتے ہیں تو“ عدین بیگ نے کیا خاموشی سے اسے دیکھا پھر جبکہ برہمنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا اور اس کے چہرے کو بغور دیکھنے لگا۔

پارسا چوہدری! بہت دور اندیش ضروری نہیں۔ تم اس دنیا میں جیتے ہیں تو ایک دوسرے سے بندھ جاتے ہیں پھر کوئی رشتہ ہو کہ نہیں۔ نہ ہو کہ نہیں۔ میں کوئی حق محفوظ رکھتا ہوں۔ مگر مجھے سے دل کا دوبا تا ہے۔

”نہ کسی ذریعے ہم ایک دوسرے سے جڑے ہیں۔ یہ رشتہ کوئی نام نہان نہ کہتا ہو یا حلق میں کوئی خاص پناہیت ہو مگر یہ رشتہ کچھ لمحوں کے لیے کچھ پائے کا ہے تو اس میں یہ بڑی۔“ عدین بیگ پرستوں کے لیے میں کہتا ہوں۔ بغور دیکھ رہا تھا۔

”میرے ہاکی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں انہیں بارش ایک جواب ہے۔ مجھے انہیں دیکھنا ہے۔“

پارسا چوہدری نے بنا اس کی طرف دیکھتے کہا۔

”اوہ! بہت افسوس ہوا اب میں طبیعت بہانوں۔“ عدین نے اپنی بات سے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

”میں نے باقی اس لیے میں جتنا چاہتی ہوں وہ ہفتی میں بیاتے ہوئے بولی۔“

”تو اس طرح ایسی کیسے جوئی۔ تمہاری اپنی حالت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ تمہیں اکیسے نہیں جانا چاہئے۔“

”از کم میں اس کی اجازت نہیں دوں گا۔“ عدین بیگ استحقاق سے بولا۔ وہ ہر جگہ کراہت دیتے گئے۔

”مجھے بتاؤ کہ اس کی کنٹیس کرواؤں؟“ وہ اٹھ کر فون کی طرف آیا۔ ”یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ!؟“

چونکی تھی کنٹیس؟

”ہاں میں تنہا تمہیں جانے نہیں دوں گا۔“ وہ بولا اور دوسری طرف ایاز کو بتایا، کنٹیس فیصل آباد کے لیے آئی کی فنانس سے ”اس ارجنٹ۔“ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کیا اور اس کی جانب آیا۔

”یہ کیا ہو رہا ہے۔“ وہ چونکتے ہوئے اس کی جانب تکتے گئے۔

”میں تمہارے ساتھ جا رہا ہوں اور ایڈوانس سیڑی کی قدر کرنے کی ضرورت نہیں، وہ بھی تمہیں مل جائے گی“ وہ دو نوک انداز میں کہہ کر فون میں بڑی ہو گیا اور پارسا چوہدری حیرت سے اس کی سمت دیکھتی رہی۔

☆.....☆.....☆

زارہ ملک چپ چاپ کھڑی اس ہوش و خردیت بیگانہ وجود کو دیکھ رہی تھی۔ انا میاں کے پیچھے کھڑی تھی۔

زارہ ملک نہ جانے کیوں بے ہمت سی ہو رہی تھیں۔ آنکھوں میں ٹھہری نمی کناروں سے باہر آئی تھی۔

زارہ ملک اتنی نا تو اس لگ رہی تھیں کہ انا میاں ملک کو ان کے برابر کھڑا ہونا پڑا تھا، اسے لگا جیسے وہ ابھی ان کو رگڑ کر جائیں گی، ان کا وجود ہوا۔ ہوئے کا پ رہا تھا۔ جیسے وہ کسی طوفان کے دہانے پر ہو۔ انا میاں ملک ماں کی کیفیت سمجھ سکتی تھی۔

کیوں واپس آئے ہیں یہ ہماری زندگی میں اب۔ یہ نہ ورت تھی اب ان کی۔ کیوں چلے آئے اس طرح۔ اوہ مدھم آواز میں روتے ہوئے بول رہی تھیں۔

جہاں تک ملک! اگر تم مجھ سے پوچھتے تو میں منع کر دیتی۔ کبھی نہ کہتی کہ اب ہماری زندگی میں واپس آنا ہے کہ ایک شہر او آچکا ہے۔ ہم ایک سو فی صد سے بڑے۔ چپے ہیں تو اب ایک اور طوفان اپنے منہ سے اُتر رہا ہے۔

”تو آؤ۔“

”تو آؤ۔“

”تو آؤ۔“

”تو آؤ۔“

”تو آؤ۔“

”تو آؤ۔“

”تو آؤ۔“

”تو آؤ۔“

☆.....☆.....☆

”وہ بیٹے پرٹھی اپنا فائل پر وجیٹ جمع کروانے سے پہلے چیک کر رہی تھی۔ جب وہ اس کے قریب آن رکھا۔“

”بات اگر مجھ سے جڑی ہے تو بات کرنا ضروری ہے انہیں بتائیے!“ و امین سورج جھٹاتے ہوئے ہوا۔

آنجل 132 دسمبر 2011ء

آبجیل	133	دسمبر ۲۰۱۱ء
-------	-----	-------------

مگر آج انہیں اس طرح روت دیکھ کر اندر کہیں بہت تکلیف ہوئی تھی۔ وہ اس تکلیف کا مداوا نہیں کر سکتی تھی۔ مگر اس تکلیف کو اپنے اندر محسوس کر رہی تھی۔ وہ بہت نڈھال لگ رہی تھی۔ معارج تعلق نے ڈرائیو کرتے ہوئے اسے دیکھا۔

”تم کہاں کی تھیں می کے ساتھ۔“ معارج تعلق نے پوچھا مگر انایا ملک نے جواب نہیں دیا۔ آنکھیں آنکھوں سے موندی تھیں۔

”پورے دو گھنٹے لیے تم نے ایسی کوئی ایمر جنسی آگئی تھی؟“ انایا ملک کسی سوال کا جواب نہیں دینا چاہتی تھی مگر معارج تعلق جاننے پر اصرار تھا۔

”کیا ہم اپنے معاملات الگ نہیں کر سکتے۔“ آنکھیں موندے وہ مدہم بچے میں بولی۔

”کون سے معاملات؟“ وہ چونکا۔ ونڈا سکرین سے اٹھا ہٹا کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

”میں کیا کرتی ہوں، کب کرتی ہوں اور کیسے کرتی ہوں، اس بات کی فکر کرنا ترک کرو وپینا! مجھے الجھن ہوتی ہے، دم گھٹتا ہے میرا۔“

”جتنے اس کی پرہیزگاری ہے انایا تعلق اتنے بیوی ہومیوپی۔ اس سب کی فکر رکھنا ضروری ہے، معاملات اتنی آسانی سے الگ نہیں ہو سکتے، اب اس سے تمہارا چہرہ دم گھٹتا ہے یا جان نکلے۔“ لہجہ اور انداز بے فکر تھا۔ وہ آنکھیں کھول کر اسے اس کی خود سری کو دیکھنے لگی۔

”تمہاری بات سے میں مر جاؤں، جانتی ہوں رتی برابر فرق نہیں پڑے گا تمہیں وہ جل کر بولی تو معارج تعلق کے لبوں پر جانے کیوں ایک مسکراہٹ پھیل گئی۔

”بے فکر ہو، مرنے نہیں، وہاں کا تمہارے معاملے میں میری ساری خیالات بہت متحرک ہیں۔ تم سانس بھی لیتی ہو تو اس کی خبر ہو جاتی ہے۔ سو جب سانس نہیں لوں تو اس کی خبر نہ ہو ایسا ممکن نہیں۔“ سب کسی کی حد تک کوئی وہ اتنا سٹائل اور ترقی القلوب تھا۔ اسے تکلیف میں دیکھ کر وہ خوشی محسوس کرنا تھا اور اس کی موت کی باتیں اسے تسکین دیتی تھیں۔

”تمہیں بہت خوشی ہوگی نہ اگر میں مار ہوں؟“ وہ ہنسنے لگے لہجے میں بولی۔

”مجھے خوشی ہوگی اگر تم باقی رہو تو... تمہارے بناب دل نہیں لگے گا نا! کچھ عادت سی ہوگئی ہے تمہاری۔ اب جب شہ سائی کچھ گہری ہو رہی ہے اور ہم قریب آ رہے ہیں تو ایسے میں تمہارا جانا سود مند نہیں ہوگا؟“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ انایا ملک کا دل چاہا کہ اس کے ہاتھ میں کوئی وزنی شے آجائے اور وہ اسے اس شخص کے سر پر دے مارے، وہ اس کے سامنے اس کی موت کی منسوبیہ بندی اتنی بے حسی سے کر رہا تھا۔

”تمہیں کسی بھی بات کی خوشی ہو میں ایسا بھی نہیں چاہوں گی معارج تعلق! جس طرح تمہیں مجھے سکون میں دیکھ کر تکلیف ہوتی ہے ویسے ہی مجھے تمہارا سکون سونے نہیں دیتا مگر فرق یہ ہے کہ میں تمہاری طرح منسوبہ بندی نہیں کرتی۔ ہاں بس ایک موقع کی تلاش میں ہوں جب تمہارا یہ سکون تم سے ویسے ہی چھین سکے جیسے تم نے چھینا ہے۔ اگر میں تمہارے ساتھ ہوں تو اس کی وجہ ہے درنہ تم مجھے اس کے لیے کبھی مجبور نہیں کر سکتے ہونہ دنیا کا کوئی قانون“

تمہارا خلع کا کیس کہاں تک پہنچا...؟ کب تو میں کسی وکیل کو ہار کر دوں؟ تمہارا وکیل تو تھکا ہارا ہے۔ ابھی ایک نوٹس بھی تیار کروا کے مجھ تک نہیں پہنچا سکا“ وہ محظوظ ہوا۔

”کانڈی گھوڑے دوڑانے کی عادت ہے نا آپ کی، بہت جلد چھوٹ جائے گی“ وہ تپ کر بولی۔

”اوہ! ایسا کیا کرو گی تم؟“ وہ مسکرایا۔ ”کچھ کرنے والی ہوں تم؟“

”کروں گی تو آپ کو پتا چل جائے گا۔“ وہ اعلاتی سے کہہ کر چہرہ پھیر گئی۔

”تمہارا حرات چالیس چلنا جانتی ہو۔ کوئی اور ہتھیار اٹھانے کی ضرورت نہیں، تمہارا حسن کافی ہے“ اس نے بتایا۔

”میں نے ابھی چالیس چلنا شروع نہیں کی ہیں فی الحال آپ کی چالیس دیکھ رہی ہوں“ وہ مدہم لہجے میں بولی۔

”باتوں میں الجھا کر بات بدلنا جانتی ہو مگر تعلق! بات تمہاری می کے ساتھ کہیں جانے کی ہو رہی تھی اور تم نے مجھے کر پوری دنیا کا ایک چکر لگوا دیا“ معارج تعلق نے بہا وہ اب گئی تھی اس کی سمت سے جیسے اپنے اندر کر لینا چاہتی تھی مگر ایسا ممکن نہیں تھا۔

”میں می کی ایف دوست کی طرف گئی تھی۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ آپ کو انتہا سے زیادہ تجسس ہے تو سہمی آگئے ہوتے، وہ ہیں نانا کے ساتھ بیٹھے شہرج کی چالیس کیوں چاہتے رہے؟“ وہ جل کر بولی۔

”نانا کے ساتھ شہرج کی چالیس اس لیے چلتا رہا کہ تم پر نظر رکھ سکوں، مگر تم بہت ہوشیار ہو، اس کا موقع نہیں ملتا۔“ خیر، آج شام ایک دعوت ہے، صبح جا کر فریش ہو جانا۔“ معارج تعلق نے مطلع کیا۔

”میں کسی دعوت میں جانے کے موڈ میں نہیں، صبح کرو۔“ وہ آنکھیں موند کر بولی۔

”میں انکار نہیں کر سکتا، میں ہر صورت میں جانا ہے، لہذا تیار رہنا۔ اس ضمن میں کوئی کوتاہی قابل قبول نہیں۔“ معارج تعلق نے صدم نامہ جاری کیا۔

”یا ملک اس کی بے حسی پر تمہارا کر رہی۔“

.....

”اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ کھر آ کر وہ کتنے ہی لمبے اپنے کمرے میں بیٹھی آنسو بہاتی رہی تھی۔ وہ بندہ ان آسانی سے اس کی بے عزتی ہر بار کر جاتا تھا۔ وہ اسے اتنی ایزی کیوں لیتا تھا۔ اس کی شکل پر نہیں لکھا تھا کہ اتنی بے وقوف ہے، کہ جب چاہے تھیں مشت بنالیتا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا اس کے پاس آکر ہوتی تو وہ ہر قسم کر دیتی۔ بہت غصہ آ رہا تھا اور خون پتا نہیں کس درجہ حرارت پر بھول رہا تھا۔

”ناپک! ناپک!“ مٹی نے فون پر کسی سے بات کرتے ہوئے دروازہ کھولا۔ وہ جو ٹکے میں نہ پھپھکے بیٹھی بیٹھی اپنا چہرہ پونچھا۔

”ناپک!“ مٹی نے اسے پھر پکارا تھا پھر فون پر بات بھی جاری رکھی۔ ”ہاں آپ آج شام آ سکتے ہیں۔“ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ ”مٹی نے سلسلہ منقطع کر کے اٹھنا کی بات دیکھا۔“ کیا کر رہی ہو تم۔“ سو رہی ہو۔“ اٹھنا نہ تھکے کے اندر سے منہ نہیں نکالا تھا۔ مٹی نے اس کے

اماں کی نگاہ اس پر اب تک نہیں پڑی تھی۔ وہ کسی خیا توں سے باتوں میں مصروف تھیں۔ جیسے ہی وہ خیا توں وہاں سے اپنی خیا توں کی پہلی نگاہ پارسا چو بدری پر پڑی تھی۔ وہ سہانگی رہ گئی تھیں۔ پارسا ان کی سمت چلتی جا رہی تھی، آنکھیں پانیوں سے بھر رہی تھیں۔ کتنے ماہ و سال ان کے خیا توں سے دور ہوتے تھے، مگر ان کا وہ رشتہ اب بھی اتنا ہی گہرا تھا، اتنی ہی شدت اور کھینچاؤ اپنے اندر رکھتا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ ان کے سامنے جا رہی تھی۔ آنکھوں میں آنسو تو اماں کے بھی تھے مگر اس کے قریب پہنچنے پر وہ اس کی طرف سے نگاہ پھیر گئی تھیں۔ مدد وہیں پر رک گیا تھا۔

”اماں میں۔ آپ کی پارسا۔ آپ کی کالہو۔ وہ بہت مدھم سرگوشی میں بولی اور ان کے قریب جا رہی تھی۔ اماں اسے چپ چاپ سنتی رہی تھیں۔ پارسا نے اپنا سر ان کی شانے پر رکھ دیا اور کہنے لگی، آنسو اس شانے میں چپ چاپ جذب ہوئے تھے۔ وہ اتنی ہی ایسے کھڑی رہی تھی، پھر اماں نے اسے خود سے لگ لیا تھا۔

”کالہو! وہاں کیوں آئی؟“ اماں نے کہا۔

”اماں! کیا اب بھی نہیں آتی؟ کتنے سال تو جا رہی۔ اب اور کتنا؟“ اپا کا سنا تو رہا ہی نہیں کیا۔ کیسی عجیب بات بن اب ان کی۔ میں انہیں دیکھنا چاہتی ہوں۔ وہ آگے بڑھنے کو ہی جب اماں نے اس کا بازو پکڑ کر روک دیا تھا۔

”کالہو! میری بات سنو، وہ رک کر اپاں کی طرف دیکھنے لگی۔

”میں اب اسے نہیں مل سکتی؟“ اتنی ہی خفا تو ان کی۔ کٹی پاز کر چہنا سیکھا۔ ان کے قدم پر قدم رکھ کر چلی میں۔ وہ آگے چلتے تھے میں ان کے قدموں کے نشان پر اپنے پیروں سے چلتے ہوئے چلتی تھی۔ تھک جاتی تھی تو ان کی گود میں سر رکھ کر سو جاتی تھی۔ صبح اٹھ کر انہیں یہی سستی نہیں تھی تو مجھ کو رونا آتا تھا۔ اس کا کہہ جانے کو دل نہیں پاتا تھا۔ جب تک وہ مجھے اسکول گیٹ تک ڈراپ نہیں کرتے تھے اور میرا جیب باس اور پانی کی بوتل ہاتھ میں نہیں تھمتے تھے۔ میں اندر جاتی نہیں تھی۔ وہیں گیٹ پر کھڑی ان کی گاڑی کو جانا دیتی رہتی تھی جب تک کہ منظر انہیں اس سے اوجھل نہ ہو جاتا تھا۔ آج جب وہ بیمار ہیں تو کیا میں انہیں صرف ایک نظر دیکھ بھی نہیں سکتی؟ اماں اور سنی بڑا ہے میرے۔ یہ؟ اتنی بڑی تو خطا نہیں تھی میری۔ میں نے تو تب بھی معافی مانگی تھی، ونا احتیاج ہی تھیں مگر سنی نے میری سنی ہی نہیں تھی۔ ”وہ آنسوؤں کے ساتھ کہہ رہی تھی۔ اماں نے نہ ہاتھ بڑھا کے اس کے آنسو پونچھے نہ چوکے۔

نعدان بیگ نہ چاہتے ہوئے بھی تمام منظر قدرے فاصلے پر کھڑا دیکھ رہا تھا۔ ان کے درمیان کا تناؤ و صاف محسوس کر سکتا تھا، مگر وہ قریب جا کر نہ پارسا کی دکالت کر سکتا تھا نہ اسے سہارا دے سکتا تھا، نہ اس کے لیے بول سکتا تھا۔ یہ وہ محاذ تھا جو پارسا چو بدری کو اکیس ہی سر کرنا تھا، چاہے اس کے لیے یہ کتنی ہی مشکل کیوں نہ ہو۔

”کالہو! کل کی باتیں جانے دو، آج کی طرف دیکھو، کل بیٹے کی سال ہوئے۔“ ہنسی کا لہجہ تھا۔

”یہی تو۔۔۔ یہی تو کہہ رہی ہوں اماں! کل بیٹے تو سال ہوئے۔ کل کی باتوں کو جانے کیوں نہیں دیتے آپ سب آج کی طرف کیوں نہیں دیکھتے؟ کیا میں آج اب اسے بھی نہیں مل سکتی جو کل تک میرے لیے چھپے چھاؤں تھے؟ پارسا تن کر کھڑے رہنا چاہتی تھی۔

”کالہو! تم آج بھی مندی ہو مگر تمہیں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ یہاں کچھ بھی کل جیسا نہیں ہے، تمہارے ابا اس وقت آئی سی یو میں ہیں اور میں نہیں پتا کہ تم ان سے ملو۔ ان کی حالت اور بھی بگڑ سکتی ہے اور اس کا ذمہ ریمپرکون ہوگا؟“ تو نے جب اس دہلیز کو پہل ڈالا تھا تو انہیں پہلا انیک، دو تھا اور اب جب وہ تمہاری دوست کی تادیب میں شرکت کے لیے گئے تھے تو تم ہی ان کی اس بات کا سبب بنیں۔ وہ تمہارے بارے میں سوچتے تھے تھے اگرچہ کبھی ذکر نہیں کیا تھا مگر میں جانتی تھی، وہ اکثر تمہاری تصویر دیکھتے تھے۔ میں سوچتی تھی تو ان باتیں کرتے تھے میں نہیں جانتی، مگر تم ہمیں ایک شکل میں چھوڑ گئی تھیں۔ کالہو! تم اب اسے ملنے کا خیال دل سے نکال دو۔ واپس چلی جاؤ، یہی ٹھیک رہتا ہے۔“ ماں نے سب دردی سے کہا۔ پارسا چو بدری سر اٹھا کر اس بات کی تھی، آنسو پلوں کی پانچ پانچ ہلکے ہلکے رستے تھے مگر اس پر پتھر اثر ہی نہیں ہو رہا تھا۔

”اماں! بس ایک بار۔۔۔ صرف ایک نظر! اس کے بعد میں کوئی ضد نہیں کروں گی۔“ وہ جیسے رنجہ است کر رہی تھی۔

اماں نے سر اٹھا کر میں بلایا تو نعدان بیگ سے یہ صورت حجاب دیکھی نہیں گئی اور وہ ان کے قریب آئی۔

”آپ پلیز انہیں ایک بار ملنے دیں۔“ وہ بولے بنا نہیں رہا۔ اماں نے اس کی سمت دیکھا تھا پھر ابا کو دیکھا۔

”یہ کون ہے؟“

”میں نعدان بیگ ہوں۔ پارسا کا باس! یہ میرے آفس میں جاب کرتی ہیں۔ یعنی پارٹ ٹائم جاب اپنے پیسے کے بعد۔ جب ہمیں اس بات کا پتا چلا تو پارسا کی حالت بہت دگرگوں گئی اور مجھے ان کے ہاتھ آنا پڑا۔ اگر میں انہیں اسلئے آنے دیتا تو شاید یہ اپنا دھمیان خود نہ رکھ پاتیں۔ بچوں سے انہیں ہوتی ہیں، مگر ہر دس تا کام معاف کر دینا ہے۔ وہ ہمیں میں آپ کے ذاتی معاملات میں بولنے کا کوئی حق تو نہیں رکھتا، مگر درخواست کر سکتی ہوں۔“ نعدان بیگ نے کہا تو اماں نے پچھویر ناموشی سے اسے دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہل دیا۔

”ٹھیک ہے تم پچ جاب انہیں دور سے دیکھ سکتی ہو۔ سلو آنے والا ہے، میں چاہتی ہوں تم اس کے آنے سے پہلے یہاں سے چلی جاؤ۔ اپنے ابا سے بات کرنے کی اجازت تمہیں نہیں دے سکتی۔ ایسا کرنا ان کی حالت بڑھانے کا سبب بن سکتا ہے۔“ اماں کی اجازت ملنے کی دیر بھی پارسا فوراً اندر کی طرف بڑھ گئی۔

☆.....☆.....☆

لتی میک گیشا کو گود میں لیے سیب کھا رہی تھی۔ جب زائرہ ملک کافی کے دوگے میں اندر داخل ہوئی تھیں۔ اسے بغور دیکھا تھا وہ جس طرح پیار سے بیٹا سے باتیں کرتے ہوئے اسے سیب کھا رہی تھی اس نے زائرہ ملک کو انا پنا کی یاد دلانی تھی۔ زائرہ ملک آگے بڑھیں تو لتی ان کو دیکھ کر مسکرائی۔

”میں گیشا سے باتیں کر رہی تھی یہ سیب بہت شوق سے کھاتی ہے، لگتا ہے انا پنا اسے سیب کھاتی رہی ہیں۔“ وہ قیاس کرتی ہوئی بولی تھی اور گیشا کو گود سے اتار دیا تھا۔ زائرہ نے کافی کا ٹکڑا اس کی سمت بڑھایا جسے اس نے تھام لیا۔

”انا پنا گیشا کو سیب کھاتی تھیں اور تمہیں یہ بات کیسے پتا چلی، مجھے اس پر حیرت ہے،“ لتی میک نے لمحہ بھر

چپ ہو کر لب بچنے۔

”خیر! مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے! زائرہ نے بات کو آگے بڑھایا۔

”یہی ضروری بات؟“ للی میک چوٹی، زائرہ ملک اس کے سامنے بیٹھ گئیں اور کچھ دیر خاموش رہ کر جیسے

اسے بتانے کے لیے مناسب الفاظ ڈھونڈتے تے اور یوں۔

”تم پر سے یہ ایک خبر ہے، جہاگیر ملک سے متعلق“

”جہاگیر ملک سے متعلق کیا خبر؟“ للی سیدھی ہو کر بیٹھی۔

”وہ واپس آیا ہے“

”وہ؟“ للی نے ہونٹ سکڑا دیے۔

”کہاں ہیں وہ؟“

”ہاسپٹل میں وہ گولے میں ہیں، ان کی حالت ٹھیک نہیں، جب میں ان سے ملنے گئی بس آنکھیں کھول

کر انہوں نے میری طرف دیکھا۔ ان کی حالت بگڑنے لگی تھی۔ اس کے بعد انہیں ہوش نہیں آیا، ڈاکٹر نے بتایا

وہ مائیں چپے سے ہیں اور دوش میں واپس آ رہے ہیں اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا مگر ان کا

بہاؤ بہت زیادہ ہے، تم اگر ان سے ملنے جاؤ گی اور بات چیت کرؤ گی تو تمہیں سن سکتے ہیں، اگر انہیں سنا کر

تمہیں نہیں دیکھ سکتے۔ جواب دے سکتے ہیں۔“ زائرہ ملک نے غصیل بولی۔

”اگر ان کی یہ حالت یہ ہے تو کیسے ہوئی؟“ للی نے پوچھا۔

”میں نہیں جانتی وہ کب واپس آئے، مگر میں آگے کی ہم، لوگوں کے مشتہر کردہ دست ہیں انہوں نے انہیں و

اس کی مہندی کی شریاب، اس دن اس نے دوش میں وہ دستہ لٹکے نہیں دیکھا تھا، جہاگیر ملک جرئی میں

تھے شاید چند دن پہلے ہی یہاں آئے ہوں گے۔ حالت بگڑ گئی تو میں رکھوں گے انہیں ہاسپٹل پہنچا دیا، وہ اب

ایسی حالت میں بیمار کی طرف واپس آ رہے ہیں، میں یہ نہیں جانتی مگر میں جانتی ہوں کہ ان کے متعلق بتانا نہیں

چاہتی تھی اور سب سے پہلے اسے ہی اس واقعے کی خبر ہوئی۔“ ان کا اچھا ہمدردی سے لہجہ نہیں بغور دیکھا۔

”آپ کیوں نہیں چاہتی تھیں کی اس کی خبر انا کیا وہ؟“

”میں اس کو ذرا سبب مرنے نہیں چاہتی تھی وہ نئی زندگی میں قدم رکھ رہی تھی اور میں نہیں چاہتی تھی یہی ولی بھی

بات اس کی زندگی کو دستے کرے۔“ زائرہ ملک نے کہا۔

”میں سمجھ سکتی ہوں۔“ للی کافی کے گھونٹ لینے لگی۔ ”چھو دیر تک ان کے درمیان خاموشی چھانی رہی۔

”کیا سوچ رہی ہو تم؟“ زائرہ ملک نے اس چھوٹی لڑکی کو دیکھا تھا جس کی لیلی آنکھیں اس سے یقیناً کچھ

سوچ رہی تھیں۔

”شاید میری تلاش ختم ہوئی! میں جس مقصد کے تحت اس مقام پر آئی تھی آج اس کا اختتام ہو گیا میں

جہاگیر ملک کی آنکھوں میں نہیں دیکھ پاؤں گی۔ مجھے اس کا یوں رہے گا میں بہت سے سوالوں کے جواب

چاہتی تھی۔ ان کی آنکھوں کو دیکھنا چاہتی تھی، وہ ایک جو بے لگی تھی ان کے اندر جس نے انہیں بھاگتے رہنے پر

مجبور کیا میں اس کا سراغ چاہتی تھی مگر اب یہ ممکن نہیں ہوگا۔“ وہ مایوس ہوئی۔

”سوال ہم سب کے پاس تھے لیکن اگر شاید جہاگیر ملک میں ہمت ناپید ہے، وہ کسی سوال کا کوئی جواب

نہیں رکھتے یا پھر جواب دینا نہیں چاہتے۔ لکی ایک زمیانی چپ کا راستہ چن لیا! ان کا دماغ تو جاگتا ہے مگر

آنکھیں گہری غیند سو رہی ہیں اور یہ نیند سب گولے کی گولی بھی یا نہیں اس بارے میں کوئی نہیں جانتا؟“

زائرہ ملک کے سچے میں ایک کھٹک کا احساس تھا۔

”آپ کب بٹنے لگی تھیں ان سے؟“ للی نے پوچھا تھا۔

”کل آٹا کی آٹی تھی تم گھر پر نہیں تھیں اور وہیں تو تمہیں بھی ساتھ لے چلتے۔“ زائرہ ملک نے کہا۔

”آپ نے انا کیا ملک و میرے بارے میں بتایا؟“ للی نے پوچھا۔

”نہیں! ابھی نہیں... مجھے سمجھ نہیں آیا کیسے بتاؤں؟“ للی پہلے ہی بہت الجھی ہوئی ہے۔ جن حالات میں

اس کی شادی ہوئی اور پھر یہ سب ہوا وہ ان سب سے کل نہیں پارہی۔ میں سب باتوں کا جو چھ اس کے اوپر

اردوین من سب خیال نہیں کرتی، اسے بعد میں کبھی بتاؤں گی سرسہولت سے... فی الحال وہ جہاگیر ملک کے

سبب بہت الجھی ہوئی ہے۔ زندگی بھر اس نے انہیں دیکھا نہیں اور آج اگر دیکھا بھی تو اس حالت میں زائرہ

ملک نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

للی نے سر ہلایا تھا۔

”ہم سب ایک انجانی ڈور سے نہ چلتے ہوئے بھی بندھے ہوئے ہیں، جس کا کوئی سرا نہیں ملتا پھر ملتا

بھی ہے، ہم ایک دوسرے سے جڑے بھی ہیں اور نہیں بھی۔ یہ وقت کیوں پیش آیا اس کی تو خبر نہیں لیکن اگر

یہ حقیقت ہے تو ہم اس سے کٹ کر نہیں رہ سکتے۔ ہم سب کو جہاگیر ملک نے باندھ رکھا ہے اور اس کے باوجود

ہم کھڑے نہ ہو سکتے۔“ للی نے پوچھا تو زائرہ ملک نے سر ہلادیا۔

جائیں گی یا میں خود چلی جاؤں؟“ للی نے پوچھا تو زائرہ ملک نے سر ہلادیا۔

”ٹھیک ہے میں تمہیں لے جاؤں گی۔“ زائرہ ملک نے للی کو دیکھا تھا جو اس لمحے کافی کے سپ کو چپ

چپ دیکھ رہی تھی۔ زائرہ ملک و اس پر پیارا تھا۔

”میرا آؤ، میرے پاس بیٹھو“ للی ٹھہرا اس کے پاس آن بیٹھی زائرہ نے اس کے گرد بازو پھیل کر پیار سے

اسے ساتھ کیا۔

”فکر مت کرو زیادہ مدت سوچو، سوچنے سے کوئی حل نہیں ملتا مگر ذہن الجھتا جاتا ہے بہت دھیمے لہجے میں

کہتے ہوئے اس کی پیشانی پر پیار سے پیار اس کی طرف بغور دیکھ جوان سے لگاؤ نہیں مار رہی تھی۔

”تم ٹھیک ہونا۔“ زائرہ ملک نے پوچھا۔

للی میک نے سر اثبات میں ہلادیا۔

☆ ☆ ☆

پارسیا چوہدری شیشے کے اس پار سے اس بے حس و حرکت وجود کو آنسوؤں سے تر پیرے سے چپ چاپ

دیکھ رہی تھی۔ جب عدنان بیگ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ پارسانے پٹ کر نہیں دیکھا تھا نہ اس کی سمت

نہ لگی تھی۔

”تمہیں اندر جا کر انہیں دیکھ لینا چاہیے، مگر فی الحال ان سے کوئی بات کرنا مناسب نہیں ہوگا“ عدن بیگ نے مشورہ دیا تو پارسا چوہدری کچھ لمبے یوں ہی چپ چاپ کھڑی رہی پھر دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔

”سنو!“ عدن بیگ نے پیچھے سے پکارا، پارسا چوہدری نے کوئی توجہ فی الحال نہیں دی اور اندر بڑھ گئی۔ اتنے قریب سے وہ انہیں جیسے پہلی بار دیکھ رہی تھی دو قدم کا وہ فاصلہ اسے بہت زیادہ محسوس ہو رہا تھا۔ اسے لگا تھا وہ اب بھی میلوں کی دوری پر کھڑی ہو مگر وہ کوئی آہٹ اپنے قدموں سے کرنا نہیں چاہتی تھی کہ ان کو ڈسٹرب کرے۔ وہ دواؤں کے زیر اثر تھے۔ وہ وہیں رکی انہیں تادیر تک رہی تھی۔ آنسو آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔

کہاں سے چلی تھی وہ

کہاں تک کا سفر کیا تھا

وہ اپنے قدموں کے نشان جیسے آپ بھول گئی تھی۔

کل وہ اپا کے قدموں پر قدم رکھ کر چلتی تھی اور آج خود اپنے قدموں کے نشان اسے یاد نہیں تھے۔ وہ ان ہاتھوں کو چھونا چاہتی تھی، ان ہاتھوں کے لمس کو، اس شفقت کو اسی طور پر محسوس کرنا چاہتی تھی مگر قدموں میں جیسے ہمت نہیں تھی، نگاہ اسی لمحے سامنے اٹھی تھی جہاں عدن بیگ کھڑا اس کی سمت دیکھ رہا تھا۔ اس نے شیشے کے اس پار سے اس کی ہمت بڑھائی اور اسے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ شاید یہی وہ ایک لمحہ تھا جو اس کی ہمتوں کو بڑھا گیا تھا۔ وہ آگے بڑھی اور ان کے ہاتھ اور قریب آن رکی۔ بہت آہستگی سے ہاتھ بڑھا کر ان کے ہاتھ کو چھوا، اس حرارت سے پُرمس کو محسوس کرنا چاہا۔ وہ انگلیاں، وہ پوروں کی نرم حرارت جو کسی ایک دن اس کے ہاتھ پر تھی وہ جس ہاتھ کو تمام کر چاتی تھی تو مسکراہٹ اب اس سے نہیں ہٹتی تھی۔

آج وہ ان سے گوسول دور تھی۔

”ابا! مجھے معاف کر دو“ اس نے وہ ہاتھ لیوں سے لگا کر بہت آہستگی سے کہا۔ آواز بہ مشکل حلق سے برآمد ہوئی تھی۔ وہ انتہائی کم ہمت ہو رہی تھی۔ سر جھکایا اور سے کچھ یاد نہیں رہا۔ اس سے پہلے کہ وہ زمین پر آئی عدن بیگ نے فوراً اندر کی جانب دوڑ لگا کر اسے بازوؤں میں تھام لیا۔

اگلے لمحے پارسا چوہدری نیم جان سی اس کے بازوؤں میں ہوش و خرد سے بیگانہ... ناتواں اور کمزور! عدن بیگ نے اس کا چہرہ سنجھتا ہوا اس کے بے حس و حرکت وجود میں حرکت نہیں ہوئی تھی اور اس سے اگلے لمحے عدن بیگ اسے لے کر باہر نکل آیا۔

☆☆☆

وہ شور لے کر باہر نکلی تو سارے وجود میں ایک تکلیف کا احساس ہوا۔ معارج تعلق اپنے لپٹ ناپ پر کوئی ضروری فائل دیکھ رہا تھا۔ دن بہت تھکا دینے والا تھا اور اس پر شادی کے بعد کی یہ دعوتیں۔ وہ ہاسپٹل جانے کے لیے بھی وقت نہیں نکال پارہی تھی۔ نہ ہی اتنی فرصت ملی تھی کہ می کو فون کرنی اور جہاں تکیر ملک کے متعلق پوچھتی۔ معارج تعلق نے ایک بل کو بھی اسے تنہا نہیں چھوڑا تھا۔ جانے کیا خوف الحق تھا اسے کہ وہ اسے چھوڑ دے گی یا بھاگ جائے گی۔ اسے اپنے معاملے میں وہ جیسے کوئی خوفزدہ بچہ لگتا تھا یا بہت غیار اور چالاک تھا۔

آدمی جو کسی کو بس اپنے فائدے کے لیے اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہو۔

وہ بال تو لیے کن قید سے آزاد کر کے بیڈ کے قریب آئی۔ ایک تکیہ اٹھانا چاہتا تھا جب اس کا ہاتھ معارج تعلق کی گرفت میں آ گیا۔

انا یا ملک نے اس کی طرف دیکھا تھا۔ اسے کب خبر ہوئی تھی کہ وہ تکیہ اٹھانے اس کی طرف آئی ہے...؟ اس کے مسائل میں معارج تعلق کی آنکھیں چاروں طرف گھومتی تھیں۔

دونوں کی نگاہیں لمحہ بھر ملی تھیں۔ ان آنکھوں میں وہی ہمت دہمی اور سرمہری تھی وہی خود سری تھی۔

اسے ہر آنے کی وہی لگن اور وہی ہزار ہا جتن!!

وہ لچھنا نہیں چاہتی تھی بھی نرمی سے بولی

”مجھے سونا ہے“ گویا وہ مصالحت پر آمادہ تھی۔

”سونا ہے تو پورا بیڈ پڑا ہے، منع کس نے کیا ہے؟“ مجھے یہ ڈرامے بازی بالکل پسند نہیں، تکیہ اٹھا کر کاؤچ پر سونے کی جس رشتے میں ہم بندھے ہیں اس میں یہ ڈرامے بازی قابل قبول نہیں ہو سکتی“ اس نے اس کے ہاتھ کو جھٹکا دیا۔

انا یا ملک حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

”یہ بد تمیزی ہے؟“ وہ کمزور پڑنا نہیں چاہتی تھی۔

”انا یا ملک تمہیں اپنے ساتھ باندھنے سے مجھے دنیا کا کوئی قانون باز نہیں رکھ سکتا، شادی سے لے کر اب تک کافی ڈرامے بازی تم پر چکی ہو اب اس کا ختم ہو جانا چاہیے۔ مجھے یہ بات برا قبول نہیں ہوگی کہ تم ایک ہی کمرے میں رہتے ہوئے یہ می کہانیوں والی ڈرامے بازی کرو۔ اگر تم میری بیوی ہو تو میں سارے حق محفوظ رکھتا ہوں۔ سو اس بات کو جوں جوں کہ میں تمہیں اس طرح فضول اقدامات چپ چاپ کرنے دوں گا اور تم من مانیاں کرنی جاؤ گی“ اس نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

”تم مجھے اس طرح مجبور نہیں کر سکتے میں کسی زبردستی کو قبول نہیں کروں گی“ وہ دہنات نہیں چاہتی تھی۔

وہ پیپ ٹاپ بند کر کے پوری توجہ سے اس کی جانب متوجہ ہوا۔

”تمہیں تو ابھی نظر بھر کے دیکھ بھی نہیں میں نے اور تم اتنی حد بندیاں لگا رہی ہو؟ ہم دونوں کے رشتے میں یہ پروا داریاں کیونکر آ رہی ہیں؟ ہاں!“ ان نظروں میں گہری پیش کش تھی۔ انا یا ملک دم سدا دھے اسے دیکھ رہی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



ایک لکھا

صبا جاوید

قریہ جاں سے جاتے جاتے درد پرانا ٹھہر گیا ہے
یوں لگتا ہے اس موسم میں جی کا جانا ٹھہر گیا ہے
ممکن ہو تو شام کو اک دن ملنے کی تقریب کرو تم
کچھ دن کو اس شہر میں اپنا آب و دانہ ٹھہر گیا ہے

”روحیل آج کی پارٹی اتنی شان دار ہونی چاہیے کہ تہلکہ مچ جائے۔ مجھے ہر چیز پر فیٹ اور ان ٹائم چاہیے۔“ سامعہ احمد فون کال ڈراپ کر کے لیپ ٹاپ پر مصروف روحیل احمد سے مخاطب ہوئیں۔ چند ثانیے کے لیے انہوں نے نگاہیں لیپ ٹاپ کی اسکرین سے ہٹا کر سامعہ احمد کے صبیح چہرے کی طرف دیکھا اور ایک مسکراہٹ سے نواز کر دوبارہ کام میں مصروف ہو گئے۔

روحیل! میں آپ سے بات کر رہی ہوں۔“ انہیں متوجہ نہ پا کر وہ چلا اٹھیں۔

وہ ایسی ہی تھیں خود پسندی کی انتہا کو چھوٹی ہوئی مادیت پرستی کے خمیر سے گندھی ہوئی۔ دنیاوی نمود و نمائش میں خود کو آسمان کی بلندیوں پر رکھنا ان کی اولین خواہش تھی جو اکثر اوقات پایہ تکمیل کو پہنچ ہی جاتی۔ گھر میں پیسے کی ریل پیل تھی۔ دولت کا بے جا اور بے وقت استعمال سامعہ احمد خوب جانتی تھیں۔ ہر گزرتا لمحہ ان کی امارت میں اضافے کا سبب بن رہا تھا اور اس امارت کو برقرار رکھنے اور

پروان چڑھانے کے لیے روحیل احمد کیا کیا جتن کرنا پڑتے ہیں۔ وہ اس بات سے قطعاً تعلق اور بے فکر تھیں۔ اپنی منوائے اپنی کہنا اور بس اپنی ہی کہے جانا ان کا اصول تھا۔ ان کی اس خود سری میں زیادہ ہاتھ خود روحیل احمد کا ہی تھا جو ان کی ہر بات بلا چوں و چراں کے حرف آخر کی طرح مان لیتے۔ ان کا سر اس جی حضوری پر اور بلند ہو جاتا فخر کی وجہ سے تاکہ مان کے سبب

”یہ لو بند کر دیا کام۔ اب بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟“ روحیل نے واقعی کام بند کر دیا اور مکمل طور پر ان کی طرف گھوم گئے۔

”یعنی آپ نے ٹھیک سے میری بات سنی ہی نہیں.....؟“ حیرت و استعجاب سے وہ گنگ رہ گئیں اور مزید برہمی کا اظہار کرنے لگی۔

”تم آج شام کی پارٹی کی بات کر رہی تھیں میں نے سنا۔ سب انتظامات ہو جائیں گے۔ تم پریشان نہ ہو اور بتاؤ۔“ انہیں شبنوں سے اپنی طرف موڑتے ہوئے روحیل احمد دھیمے لہجے میں بولنے لگو

رخ موڑے قدرے ناراض تھیں۔

”روحیل! تم کتنے اچھے ہو۔ اوکے تو پھر میں شاپنگ کے لیے نکلتی ہوں۔ پارٹی میں ملتے ہیں۔ اپنا خیال رکھنا باگے۔“ بیگ کندھے پر لٹکانی وہ تیز تیز قدموں سے داخلی دروازہ عبور کر گئیں۔

سفید ساڑھی جس پر کمرشل کے ٹک جڑے تھے زیب تن کیے سامعہ احمد غضب ڈھارہی تھیں۔ وہ اتنی دیر میں تین موبیلوں کی مالالتی تھی۔ حاضری میں کٹش کی سٹائی ٹاکا ہیں خود پر مرکوز پاروہ کچھ اور غور کرنا آئے تھیں۔

مناویں اور سیٹھیوں کی ریٹنگ سفید اور سبز رنگ۔ امتیاز والے مسندانی بندوقوں سے چابی گئی تھیں۔ استقبال کو بڑے بڑے قہقروں سے مزین یا پڑتے۔ امداد وارنگ دیو کی روشنی میں نہا پاندلی ہمیں رہا تھا۔ رنگ برساتی روشنیاں رانی کٹش شادی کا سال پیش کر رہی تھی۔ الامتک، میکوریشن میں نور، دیگر انتظامات کا جائزہ دیتے ہوئے سامعہ احمد خود کمانی کے سے انداز میں گویا ہوئیں۔

”ہر چیز بہت عمدگی سے بنوائی ہے روحیل نے۔“ ان کی توصیفی نگاہیں ہر سو جائزہ لے رہی تھیں۔

☆☆☆.....

”آج تو میں بہت تھک گئی ہوں۔“ کریم کا مساج چہرے پر کرتے ہوئے سامعہ احمد نے کہا۔ پارٹی تقریباً نصف شب کو اختتام پزیر ہوئی۔ حاضری میں کٹش نے سامعہ احمد کے انتظامات کو بہت سراہا۔ وہ بہت خوش تھیں۔

”سامعہ! تمہیں معلوم ہے اس پارٹی پر کتنے اخراجات آئے ہیں؟“ سامعہ احمد کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے روحیل احمد نے اگلی بات

کی۔

”جتنے بھی آئے ہوں مجھے اس کی پروا نہیں۔“ انہوں نے بے پروائی سے کندھے جھٹکے۔

”سامعہ میرے خیال میں اتنی فضول خرچی ٹھیک نہیں۔ آج کے دور میں پیسہ کتنا بہت مشکل ہے اور یہ بلا وجہ کی پارٹی بھلا کیا تک جتی تھی؟ محض اپنی دھواک بٹھانے کے لیے اتنا خرچ کر دیا؟ ساڑھے چار کھدہ خرچ ایک ہی جھٹکے میں کرنا دیکھ سب ٹھیک نہیں ہے۔“ روحیل کا انداز تشریف تھا۔

”تو کیا ہوا؟ آج سے پہلے تو تمہیں بھی اتنی فکر نہیں ہوئی اور کہاں فضول خرچ کرتی ہوں میں؟ سو مانی میں ہمارا نام ہے اور اس کے لیے اندلی پارٹیز تو بہت ضروری ہیں۔ تمہارا سائیڈ بزنس ہے جو اپنا خاصا چل رہا ہے۔“ فیس سے بھی اچھی ناہمی مدنی ہو جاتی ہے پھر مسندے یا ہے؟“ وہ تنک کر دی لیں۔“ دربار اب نئے دیانت داری کا سبق پڑھانے مت بیٹھ جانا۔ صرف تمہارا شعبہ ہی بد عنوان نہیں ہے۔ ہر شعبہ ہائے زندگی میں بد عنوانی ہو رہی ہے اور لوگ اسے اپنا حق سمجھ کر وصول کرتے ہیں۔ دیانت داری سے پیٹ نہیں بھر جا سکتا یہ باتیں کتابوں میں ہی اچھی لکھی ہیں۔ اب نکتہ نیند آرہی ہے۔ جو بھی باتیں باقی ہیں انہیں آج تک کے لیے منوی کر دو۔ میں سونا چاہتی ہوں۔ اوکے گڈ نائٹ۔“

انہوں نے لائٹ بند کر دی اور بیڈ پر دراز ہو گئیں۔ لیکن روحیل احمد ابھی تک کسی سوچ میں غلطاں تھے۔ روحیل احمد کا سائیڈ بزنس انویسٹ منٹ ٹرسٹ یونٹ تھا جس میں غریبوں کو امدادی قرضے فراہم کیے جاتے تھے۔ ظاہری طور پر امدادی ادارہ تھا مگر اندرونی طور پر رشوت ستانی اور سود کا

بازار سرگرم رہتا۔ ضرورت مند افراد اپنی ضرورت کے مطابق قرضے کی رقم لے جاتے اور جب تک مقررہ رقم واپس نہیں آتا تب تک مابائد سود ادا کرتے رہتے۔ اس کے علاوہ سیلز اور پروموشن مینوں میں چیف ایگزیکٹو کے عہدے پر فائز تھے لیکن وہاں کے حصول کی جنگ میں روحیل احمد بھی بد عنوانی کے مرتکب تھے۔

زندگی آسائش اور تعیشات سے بھرپور ہونے سے باوجود ذاتی آسودگی اور دلی سکون میسر نہ تھا۔ اضطراب بے چینی ان کے اندر پنجے گاڑے بیٹھی تھی۔ ان کی شریک سفر کو آگے سے آگے بڑھنے اور خوب سے خوب تر پانے کی جستجو تھی۔ وہ اپنی آسودہ زندگی سے بھنہ میں اس قدر ڈوب گئیں کہ کسی دوسری سمت دیکھنے کی فرصت ہی نہ ملتی تھی۔ ان کے ہم سفر کی حیثیت سامعہ احمد کے نزدیک ایک آلٹو میڈ ٹیلر مشین کی طرح تھی جس کا بوقت ضرورت پن کو ڈاؤل کیا اور پیسے نکلوا لیے۔

روحیل احمد نے ایک مشکل سی نگاہ پہلو میں دراز وجود پروڈالی اور اذیت سے آنکھیں موند کر زبردستی سونے کی کوشش کرنے لگے۔

”کیا ہمارے رشتے میں پیسے کے علاوہ اور کسی چیز کی نجاش نہیں..... کیا ہمارا رشتہ چند کاغذ کے ٹکڑوں کا محتاج ہے؟ بتاؤ سامعہ.....؟“ ان کے دل کی آواز آہ بن کر سوال کر رہی تھی لیکن ماحول پر طاری ہیبت ناکی سنائے میں ہی دم توڑ گئی۔

☆☆☆.....

”یہ کیا ہے؟ تم یہاں الان میں کیا کر رہے ہو؟ اور یہ ہاتھ مٹی میں کیوں اٹے ہوئے ہیں.....؟“ سامعہ احمد نے اچھا خاصا ڈانٹ کر اسود سے پوچھ اور پھر کہا۔

”اسود! فوری اندر جاؤ اور ہاتھ دھوؤ۔“

”مما! میں تو پودے کا رہا ہوں۔“ اسود نے معصومیت سے توجہ بہ پیش کی۔

”چو اندر جو میں نے کہا ہے اس پر عمل کرو۔“ اسے بازو سے کھینچ کر اندر کی طرف بڑھائیں۔ اسود احمد چوہوں کی بیماری میں مالی کے بیٹے کے ساتھ کھیل میں منہمک تھا۔ ہائی کلاس کی نون یہ حرکتیں اور ملازموں سے دوڑتی پیتے برداشت کر سکتی تھیں۔ سو فوراً آدمکیں اور اب اسود احمد پر چلا رہی تھیں۔

”کیا ہوا سامعہ؟ کیوں اسود کو ڈانٹ رہی ہو؟“ دیکھا آپ نے کیا حال بنا رکھا ہے اس نے اپنا۔۔۔؟ آپ کو معلوم ہے مالی کے بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ کیسی باتیں سکھاتے ہوں گے وہ معصوم بچے کو۔ نفرت ہے مجھے ان جیسے غریب لوگوں سے۔“ سامعہ احمد نے نخوت سے ناک چڑھائی۔

”مما! یہ غریب دولت انسان نہیں ہوتے۔“ اسود احمد ہاتھ دھو کر آچکا تھا اور شیدیاں کی گٹھ بندھی سن کر چکا تھا۔ اچانک آکر جو اسود احمد نے سواں کیا تو سامعہ احمد لا جواب ہو کر رہ گئیں۔ سوال اس قدر غیر متوقع تھا کہ وہ شپٹا گئی تھیں۔

”کیوں نہیں۔ وہ بھی انسان ہوتے ہیں اور بہت اچھے نیک انسان ہوتے ہیں۔“ اسود احمد کے گال پر بوسہ دیتے ہوئے روحیل احمد نے اسے گود میں بٹھالیا اور بات سنبھالی۔

”پاپا! یہ سنا کیا ہوتا ہے؟“ اسود نے معصومیت سے پوچھا۔

چند لمحے خاموشی کے اندر رہے۔ روحیل احمد مال میں نجانے کیوں گھبراہٹ سی محسوس کر رہے تھے

جب کہ سامعہ پہلو بدل کر رہ گئیں۔

”پاپا بتائیں نا! کیا میں نے کوئی مشکل بات کی ہے۔؟“ اسود احمد نے ہمدردی سے کہا۔

”اسود بیٹا! اگر ہم کی تو پیسے قریش کے طور پر دیں اور اصل رقم کے علاوہ کچھ زائد رقم بھی وصول کریں تو یہ زائد رقم سود کمالی ہے۔“ انہوں نے آسمان انھماں میں اسے سمجھانا چاہا۔

”پاپا! وہ سبب (مالی کا بیٹا) کہہ رہا تھا کہ سود اسلام میں حرام ہے۔“

”ہاں بیٹا! وہ بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا۔“ انہوں نے دیا تسلی کی

”اور پاپا! وہ یہ بھی کہہ رہا تھا کہ آپ سود کا کاروبار کرتے ہیں لیکن پاپا سود تو بری چیز ہے اس سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں۔“ وہ بڑے بھولے پن سے روحیل احمد سے پوچھ رہا تھا اور روحیل احمد نے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بیٹے کو کیسے مطمئن کریں۔ سامعہ احمد بھی خاموش تھیں وہ تو کبھی والدین کا حق لینے کے رہے تھے۔

”اسود! اسود! انھوں کی باتیں بند کرو۔ اپنے کمرے میں جاؤ اور جا کر بوسہ دے کر۔“ سامعہ احمد نے ورثی سے اسے ڈانٹ کر بھگا دیا۔ اس نے گفتگو نے سامعہ احمد کے صبر کا پیمانہ لبریز کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ بے ساختہ بول آئیں۔

”سنی آپ نے اسود کی باتیں؟ یہ لوگ ہمارا مال کھاتے ہیں اور ہماری ہی جڑیں کاٹنے کے درپے ہیں۔ سمجھتے کیا ہیں اپنے آپ کو؟ میں تو آج ہی گھر بابا (مالی) کا حساب چکرا کر رہی ہوں۔ نجانے اور کیا اول فول باتیں کی ہوں گی میرے معصوم بیٹے سے۔ ان لوگوں کو ذرا اہمیت کیادے دو اپنی اوقات بھولنے لگتے ہیں۔“ انہوں نے غر سے سر جھکا

سامعہ احمد کا غصہ ساتویں آسمان کو چھو رہا تھا۔

”سامعہ! اس میں کچھ غلط بھی تو نہیں جو کچھ ہماری موسائلی اسود کو سکھا رہی ہے اسے اس سب کی ضرورت نہیں۔ دوسروں کو حقیر سمجھنا خود کو بلند ثابت کرنا یہ سب کیا ہے۔۔۔؟ یہ اس کی تربیت نہیں۔

پتھر پائیں ضروری ہوتی ہیں جن کا حلقہ روتوں کی پائینگی اور کردار کی پختگی سے ہوتا ہے۔ رواداری یا سہ رخی محبت مانا خلوص اعتبار و مروت اور ان کے لیے یہ چیزیں مارت سے کہیں زیادہ ضروری ہوتی ہیں۔ اور یہ اصول اسے زندگی میں آپس نہیں نکلتے نہیں۔ ان کے۔ ان کا انداز اتنی خیر پر سوچ کر دیکھنا۔

تو کیا مطلب ہے آپ کا اہم نہ ہیں؟ ایک بچے کے لیے اپنی رواداری سے دنیا کا ہر ماں باپ خوشی خریدنا چاہتا ہے۔ اس کی خواہشات کو پاپے تکمیل تک پہنچانا چاہتا ہے اگر ہم اس قابل ہیں تو اس میں پراہم کیا ہے۔ یہ سب کچھ اسود کی آئندہ زندگی کے لیے ہی تو ہے تاکہ مستقبل میں اپنے قدم جمانے کے لیے اسے زیادہ محنت نہ کرنی پڑے۔“ ان کی بات سن کر سامعہ کو گویا پتنگے لگ گئے تھے۔

”اوہو پلیرز ہمیشہ مجھے محبت رواداری اور جو کچھ بھی ہے ان سب کا لیکچر مت دیا کریں۔ یہ الفاظ صرف کتابوں میں ہی اچھے لگتے ہیں۔ حقیقی زندگی میں ان کی کوئی حقیقت نہیں۔ دولت ایسا پتا ہے جس سے ہر جنگ جیتی جاسکتی ہے۔ دنیا کی ہر چیز خریدی جاسکتی ہے۔“

روحیل احمد تو پہلے ہی مضحل اور بے چین تھے۔ آفس میں آڈٹ ہو رہا تھا۔ ان کے نام لاکھوں روپے کا غبن کھلنے کا خدشہ تھا جو انہوں نے پچھلے برسوں سے کیا تھا۔ وہ مزید بحث کے موڈ میں

نہیں تھے۔ سامعہ احمد بھی مزید کسی جواب کا انتظار کیے بغیر کھٹ کھٹ کرتی اوپری منزل کو جاتی میڑھیاں چڑھ گئیں۔

درد کی شدت سے سر پھٹا جا رہا تھا۔ آفس میں جو بے عزتی کے طعنے سننے کو ملے تھے۔ ان طعتوں نے روحیل احمد جیسے مضبوط انسان کے اعصاب کو بھی جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ برسوں میں کمائی گئی عزت لمحوں میں خاکستہ ہو گئی۔ کنپٹیاں مسلتے ہوئے غصہ اب کے نام میں وہ لاؤنج میں ہی صوفے پر ٹک کے۔ ان کے نام لاکھوں روپے کا غبن لگا تھا۔ روحیل احمد کا نہ صرف جاب سے فارغ کر دیا تھا بلکہ سولہ دن کے اندر کمپنی کی مقررہ رقم جمع کروانے کا آرڈر بھی جاری کر دیا گیا۔ وہ جتنا اس واقعے کے متعلق سوچتے اتنا ہی اذیت کا احساس دوچند ہو جاتا۔

اتنے میں سامعہ احمد بھی چلی آئیں۔ ان کا چہرہ بے جان اور آواز پوخر رہ گئی۔ پانی کی ہانک لگا کر وہ وہیں فلور کشن پر بیٹھ گئیں جہاں اسود احمد بڑے زور سے رات بجات کیا پڑھنے میں مصروف تھا۔ اگر کوئی

دراست ہوتا تو وہ یقیناً اسے یہ کہہ کر بھیڑ پاتا۔ تھیں۔ ”اسود تمہیں پتہ ہے۔ مجھے راتے بازی سے نفرت ہے۔ کتنی بار کہا کہ ہر چیز کو سمجھ کر پڑھا کرو۔“ مگر آج حالات مختلف تھے۔ ان کی پیشانی شکن آلود تھی اور سوچیں منتشر۔۔۔۔۔ آج پارٹی میں جوان کے ساتھ ہوا اس سے سامعہ احمد کے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔ مسز کمال کے سترہ سالہ بیٹے نے انہیں پر پوز کر دیا یہ بانٹے ہوئے کہ وہ اس کے پاپا کے دوست کی بیوی ہیں۔ اس کی ماں کی جگہ ہیں بلاشبہ سامعہ احمد حسین تھیں۔ وہ انیس کے لگ بھگ

تھیں مگر اپنی عمر سے مہربانی دیتی تھیں لیکن پھر بھی ہر رشتے کی ایک حد ہوتی ہے اور اتنی گھٹیا سوچ..... ان کے قدم وہیں زمین میں گڑ گئے۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس بدتمیز لڑکے کی طرف دیکھ رہی تھیں جو بے باک الفاظ میں ان کی خوب صورتی پر تبصرہ کر رہا تھا۔

”یہ ہماری سوسائٹی اور یہ تربیت ہے ہمارے معاشرے کی۔“ ایک لڑکے میں یہ سوچ ان کے دماغ میں کوندی۔

”جو کچھ ہماری سوسائٹی اسود کو سکھا رہی ہے۔ اس نے سب کی ضرورت نہیں ہے۔“ روحیل احمد کی پسندیدہ بات تھی۔ ”ان کی نگاہوں میں گوئی۔ ان کی نگاہیں بے ساختہ ہی اسود احمد کی جانب اٹھ گئیں۔

”اگر اسود نے عالم شباب میں کوئی ایسی حرکت کی تو..... نہیں نہیں..... ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔“ یہ سوچ کر ہی انہیں پھر جھرجھری سی آنے لگی۔

کہنے کو تین نفوس لاؤنج میں موجود تھیں مگر زندگی کا احساس اسود احمد کی تمام زبان سے ادا ہونے والے الفاظ سے ہو رہا تھا۔ وہ بہت ذہین بچہ تھا اور ہر بات بہت جلدی سیکھ رہا تھا۔ روحیل احمد تو اکثر اس کی ذہانت کے معترف دکھائی دیتے تھے مگر کبھی کبھی اس کے مدبرانہ سوالات انہیں زچ کر آتے۔

”جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ قیامت کے دن قبروں سے اس طرح اٹھیں گے جیسے انہیں شیطان کے لمس نے مجھوٹا ہوا بنا دیا ہو۔“

الفاظ تھے یا اٹھم بم.....! دل و دماغ کو چیرتے ہوئے رگ و پے میں سریت کرتے ہوئے اللہ کی روح کو جھنجھوڑتے سماعتوں کو جھنجھٹاتے ہوئے

الفاظ۔ روحیل احمد نے دروسے مندی آنکھیں پٹ سے کھول دیں۔

”رشوت دینے والا اور رشوت لینے والا دونوں ہی جہنم کی آگ کا ایندھن ہیں۔“ روحیل احمد ابھی پہلی آیت کے ترجمے کے اثر سے باہر نہ نکل پائے تھے کہ اسود احمد نے ایک اور آیت کا ترجمہ پڑھ کر انہیں آئینہ دکھایا اور آگہی کا درو کیا۔ روحیل احمد کا دل یکبارگی دھڑکا اور سانس تیز تیز چلنے لگی۔ ان کا روم روم باعث خوف و ندامت کانپ رہا تھا۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور ہونٹ لرز رہے تھے۔ سامعہ احمد کی حالت بھی کچھ اچھی نہ تھی۔

خدا کی پاک بابرکت اور روشن آیات کے تراجم کے الفاظ لاؤنج میں گونج رہے تھے۔ جن کا حرف حرف صراحت مستقیم اور ہدایت کا پیام تھا۔ انسانی زندگی کے ہر پہلو کی تفسیر تھی۔

”نیک بیبیاں انعت شعار ہوتی ہیں اور شہرہ کی مدد سے جو کوئی میں ان کے حقوق کی حفاظت کرتی ہیں۔“ سامعہ احمد نے برق رفتاری سے اسود احمد کو بازوؤں میں گھس لیا۔

”بس کرو اسود! بس کرو بیٹے! ہمیں ندامت کی دلدل میں مت پھینکو۔ ہمیں مزید ذلیل و شرمندہ مت کرو۔ میں نے اپنا دائرہ کار سمجھ لیا ہے۔ یہاں چکا چوندر روشنی میں میری آنکھیں چمک رہی ہیں اور روشنی اتنی بڑھ گئی کہ سب کچھ اس روشنی کے پیر بردار ہو گیا۔ حتیٰ کہ ہر چیز دھندلا گئی اور میری آنکھیں بھی بے نور ہو گئیں۔ میں نے مادیت پرستی اور نمود و نمائش کو مقصدِ حیات بنا لیا۔ میں اس ذات کو بھول گئی جو ہر چیز پر قادر ہے۔ یا الہی! معاف کر۔ مجھے معاف کر۔ میں اصل راہ سے بھٹ گئی تھی۔ یہ میرے خالق مجھے معاف کر۔“

نادم و شرمندہ تھیں اور گڑگڑا رہی تھیں جب کہ اسود احمد ہکا بکا ماں کی صورت دیکھ رہا تھا۔ اس کا معصوم ذہن یہ سب سمجھنے سے قاصر تھا۔

”اسود! جو راستہ تم نے آج ہمیں دکھایا ہے یہ سب تمہیں سکھانا ہماری ذمہ داری تھی۔ ہم نے خود کو اسلامی تعلیمات سے دور کر کے محض بے عزتی اور ذلت کا سودا کیا ہے۔ خود کو جہنم کی آگ کا ایندھن بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔“ روحیل احمد نے اسود احمد کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے گلویر لبتے میں کہا۔ ان کی آنکھوں سے اشک رواں تھا جب کہ روم روم ندامت و شرمندگی کی تصویر بنا تھا۔ ان کا دل خدا کے حضور گنہ گروں کی معافی کا خواستگار تھا۔ اسود احمد پریشان نگاہوں سے والدین کو دیکھ رہا تھا۔

”پاپا! آپ کو..... دادا اور دادی نے ڈانٹا ہے؟ اس لیے آپ رورہے ہیں.....“ اس نے معصومیت اور پریشانی کے ملے جلے تاثرات سے کہا۔

”ہاں بیٹا! بہت ڈانٹا ہے۔“ بالکل ویسے ہی جیسے آپ مجھے ڈانٹتے ہیں؟“ ”ہاں بیٹا! بالکل ویسے ہی۔“ روحیل احمد نے محبت سے اس کے بال سنوارے۔

”لیکن آپ تو کہتے ہیں کہ می پاپا تو تب ڈانٹتے ہیں جب بچے غلطی کرتے ہیں.....“ فوراً اگلا سوال لیا۔

”ہاں جانے انجانے میں ہم سے بہت بڑی غلطی سرزد ہو گئی۔“ روحیل احمد نے پر غم آنکھوں سے جواب دیا اور ایک بار پھر اسے خود سے لگا لیا۔

یہ سچ ہے کہ انسان ٹھوکر کھا کر سنبھلتا ہے۔ روحیل احمد اور سامعہ احمد کو بھی ٹھوکر لگی تھی مگر اتنی شدید بھی نہ تھی کہ سنبھلنا ممکن نہ ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو

شعور آگہی بخشا ہے۔ نیکی و بدی، خیر و شر، اچھے اور برے میں امتیاز کرنے کے لیے عقل کا دیا عطا کیا ہے مگر بعض اوقات طمع خام میں ڈوب کر انسان گناہوں کا مرتکب ہو جاتا ہے۔ یہ دنیا امتحان گاہ ہے۔ گناہوں کی آماج گاہ ہے۔ انسان امتحان کو تو بھول جاتا ہے لیکن گناہوں کو اپنا اوڑھنا اور پچھونا بنا کر ڈھکائی ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسے میں خدا اپنے بندوں کی واپسی کے لیے تدبیر کرتا ہے۔ انہیں آزمائش میں ڈالتا ہے اور اس آزمائش سے نکل کر انسان پھر سے کندان بن جاتا ہے۔

روحیل احمد پر بڑی آزمائش تھی اور شاید سنا ہوں کی تلافی کا موجب بھی اور وہ ذاتِ باری تعالیٰ تو برحق ہے بے نیاز ہے۔ بچے دل سے یہی دعا کرتے والوں۔ معافی طلب کرنے والوں کو وہ معاف کر دیتا ہے۔ یہ وہ تو قادر مطلق ہے وہ ہر شے پر قادر ہے۔ خدا نے سامعہ احمد اور روحیل احمد کو آئینی کا ایک لمحہ عطا کیا جسے انہوں نے پالیا۔

رشوت اور سود جیسی لعن طعن کی ہوئی چیزوں کے پھندے میں ہمارا معاشرہ بری طرح پھنسا ہوا ہے اور دولت جیسی آزمائش سے مالا مال ہونے کے لیے گناہوں کی کھائی میں اندھا دھند سفر کر رہا ہے۔ ہم مسلمانوں کا قوم اور ملک کی ترقی کے لیے ایمان داری جیسے سنہری اصولوں پر کاربند ہونا ضروری ہے تب ہی ایک مسلم معاشرہ ترقی یافتہ اور تہذیب یافتہ کہلایا جاسکتا ہے۔ مجھے تو یہی لگتا ہے آپ کا کیا خیال ہے.....؟

پیشانی

نہایتِ دل

جو یہ سلیم

انتہا کوئی نہیں ہے ابتدا ہونے کے بعد
عشق کیا ہے جان لو گے بتلا ہونے کے بعد
بس اسی امید پر پیش فنا خاموش ہیں
اک جہاں تعمیر ہوگا سب فنا ہونے کے بعد

”میرنی می آگئی ہیں۔“ وہ اپنے معصوم لب و
کے آنکھوں میں خوشیوں کا بے پایاں احساس لیے
بول رہا تھا۔

”بے وقوف.....!“ راشد جوان کے گروپ
میں عمر میں سب سے بڑا تھا اور آنکھوں کلاس کا
طالب علم تھا ہنسنا۔

”تیس جوت تو نہیں کہہ رہا۔ میری ممانتی
پیاری ہیں سچ!“ بلال کسی طور اپنے جذبات ان پر
عیاں کرنا چاہتا تھا مگر اسے اس میں کامیابی نہیں ہو
رہی تھی۔ ویسے بھی وہ عمر میں سب سے چھوٹا تھا۔

اس لیے راشد روزی اور نوید اس سے میٹھی میٹھی
باتیں کر کے اس کی چیزوں پر ہاتھ صاف کر لیا
کرتے۔ اسکول میں اور کسی سے اس کی جان
پہچان بھی نہیں تھی۔ وہ ان تینوں سے بڑا مرعوب بھی
تھا۔ وہ باتیں ہی ایسی کیا کرتے اسی لیے تو وہ آج
خوشی خوشی ان کے پاس دوڑا چلا آیا تھا۔

”تم بھی عجیب بچے ہو تمہیں تو کچھ بھی معلوم
نہیں.....!“ راشد نے اس کے ننھے شانوں پر
ہاتھ رکھ دیا تو وہ اپنی لمبی لمبی پلکیں جھپکا کر اسے

دیکھنے لگا۔ ”وہ تمہاری سوتیلی ماں ہے۔“ راشد نے
کہا۔

”سوتیلی ماں کیا ہوتی ہے؟“ بلا خراس نے سہم
کر پوچھا۔

”لو بھئی؟“ راشد نے مسخرے سے اسے دیکھا۔
روزی نے چیونٹے کا کاند پھڑکڑھٹے ہوئے کہا۔

”کس قدر پاگل ہے۔“
بلال و شرمندگی نے گھیر لیا تھا مگر وہ پھر بھی ہاتھی
انداز میں ان سب کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھ رہا
تھا۔

”بتا دو نا!“

”بھئی سوتیلی ماں بڑی ظالم ہوتی ہے وہ بچوں
کو مارتی ہے۔ بس یوں سمجھ لو وہ جو اس دن میں نے
تمہیں ایک چڑیل کی کہانی سنائی تھی نا! بالکل
ویسی!“

”نہیں.....!“ بلال ڈر کر کئی قدم پیچھے ہٹ
گیا۔ اس کی ساری خوشی لمحہ بھر میں کا نور ہو گئی تھی۔

”خود ہی کچھ دنوں میں پتلا لگ جائے گا۔“ نوید
نے بے پروائی سے کہا۔ کیونکہ کھٹنی بج چکی تھی۔ وہ

آگے بڑھ گیا۔

☆ / □ / ☆

”دہن بنت ہی ایک بچے کی ماں بن گئیں! واہ! مس غزل؟؟؟ اپنے کالج کی بہترین طالبہ اور مقررہ! اپنی ہی زندگی کے سب سے اہم فیصلے پر سارے اہل دھرم رہ گئے اور اسے بالکل روایتی ترکیبوں کی طرح ماں باپ کا فیصلہ قبول کرنا پڑا۔ والدین بھی بعض اوقات گنتا مجبور کر دیتے ہیں۔ گردی شادی ایک بچے کے باپ کے ساتھ۔ اس کی ساری امینگوں کا ستیاناس ہو گیا۔

”آپ کیا سوچ رہی ہیں؟“ ایک نرم آواز نے اس کے خیالات کا تسلسل توڑ دیا۔ اس نے بے خیالی میں سر جھکا کر اپنی طرف نگاہ کی تو صورت حال سمجھ میں آئی۔ سامنے اس کے شوہر علی نواز موجود تھا، وہ کھاتی۔ ”اچھے خاصے شریف آدمی تو ہیں بس ایک بچے کی تھ“ اس نے ٹھنڈی سانس لی۔

”کوئی الجھن؟“ انہوں نے پھر پوچھا۔

”ہی نہیں تو! اس کا سہرا کا ہوا تھا۔

”آپ نے سہرا پورا کھد تو نہیں دیکھا؟“

”ابھی نہیں!۔“

”تو چلیے اب اس گھر کے در و دیوار سے بھی آپ کا تعارف کر لیا جائے کیا خیال ہے؟“ وہ اشیات میں سر ہل کر اپنا بھاری بھاری سنبھال لی ہوئی آنکھیں تو کمانیوں میں چوڑیاں کھٹک گئیں۔

”عورت کا وجود بذات خود ایک موسیقی ہے۔“ علی نواز نے اتنے پسندیدہ کی سے دیکھا۔ یا شبہ وہ اچھے رنگ و روپ کی مالک تھی۔ ان کی اس بات نے اس کے رخساروں پر رنگ بکھیر دیے۔

☆ / □ / ☆

”اپنی ہی سگی بیٹی کے ساتھ ایسی زیادتی!“ اس کی پھوپھو نے نمازی چوکی پر بیٹھی رضیہا پاسے کہا۔ ”غضب خدا کا! اس کے لیے کوئی رشتوں کی کمی تھی؟“

”جہاں اس کی قسمت لکھی تھی وہاں ہو گیا۔“ رضیہہ نے دعا پوری کر کے جائے نماز کو تہہ کیا اور سامنے کرسی پر جا بیٹھیں۔

”کیسا بے جوڑ رشتہ؟“ پھوپھو نے آتی دانتوں سے داب لی۔

”علی نواز ایک بچے کا باپ ہونے کے باوجود بھی کم عمر ہے۔ متین اور سلیجے ہوئے مزاج کا حامل ہے۔ اچھے زمین زمین اور بہترین سردار کا مالک ہے یہ نہیں

”وہ تو ہے۔“ انہیں ہن پڑا۔

”پھر بے جوڑ کیسے؟“ صرف اس لیے کہ اس کی بچی بیوی کا انتقال ہو گیا اور ایک بچہ اس کی ذمہ داری ہے؟ یہ تو کوئی مقول وجہ نہ ہوئی۔ سیم و سیم سہارا دینا تو سب سے بڑی تلی ہے۔ رضیہہ آ پائے رسائی سے کہا۔

”سینی یا بچی کے لیے کڑی آزمائش پھوپھو بکھر گئیں۔

”دنیا آزمائش کا گھر ہے پھر غزل کو ہم نے دی تاکہ وہ اچھے اور برے میں تمیز کر سکے۔ اب اعمال پر کھ سکے جو برا فرض تھا ہم نے پورا کر دیا اب آگے اس کا فرض اور ذمہ داری ہے۔“

”بھئی ہم تو بس انسان ہیں۔ خطا والے۔ تپے! تمہاری طرح ولی نہیں اپنی اکلوتی لڑکی پر ظلم! بامے میری چھوٹوں کی غزل!“ پھوپھو اپنا دوپٹا آنکھوں پر رکھ لیا۔

☆ / □ / ☆

کھانے کی میز پر چچوں کی آواز کے علاوہ اور کوئی آواز نہ تھی۔ غزل غور سے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے بچے کو دیکھ رہی تھی۔ دبلا پتلا، محسوم چہرے پر بے حد بڑی بڑی آنکھوں والی بچہ سہا سہا سنا ہوا بیٹھا تھا۔ اس نے ایک بار بھی آنکھ اٹھا کر اس کی طرف نہیں دیکھا۔ بہت چھوٹے چھوٹے لقمے لیے کر کھانا کھا رہا تھا۔ وہ جب سے اس گھر میں آئی تھی وہاں سے اس سے بات نہیں کی تھی۔ اُس وہ بھی اس کی طرف دیکھ لیتا تو اس کے چہرے پر ایک ناقابل فہم تاثر ابھرتا۔ جس پر غزل نے بھی غور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ یہ بچہ بھی بھی اس کے لیے اہم نہیں رہا تھا۔ حالانکہ اس گھر میں آتے ہی علی نے واضح طور پر اس سے کہہ دیا تھا کہ انہوں نے دوسری شادی محض ہلال کی وجہ سے کی ہے کیونکہ وہ اپنی دفتری مصروفیات کی وجہ سے کھڑے بہت کم وقت دے پاتے ہیں۔ اس لیے عدم توازن کی باعث وہ ان بچوں کی نسبت بہت مختلف ثابت ہو رہا ہے۔ بہت کم ذمہ داری آپ میں گم اور ویسے بھی بچہ باپ کی نسبت ماں سے زیادہ قریب ہوتا ہے کیونکہ دوستوں کی طرح رہنے کے باوجود بھی بچے باپ کا احترام کرتے ہیں جب کہ ماں کے ساتھ ان کا پیر اور دوستی طویل ہوئی ہے۔ اس لیے وہ اپنی بہت سی باتیں ماں سے کہہ دیتے ہیں۔ ماں کی جدائی بچے کی شخصیت کو توڑ پھوڑ کر رہ دیتی ہے۔ یہ ساری باتیں غزل نے سر جھکا کر بڑی سہم تو جہ سے سنی تھیں۔ پھر شادی کی رات کون دہن ایسی باتیں سن کر خوش ہوئی ہوگی۔ سہانے سپنوں میں کوئی دہن انجانے دیس کی سیر کر رہی ہوئی ہے۔ ایسے میں کسی بچے کا ذکر! بھلا اس سے زیادہ بھی غیر رومانوی کوئی بات ہو سکتی ہے۔ اس لیے بالکل غیر محسوس

”کل صبح میں دفتر کے کام سے اسلام آباد جا رہا ہوں۔ آتے وقت بلال کا کسی ہوسٹل میں بندوبست کرتا آؤں گا۔ جب تمہیں اچھا ہی نہیں لگتا تو وہ کیوں یہاں رہے۔“ اس کی آواز میں ایک باپ کا دکھ پنہاں تھا۔ غزل کے ہونٹ کچھ کہنے کے لیے کانٹے ٹرٹی اس وقت کمرے سے باہر جچکا تھا۔

علی کو گئے دوسرا دن تھا۔ غزل کچھ بے چین سی تھی۔ پھر اسے بخار نے آیا۔ ڈاکٹر نے گھر آ کر دیکھ کر اسے انجکشن لگا دیا تھا۔ غزل کو تنہائی سے وحشت سی ہو رہی تھی۔

”توبہ کتنا سنا ہے پورے گھر میں.....!“

چیراں بھی اسے دودھ پلا کر جا چکی تھی۔ مگر غزل کو کسی طرح نیند نہ آ رہی تھی۔ بڑی مشکل سے آنکھ لگی تو عجیب عجیب خواب نظر آنے لگے۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کا بدن پسینے سے شرابور تھا۔ حلق میں پیاس کے مارے کانٹے چبھ رہے تھے۔ قریب میز پر خالی جگہ اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ زیر و برب کی روشنی کے باوجود بھی اسے اچھی طرح نظر آ گیا کہ کمرے میں وہ اکیلی ہے۔ کمزوری درنتہا ہی اتنی تھی کہ وہ اٹھ نہ پائی مگر پیاس کی شدت لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ ہمت کر کے اٹھی تو اس کی انگلیں لرز رہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ گر پڑتی اس نے پاس رکھی میز کا سہارا لے لیا۔ پھر وہ دیر سے دھیرے چلتی ہوئی کمرے سے باہر نکل آئی۔ بلال کے کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔

”تنی رات کے یہ وہ جاگ رہا ہے؟“ تجسس اسے کشاں کشاں اس کی کمرے کی طرف لے گیا۔ وہاں وہ اتنی ہی نہیں تھی۔ کئی چیزوں سے جا کمراسا منے پتائی پر اسے پانی نظر آ گیا۔ وہیں کرسی پر بیٹھ کر اس نے پانی پیا۔ یہ بلال کی رائٹنگ ٹیبل

تھی۔ اس کی نظریں کتابوں پر سے پھسلتی ہوئی ایک چھوٹی سی ڈائری پر جا ٹھہریں۔ اس نے وہ ڈائری اٹھالی۔ پہلا صفحہ کھولا۔ تاریخ ڈالے بغیر کچھ بے ترتیب جملے لکھے ہوئے تھے۔

”امی آگئی ہیں میری ساری دعائیں پوری ہو گئیں۔“

”بہت ہی پیاری ہیں۔“ غزل نے دوسرا صفحہ پلایا۔

”نوید کہتا ہے سوتیلی ماں خالہ ہوتی ہے۔ میری امی تو ایسی نہیں لگتیں۔“

”جھوٹ بولتا ہے نوید!“ تیسرے صفحے پر تحریر تھا۔

”آج میں نے امی کی آواز سنی۔ کتنی اچھی ہے کاش وہ مجھ سے بھی بات کرتیں۔“ آگے تحریر تھی۔

”مکمل جاتے ہوئے امی کے کمرے سے نڈر آئے۔ ابو سے کہہ رہی تھیں کہ انہیں پھول بہت پسند ہیں۔“

”میں روزانہ ان کے کمرے میں پھول رکھتا ہوں اور دیر تک انہیں دیکھتا ہوں۔“ موتے میں لکھا تھا۔

”چوتھا ہے ان سے خوب باتیں کروں مگر نوید نہیں..... نہیں مجھے ڈر لگتا ہے۔“ اب غزل کی نظریں اگلے صفحے پر تھیں۔

”امی کو کل سے بتا رہے تھے معلوم ہے کہ میں بہت خراب ہوتا ہے۔ سر میں بھی درد ہوتا ہے۔ دل چاہتا ہے کہ امی کی ساری تکلیفیں مجھے جائیں۔ میں ان کے لیے ضرور دعا کروں گا۔“

غزل کے ضبط کی دیوار گر گئی۔ اس سے آگے اس سے پڑھا ہی نہ گیا۔ آنسوؤں نے ایک دھن چادری تان دی تھی۔ ایک مجبور معصوم سا تنہا چہرہ اس کی بے اعتنائی کا شکار ہو رہا تھا۔ انجانے میں

ظلم وہ بھی بن ماں کے بچے پر.....! بھلا اس نے غزل کا کیا بگاڑا تھا۔ وہ تو خود بھری بہار میں لٹ گیا تھا۔ ایک بے ضرر وجود فرشتوں کا روپ..... یہ میں نے کیا کیا؟“ اپنے فرض سے اتنی غفلت برتی۔ خود تو وہ دودن کی تنہائی نہیں کاٹ سکتی اور ایک نا سمجھ بچے کو تنہائی۔ دوزخ میں پھینک دیا.....! مجھ سے زیادہ ظالم کوئی عورت ہوگی۔ جو اتنا پڑھ لکھ کر روایتی سوتیلی ماں بن بیٹھی۔ جسے محبت سے جینا بھی نہ آیا۔

رواتے رواتے اس نے پٹک پر سوتے بلال پر نظر ڈالی۔ زرد ریشہ رول پر بڑی بڑی پٹلیں سایہ سن تھیں۔ وہ بے ترتیب سے سو رہا تھا۔ غزل نے اسے لف اور چایا اور دیر تک اس کے چہرے کو دیکھتی رہی۔ اس کے دل میں مامتا کا چشمہ ابل رہا تھا اور چہرے پر بھی ممتا اور عزم کا نور اٹا آیا۔

”میں ازالہ کردوں گی میرے چاند! اپنے ظلم کا اپنی بے پروائی کا کما آج سے میرا وجود تیرے لیے خوشیوں کا اور محبت کا خزانہ ہوگا۔ یہ میرا عہد ہے۔ ایک عورت کا نہیں بلکہ ایک ماں کا۔“ غزل نے جھک کر اس کی پیشانی چوم لی۔

چڑیوں کی چچہاہٹ کے ساتھ ہی بلال نے ڈرتے ڈرتے کمرے میں قدم رکھے وہ پھول مخصوص جگہ پر رکھ کر پلٹا ہی تھا کہ غزل کی آواز نے اس کے قدم جکڑ لیے۔

”روز پھول لاتے ہو خود کیوں نہیں دیتے؟“

”وہ..... میں.....!“ بلال کے چہرے پر خوف جھلکنے لگا۔ وہ اپنی جگہ پر ساکت ہو گیا۔ غزل مسکرا کر اپنی جگہ سے اٹھی اور اس کے سامنے دوزانوں بیٹھ کر بولی۔

”خود دیتے تو میں روز تمہیں ایسا پیار کرتی۔“ اس نے اس کے گالوں کو چومتے ہوئے کہا۔

”امی!“ بلال گنگ رہ گیا۔ اس کے وہم و گمان میں غزل سے اس رویے کی توقع نہ تھی۔

”کیوں امی سے دور دور رہتے تھے؟“ غزل نے اسے اپنے ساتھ مسمیٰ پر بٹھالیا۔ اس کی پیٹیں بھیک چلی تھیں۔

”مگر وہ نوید کہتا تھا کہ.....!“

”نہ کہتا تھا نوید جس طرح پھولوں کی خوشبو سب کے لیے ہوتی ہے۔ بالکل ویسے ماں بھی اپنے سارے بچوں سے پیار کرتی ہے۔ کیوں ٹھیک ہے نا۔“

”جی ہاں امی!“ بلال کے چہرے پر مسکراہٹیں پھیل گئیں اور اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ دروازے پر کھڑے امی کے نواز کے پیوں پر منتقل ہو چکی تھی۔ اس نے ساری باتیں سن لی تھیں۔ دروازے میں کھڑے کمرے سے اس نے ہوشل والا فارم پھاڑ دیا اور زندگی سے بھرپور آواز میں تالیاں بجاتے ہوئے ان دونوں کے قریب جا پہنچا جو ایک دوسرے کے گلے میں بائیں ڈالے پیاری پیاری باتیں کر رہے تھے۔

”بہت اچھے غزل جی! ویسے تو تمہارے سارے روپ ہی بہت خوب صورت ہیں مگر تمہارا یہ نیاروپ بڑا ہی دل فریب ہے۔“

غزل نے علی کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں پیار کی جوت جل رہی تھی اور سچی خوشیوں کے عکس سے اس کا چہرہ جگمگا رہا تھا۔



ہوا میں دل دکھائیں گی

سنو پائل!

کھڑے رہنے سے کیا حاصل؟

ہوا تو بس یہی ہوگا

ہوا میں دل دکھائیں گی

نگاہیں بھیگ جائیں گی

چلو اندر چلے آؤ!

سنا ہے جو بھی مرضی سے چلا جائے

کبھی واپس نہیں آتا۔

”اور وہ لوگ جو ایمان لائے ان کے دل اللہ کی یاد سے چین پاتے ہیں۔ ب شک اللہ کی یاد میں ہی دلوں کا چین ہے۔“

قسط نمبر 31

پاک کے پیکر پل

نازیہ کنول نازی

مستم عشق تھا سب اس کا ساتھ ہونے تک

خیال درد نہ آیا نجات ہونے تک

وہ اس کمال سے کھیلا تھا عشق کی بازی

میں اپنی فتح سمجھتا تھا مات ہونے تک

قرآن پاک کھلا ہوا اس کے سامنے رکھا اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے موتی ٹوٹ ٹوٹ کر اس مقدس کتاب کے پاک اوراق پر گر رہے تھے۔ سورہ ابرہہ کی بظاہر تھی چھوٹی سی آیت تھی مگر بہت گہرا مفہوم سمیٹے ہوئے تھی اپنے اندر.....!

وہ مفہوم کیا تھا؟

دلوں کے چین کی کہانی کیا تھی؟

اللہ رب العزت کی پاک ذات نے اس بظاہر چھوٹی سی آیت میں علم و حکمت کے کتنے خزانے پوشیدہ رکھے تھے؟ زندگی سے ہمارے ہوئے وہ مایوس لوگ جنہیں اس ڈگری ہولڈرز ڈاکٹرز نے جواب دے دی

تھا۔ جن کے دل بہترین ماہرین ڈائریز کے علم میں، علاج ہو چکے تھے۔ یہ آیت ان "ناکاروں" کی شان تھی۔ دوائی۔ بہت گہرے راز تھے اس آیت کے اندر۔ سمندر کی تہوں سے بھی زیادہ گہرے راز۔ جنہیں سمجھنے کے لیے بہت سمجھ کی ضرورت تھی۔

ایک ایک حرف ایک ایک لفظ حکمت سے بھر ہوا تھا اور وہ رورہی تھی۔
اپنی اعلیٰ و غفلت پر اپنی نا اہلی پر !

اس کے نزدیک وہ کتاب صرف احترام سے بہت اونچی جگہ رکھ کر سجدہ کرنے کے لیے تھی۔ یا پھر بھی بے سکونی و بے قراری اور فیصحت کے لحاظ سے ضرورت سے مل کر وہ انشاء خدا ہر آیت کے لیے۔ وہ بھی سمجھتی نہ تھی کہ اس کتاب کا حق کیا ہے؟ ایسی کیا بات ہے اس کتاب میں جو اللہ رب العزت نے اس پر اس کتاب کی قیامت تک کے انسانوں کے لیے مکمل قرار دے دیا۔ زندگی میں واقعی کچھ باتوں کی کچھ بہت دیر سے آتی ہے۔ پہلے پارے سے تیرے تیرے پارے کتاب کے سفر میں جیسے اس کی شخصیت ہی بدل گئی تھی۔ یہ نیلے سبز رنگ کے واقعات سے آگاہی ہو رہی تھی۔ کہا لیا آگاہ نہیں ہوا تھا اس پر۔

بہائی آیت دیکھتا تو شاید پہچان ہی نہ پاتا کہ وہ باتوں کی وہ گوری ہے جو بڑی اہلی تھی۔ میں مردوں، بھی مات دیں تھی۔ جسے جس تن پر چھنا آتا تھا۔ جو اپنی شادی سے لے کر جہاں کی موت تک زندگی سے۔ زرخیز تھی۔ اس خدا سے شکوے کرتی پھر رہی تھی۔ اس دن آنکھوں میں اس وقت جو آنسو تھے وہ ان آنسوؤں کی کتابوں کے آنسو تھے جو گہرے گہرے اس وقت آنکھوں میں چھبے ہوئے تھے۔ وہ رورہی تھی، اس کا دل جیسے پہو میں گھسے ہوئے تھا۔

"اے میرے مالک! میرے محبوب! تیری اے وسوسہ کشی! یہ نیلے واقعات جو تیری زبان زبانی کر رہی تھی وہی شکار کروں۔ میں تو تیرے لہروں پر پلنے والی بھکاری ہوں۔ تو مجھ کو تیرا سمرا کر، دن اور محروم کر دے تو میری کمزوری۔ جسے میری غفلت کے لیے معاف کر دے۔ مالک! شیطان مردار سے بچا کر اپنی پنہ کے دھار میں لے لے۔"

اور اس دعا کے ساتھ سکون کی لہر جیسے اس کے دل پہ میں اترتی جا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

شجاع اسپتال سے سیدھا گھر چلا آیا تھا۔ اس کی بیٹی تھی کہ امامہ کے لیے راتی راتی سوتی تھی۔ جب کہ دواؤں کی شریانیں جیسے پھٹے کو تیار ہو رہی تھیں۔ اس کا بس نہ چل رہا تھا کہ وہ ہاتھ کھاکر سو رہتا۔ اس کا زندگی میں بھی کسی عورت کی وفا نہیں پاسکتا۔

اس رات ایک مرتبہ پھر امامہ کے لیے سوچتے ہوئے اور سگتے ہوئے آجیائے بہت زیادہ سگریٹ پی تھی اس کا موبائل تاحال آف تھا۔ چونکہ رات بھی اس نے نئی سے ہدایت کر دی تھی کہ کوئی بھی ملنے کے لیے آئے اسے مہل نہ کیا جائے۔ دل اس وقت جیسے ساری دنیا سے کٹ جانے کی خواہش کر رہا تھا۔

"وہ کہاں کس حال میں ہوگی؟" یہ سوال اس کے اندر آتش فشاں بنا ہوا تھا۔
ایک کے بعد ایک سگریٹ ختم ہو رہی تھی اور اس کے ساتھ مسکے آنسوؤں کا ہوا تھا جو گلوں پر بہہ نکلتا تھا۔

"کاش میں تمہیں تمہاری سب وفا کی کی سزا دے سکتا امامہ حسن! کاش۔۔۔!" اس کے نکاح کے روز والی تھیں کہ وہ باتوں میں سے اس نے سرسرت سے سوچا تھا اور وہاں نقد پر ایک نئی کہانی رقم کرنے جا رہی تھی۔

♥ ♥

"شکر یہ ارسلان اس وقت اس وقت موقع پر نہ آتے تو جانے میرا کیا حال ہوتا۔" مرگ کنارے لگی بیٹی پر نڈھال بیٹھی وہ کہہ رہی تھی اور ارسلان کے لبوں پر یوں چپ کا قفل لگا تھا جیسے وہ کچھ بھی بولا تو اس کی ذات ہی جھٹکتی۔

کچھ لمحے یونہی خاموشی کی نذر ہو گئے تھے۔ جب وہ بولا۔
"مجھے خبر نہیں تھی کہ تم وہاں ہو یہ ہو کئی ہو چکے تھے۔ یہی طاقت کی توقع بھی نہیں تھی۔ میں تو محض اپنا سہارا بننا چاہتا تھا۔ ان لوگوں سے میرا بھرا چل رہا تھا ایک لڑکی کی وجہ سے اس لیے میں مزید وہاں ان لوگوں کے ساتھ رہنا نہیں چاہتا تھا مگر اس نے جو ہنر میں سے دیکھا اس نے یہ انہوں کو دیا۔ کاش وہ دونوں کے مرنے میں۔" وہ ابھری۔ "وہ ابھی بھی کھل رہا تھا۔"
امامہ حسن نے اس کی دلی ہوئی مثال ٹھیک کر کے کندھوں کے سر پہ لپیٹ لی۔

"وہ کتے ہیں تو تم کیا سوار سلطان۔ جو کام وہ کرتے ہیں وہی تم بھی کرتے ہو تم نے مجھ سے کہا کہ تم بے قصور ہو تم پر وہ سب جھوٹا تھا۔ مگر حقیقت میں تم بے قصور نہیں تھے۔ تم پہنچے وہاں تو میں جھوٹا نہیں تھا۔ اس تم مجھے فریب دیتے رہے۔ میری محبت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر محبتیں کروا کر رہے تھے۔"
"جائے وہاں باتوں کا فائدہ نہیں ہے۔ مجھے بتاؤ تم اب کیا چاہتی ہو میرے ساتھ چلوں گی یا اس ایس پی کے گھر چھوڑ دوں گے؟" وہ مضطرب تھا اس لیے اس کی بات کاٹتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

امامہ حسن کی آنکھیں پھر سے جلنے لگیں۔
"اس شخص کے گھر میں اب میرے لیے کوئی جگہ نہیں رہتی ہے ارسلان! مرگئی ہوں میں اس کی نظروں سے تم چیز کی دھارا اماں میں پہنچ دو مجھے۔"

"خاموش ہو جاؤ۔" اس بار وہ بار اٹھ کھڑا تھا ہنکھولوں میں وہ اس کے لیے نیکی روک رہا تھا۔ امامہ نے اس کے بعد پھر لب نہیں کھولے۔

"نی ایل ال ہم میری ایک دوست ہے گھر جا رہے ہیں۔ جہاں میرا قیام ہے۔ میں اس سے کہوں گا تم باہر سے پاکستان دیکھنے آئی ہو۔ تم بھی یہی کہنا دو گے۔" وہ اسے ہدایت کر رہا تھا۔ امامہ چپ چاپ نیکی میں بیٹھ گئی۔

"ایک بات پوچھوں ارسلان؟" پتھ لحوں کی مسافت کے بعد اس نے لب کھولے۔
"ہوں۔"

"تم ضرورت کے لیے کب تک محبت کرتے رہو گے۔"
"میں ابھی تمہارے کسی سوال کا جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں امامہ! لہذا چپ رہو پلیز۔" وہ اضطراب کا شکار تھا اور امامہ وجہ جانتی تھی ابھی اس کے جواب پر رخ کھڑکی کی طرف موڑ کر بیٹھ گئی۔ سرسیت کی

پشت گاہ سے کہتے ہی کچھ مناظر پھر ذہن کی اسکرین پر روشن ہوئے تھے اور وہ جیسے کانپ کر رہ گئی تھی۔
 ”کیا ہوتا اس وقت اگر اس کا رتبہ اس پر کرم نہ پڑتا۔“ اور وہ وقت جب اس کے حوصلے جواب دے گئے تھے۔ اس وقت ارسلان حیدر کو رحمت بنا کر اس ”نفل کاہ“ کی طرف نہ جیتا؟ ”قریب تھا کیا کہیں پھر چھٹک پڑتیں۔ اس نے جلدی سے پللیں موند لیں۔

”میں تمہیں معاف نہیں کروں گی شجاع حسن! اپنی زندگی کے اس حادثے کے لیے میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔“

♥ ♥ ♥ ♥ ♥

اس نے ڈور نیل پر ہاتھ رکھا تھا اور پھر جیسے اٹھانا بھول گیا۔
 انوشہ گھر پر نہیں تھی جمال صاحب کو ستر سے نکل کر دروازے تک آنے میں کئی منٹ لگ گئے۔
 ”السلام علیکم انکل!“

”وعلیکم السلام تو یہ تم؟“ میں سمجھ کوئی شرارتی بچہ یونہی ٹنگ کر رہا ہوگا۔ آؤ اندر آ جاؤ۔“ دروازہ کھول کر شاہ زر پر نگاہ ڈالتے ہی وہ ایک لمبے لمبے پریشان ہو گئے تھے۔ شاید بریرہ کے ہاتھوں اسی شاہ زر کے لیے انوشہ کو تپنے والی تالیف وہ اب بھی تنگ فراموش نہیں کر پاتے تھے۔ شاہ زر نے دسمالان کے خلوص پر اندر بڑھایا۔
 نزہت بیگم ادنیٰ میں شہکی تہیج پڑھ رہی تھیں۔ شاہ زر پر نگاہ پڑتے ہی ان کے چہرے کا رنگ بھی بدلا تھا۔ شاید انہیں یہ گمان نہیں تھا کہ وہ ان کی تلاش میں یہاں بھی پہنچ جائے گا۔

”السلام علیکم آنٹی۔“ وہ جھکا تھا۔ نزہت بیگم نے پریشان نگاہوں سے جمال صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ پھیر دیا۔

”وعلیکم السلام کیسے ہو بیٹا!“
 ”الحمد للہ! ٹھیک ہوں آپ کیسی ہیں۔“ مجھے بتایا بھی نہیں اور شہر چھوڑ دیا؟“ ان کے پاس بیٹھتے ہی اس نے لگے کیا۔ جواب میں وہ بے بس سی۔ نظروں کا رخ پھیر لیں۔
 ”بس مجبوری بن گئی تھی بیٹے!“

”میں شرمندہ ہوں آنٹی! میں نہیں جانتا کہ اس روز بریرہ نے انوشہ سے یہ کہا مگر اس روز جو بھی ہوا ہوگا مجھے اس کی بہت اذیت ہے۔ آپ نہیں جان سکتیں میں اس روز کے بعد کتنا آپ سیٹ رہا ہوں بہر حال میں نے بڑی کو چھوڑ دیا ہے۔“ بہت بڑی بات کو اس نے بہت روانی سے کہہ دیا تھا۔ نزہت بیگم ہنگامہ سی اس کا منہ دھستکتی رہ گئیں۔

”یہ کیا کہہ رہے ہو۔“
 ”جی ہمارا ہوں آنٹی! ہمارا اب ایک ساتھ چھنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔“
 ”مگر کیوں؟ بریرہ اچھی لڑکی ہے۔ اگر انوشہ کی وجہ سے کوئی مسئلہ ہو بھی گیا ہے تو اسے درگزر کر دو کیونکہ انوشہ کی شادی ہو گئی ہے۔“ ایک پہاڑ اس نے رایا تھا اور دوسرا نزہت بیگم نے گرا دیا۔ وہ چکرا ہی تو گیا تھا۔
 ”انوشہ کی شادی؟“

”ہاں انوشہ کی شادی! زور کا بہت اچھا دوست ہے سرمد۔ انگلینڈ میں رہتا ہے۔ ابھی تک شادی نہیں کی اس نے انوشہ کے بیٹے سے بھی بہت پیار کرتا ہے۔ اسی کے ساتھ ہو رہی ہے۔“
 ”مگر!“

”مگر کیا.....! ساری عمر گھر بٹھا کر تو نہیں رکھ سکتے اسے!“
 اس بار نزہت بیگم کے لہجے میں چٹک نہیں تھی۔ شاہ زر کو لگا اس کا دل رک جائے گا۔
 ”کیا انوشہ اس شادی سے خوش ہے؟“

”نہیں۔“ مگر جلد ہی ہو جائے گی زندگی بھر حالات سے سمجھتا ہوں تو کیا ہے اس نے اب بھی کر لے لی۔
 ہاں اس کے مزید رکنے کا جیسے کوئی جواز نہیں رہا تھا۔ مگر پھر بھی اس نے ہمت نہیں ہاری۔
 ”نئی! میں انوشہ کے لیے اپنا پڑ پوزل پیش کرنے آیا تھا۔“
 ”جانتی ہوں مگر یہ ممکن نہیں۔“

”کیوں ممکن نہیں ہے؟ میں اس کے لیے بریرہ و حسن کے حلاق، پکا ہوں۔“
 ”بہت غلط کیا تم نے اتنا بڑا قدم اٹھانے سے پہلے تمہیں ہم سے بات کر لی چاہیے تھی۔“
 ”بات ہی تو کرنے آیا ہوں آنٹی! اور غلط بھی کچھ نہیں ہوا۔ میرے اور انوشہ کے بیچ اب تک جو ہوتا رہا ہے وہ غلط تھا آنٹی! اسی غلطی کو صحیح کرنے کی کوشش میں یہاں تک آیا ہوں میں۔“
 ”کیا مطلب؟“

”آپ آئیے میرے ساتھ سب بتاتا ہوں۔ سوری انکل! میں یہ بات آپ کے سامنے نہیں کر سکتا۔“
 اس نے آریا پارکرنے کی نشان دہی کی تھی۔ جمال صاحب اور نزہت بیگم دونوں اس کا منہ دیکھتے رہ گئے۔
 اگلے دو منٹ کے بعد وہ علیحدہ کمرے میں نزہت بیگم کو بتا رہا تھا۔

”انوشہ کی بربادی کا ذمہ دار میں ہوں آنٹی! اس کے ساتھ جو بھی ہوا وہ میں نے کیا۔ میں نے مبینہ نکاح کے وقت شافی کی بے وفائی کا سبب زور کو سمجھا اسی لیے انتقام کی آگ میں انوشہ کا وجود جلا دیا۔ میں بہت شرمندہ ہوں آنٹی! ایک پل کا سکون میسر نہیں ہے مجھے وہ بچہ جو میرا خون ہے۔ میں اسے مزید خرد میوں کا شکار نہیں دیکھ سکتا۔ اسی لیے ساری کشتیاں جلا کر یہاں آپ کی دہلیز پر چلا آیا ہوں۔ خدا کا واسطہ ہے آنٹی! مجھے معاف کر دیں اور میری خوشیاں پانے میں میرا ساتھ دیں پیڑا!“ شاہ زر کا حال اس وقت کسی سوالی سے مختلف نہیں تھا۔

نزہت بیگم پتھرائی ہوئی بے یقین آنکھوں سے اسے دیکھ گئیں۔
 ”بہت تمنا ہے کھالے ہیں میں نے حالات کے اب مزید کچھ مت کہیے گا آنٹی! وہ لڑکی صرف میرے لیے بنی ہے۔ اسے صرف میں خوش رکھ سکتا ہوں اور کوئی نہیں۔“ وہ سوال کر رہا تھا اور نزہت بیگم کے دماغ میں اس کی صرف ایک ہی بات گونج رہی تھی۔
 ”انوشہ کی بربادی کا ذمہ دار میں ہوں آنٹی۔“
 اس بات کے بعد اب کچھ بھی کہنے کی خواہش رہی ہی کہاں تھی۔ اب جو بھی کرتا تھا بہت سمجھداری سے کرتا

”اور ویسے بھی میں اپنی ماں کو من کر رہی تھی شادی کروں گی۔ بے فکر رہو تم!“ جل کر کہتی وہ اٹھ کر اس کے کمرے کا سامان میٹنے لگی۔ سمعان پھر سے آنکھوں پر بازو رکھ کر اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں لگ گیا اور دوسرے کمرے میں صائمہ عباد کا شکریہ ادا کر رہی تھی۔

”اب تو پریشان نہیں ہونا؟“ سارا سامان نکال کر قدرے چھوٹی ہوئی سانس کے ساتھ وہ صاعقہ سے پوچھ رہا تھا۔ جواب میں اس نے مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہل دیا۔

”چلو شکر ہے میں چاہتا تو یہ کام کسی سے پیسے دے کر بھی کروا سکتا تھا۔ مگر مجھے اچھا نہیں لگا۔ تم ہونا صاعقہ! تو میں ساری دنیا چھوڑ کر آ جاؤں تو صرف ایک لمحے میں میں ساری دنیا ترک کر کے تمہارا ہاتھ تھام سکتا ہوں۔ بہت بہتر بنا دیا ہے تمہاری محبت نے مجھے سچ میں۔“

”بہت شکریہ!“

”اپنے پاس رکھو اپنا شکریہ اور چلو ایک کپ چائے بناؤ۔ تب تک میں ذرا آئی کی پاس بیٹھتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ چائے کا سامان تو پانی کی نذر ہو گیا۔ کتنی شہ مندی تھی اس وقت اس کے لمبے میں عباد کمر آیا۔

”کوئی بات نہیں سارا پانی تو پلا سکتی ہونا پھر آئی سے مل کر ماریٹ چلتے ہیں۔ جو چیز چاہیے ہو لے لینا۔“

”ٹھیک ہے۔“ بنا کر اٹھائے وہ زبردبار ہوئی گئی۔ عباد کی سی ایک چپت اس کے سر پر کھاتے ہوئے آئے بڑھ گیا۔ بھی صائمہ اس کے پاس آئی تھی۔

”بہت اچھا لڑکا ہے صاعقہ! اگر یہ تمہاری پسند ہے تو یقیناً جواب ہے۔“

کتنی اچھی لگی تھی اس وقت اسے صائمہ کے منہ سے عباد کی تعریف یوں جیسے وہ بہت متحیر ہوئی ہو۔

صائمہ اب چار پانی پر بیٹھی پاؤں کے انگوٹھے سے پانی زمین کھد رہی تھی۔ وہ چھ لمبے خاموشی سے اسے دیکھتی رہی پھر اس کے کھنوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے نیچے زمین پر بیٹھ گئی۔

”یہ خدا کی رحمت سے مایوس ہونے کا سوچ سکتی ہو صائمہ!“

”نہیں۔“

”تو پینہ بہت رکھو ادا اس سے بوائے بہتر کرے گا۔ نہیں تو کوئی نہ کوئی تو ہو گا نا جس کے ہاتھوں کی لکیروں میں تمہارا نام ہو گا۔“

”پتا نہیں یار!“

”میرا ایمان ہے ضرور ہو گا۔ اب جو تھوڑی بہت چیزیں رہ گئی ہیں۔ وہ سمیت لو۔ میں زمین کے ساتھ کھانے پینے کی چیزیں لے آؤں۔ ٹھیک ہے۔“

”ٹھیک ہے لے آؤ۔ ایمان کب تک آئے گا؟“

”پتا نہیں پتا۔ مگر ادا کاں ہے آج ہی آج نہیں۔ میں پانی لے آؤں زمین کو۔“ اچانک یاد آنے پر وہ اٹھی مگر تب تک عباد اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔

”بہت ب وقوف رکھی ہو تم پانی تک نہیں پلا سکتیں۔“



صاعقہ چار پانی پر بیٹھی تھی تھوڑی دیر کے بعد دروازے پر دستک ہوئی۔

”لگتا ہے آگیا تیرا بیرو۔“ آمنہ نے دستک سنتے ہی سرگوشی کی اس کا دل زور سے دھڑک اٹھا۔ صائمہ اندر کمرے میں پانی نکال رہی تھی۔ اس نے دھڑکتے دل سے دروازہ کھول دیا۔

”السلام علیکم!“

”وہیکہ اسلام! آؤ۔“ کتنی خوب صورت لگ رہا تھا وہ اس وقت اس کے لیے نظریں اٹھا کر اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

”سوری! مجھے تھوڑی دیر ہو گئی۔ وہ اصل میں باپ نے ایک ضروری کام سے بھیج دیا تھا۔ میں نے ابھی ایک دوست سے بات کر کے گھر کا انتظام کر لیا ہے۔ ہمیں جو ضروری سامان لینا ہے وہ لے لو شکر۔ یہ تمہاری کرنی کے ہیں۔“

”لیکن زمین! تمہیں یہ سب کرنے کی ضرورت۔۔۔“

”چپ! دادی اماں نہ بنی رہا کرو ہر وقت میری۔“

اس نے بوتلوں پر شہادت کی انگلی رکھ کر کہتے ہوئے آگے بڑھا تو پاس کھڑی آمنہ نے صاعقہ کو مسکرا کر دیکھا انگلیوں سے کوٹری کا نشان بنا دیا۔ انگلیوں پر عباد شکر کے بازو فوٹ لے کر سے سامان نکال رہا تھا۔ سمعان کو بخار تھا لہذا آندر شک بھری نگاہوں سے صاعقہ کو دیکھتی دوسرے کمرے میں سمعان کے پاس چلی آئی۔

”کون آیا ہے؟“ اسے پاتے ہی سمعان نے آنکھوں سے بازو ہٹایا تھا۔ وہ چار پانی کے کنارے پر ٹک گئی۔

”صاعقہ کے آفس سے کوئی صاحب آئے ہیں۔ مدد کے لیے شہر تک کہتے ہیں۔ غنڈہک ہو جائے گی۔“

”ایمان کا پتا چلا کہاں گیا ہے؟“

”نہیں شاید صاعقہ کو پتا ہو تمہارا بخار کیسا ہے اب؟“

”پتا نہیں تم جو اب اپنے گھر سے سارے دن ادھر ہی نہ جھکی رہا کرو۔“

”یوں نہ رہوں۔“ نہیں کیا تکلیف ہے میرے گھر پہنچتے ہیں۔“

”مجھے کوئی تکلیف نہیں تمہارے سسرال والوں کو ہو سکتی ہے۔“

”بھار میں گئے ایسے سسرال والے میرا سسرال یہی ہے بس!“

”یا گل پن کا مظاہرہ مت کرو کچھ نہیں دے سکتا میں تمہیں۔“

”مجھے تم سے کچھ چاہیے بھی نہیں سوائے نام کے سمجھے تم!“

سمعان جانتا تھا وہ اس سے کبھی جیت نہیں سکے گا۔ کتنی خاموش ہو گیا۔

”چھوڑو سوری ووری کو۔ مار سیٹ چننا ہے کہ نہیں؟“

”بس چل رہی ہوں چادر لے آؤں۔“ جلدی سے کہہ کر وہ اندر کمرے میں گئی اور اگلے کچھ ہی منٹوں میں اس کے ساتھ باہر آ گئی۔

”دوست کی گاڑی مانگ کر لایا تھا۔ بے چارہ انتظار کر رہا ہوگا۔“ صاعقہ کے بیٹھنے کے بعد گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اس نے کہا تو وہ پریشان ہوئی۔

”کیا ضرورت تھی گاڑی مانگ کر لانے کی؟ ہم رشتہ یا نیکی سے بھی تو جا سکتے تھے۔“

”مجھے رکشہ یا نیکی کی عادت نہیں ہے۔ ویسے بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں دوست جان دیتے ہیں مجھ پر تم آنٹی کا سناؤ ڈاکٹر کیا کہتے ہیں۔“

”ابھی تو سب ٹھیک ہے۔ وہ جو کینسر کا کہہ تھا ڈاکٹر عارف نے وہ سب غلط نکالا۔ الحمد للہ ای کی پورٹس بالکل ٹھیک ہیں۔ بس لیمو جالات اور مسائل کی وجہ سے پریشان ہوتی ہیں۔ تو مسند بن جاتا ہے۔“

”پہلے شہر سے نکلا۔ میں نے نیچر صاحب سے بات کی تھی تمہارے لیے بہت خوش ہیں وہ تمہارے کام کے بعد پچاس ہزار گلے ماہ سے ڈبل تنخواہ ہوگی تمہاری۔“

”کیا.....! تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا مجھے۔“

ایک پل میں گلاب کی طرح کھل اٹھی تھی وہ عبا دیکھتا رہ گیا۔

”سر پرانز بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے عزیز از جان! اور ابھی میں ممانے ہماری شادی کے لیے بھی بات کرنے والی ہوں۔“

آج کا دن خوشیوں بھرا تھا۔ اس کے گالوں پر سرخی دوڑ گئی۔

”تم بہت اچھے ہوزین! کبھی کبھی مجھے لگتا ہے جیسے میں تمہیں سمجھتی نہیں سکتی۔ تم آسمان ہوا میں زمین پھر بھی تمہارا مجھ سے اتنا پیارا! سمجھ میں نہیں آتا کن الفاظ میں تعریف کروں تمہاری۔“

”جن احاطہ میں بھی کروں گی مجھے تو اچھا لگے گا۔“ وہ مسکرایا تو صاعقہ اسے دیکھتی مسکرا کر نہا پھیٹ گئی۔

”کون کہتا ہے زین کہ محبت کا وجود ختم ہو گیا ہے۔ کون کہتا ہے موجود وقت کی نزکیوں کی قسمت میں وہ نہیں رہی۔ دیکھو نیچر۔ ہاتھوں میں خوشیوں اور راحت کے کتنے پھول ہیں۔ دیکھو میں کتنی سرخرو ہوں ایک انسان کی محبت میں.....! اب مجھے اپنے رب سے اور کچھ بھی نہیں چاہیے۔“

”شکریہ! اللہ نے چاہا تو بہت جلد تمہارے ہر خواب کی تعبیر دوں گا تمہیں اور اس کے ساتھ ایک بہت خوب صورت سر پرانز بھی۔“ مہارت سے ڈرائیو کرتے اس کے ہاتھوں میں مضبوطی تھی۔

صاعقہ کا دل چاہا وہ ہواؤں میں اڑنے لگے۔ اس روز اس نے عبا کے ساتھ بہت سا وقت بتایا تھا۔ شاپنگ کے ساتھ ساتھ عبا دے اسے رات کا کھانا بھی کھلایا تھا۔ وہ شام اس کی زندگی کی ایک حسین شام تھی۔

عباد گھرا یا تو آسیرہ بیگم اس کے انتظار میں جاگ رہی تھیں۔

”مما! آپ ابھی تک سوئی نہیں.....؟“

”نہیں! جوان اور ادا رات دیر تک سرتے رہے تو ماؤں کو نیند اور قرار ذرا کم ہی آتا ہے۔“ وہ غیر معمولی سنجیدہ تھیں۔ عبا قدرے پریشان ان کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

”پریشان لگ رہی ہیں۔ سب ٹھیک تو ہے نا۔“

”چنانچہ نہیں! لیکن تمہاری وجہ سے میں تھکات میں بہت پریشان ہوں۔ تمہارے پاپا نے تمہاری شادی کے کردی ہے اور تم کو آواز دہل کی صرح مسرت پر وانی کا منہ پرہ کر رہے ہو کیا چاہتے ہو تم آخر؟“

”میں یہ شادی نہیں کرنا چاہتا ماما! بادیہ میری پسند نہیں ہے۔“

”لو اس بند کر دو تم شہید بھول گئے ہو باری مرضی پر ہی بادیہ سے تمہاری نسبت طے ہوئی تھی۔“

”ہوئی ہوگی مگر اب وہ میری پسند نہیں ہے۔“

”یہ کیا بلواس ہے عبا! تم رشتوں کو مذاق سمجھتے ہو؟“

وہ غصے سے دباؤ لگ گئیں۔ جواب میں عبا دے محبت سے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

”آئی اے سوری ماما! میں واقعی بہت شرمندہ ہوں آپ سے۔ میرا مقصد کسی بھی طرح سے آپ کو اذیت پہنچانا نہیں۔ مگر آپ میری ماں ہیں اور میں جو بات آپ سے شیئر کر سکتا ہوں اور کسی سے نہیں کر سکتا۔ مجھے کتنے کی کوشش کریں۔ میں بادیہ کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتا۔“

”تو یہ بات اپنے پاپا کو بتاؤ مجھے نہیں۔ میرا کوئی اختیار نہیں ہے نہ تم پر نہ ان پر۔“

”اوکے! کہہ دوں گا۔“

”بہت بدتمیز دوست ہو تم کون ہے وہ بڑی جس نے اتنی خود سری سہادی ہے تمہیں؟“ اچانک وہ بھڑکی تھیں۔ عبا نے اس بار گہری سانس بھر کر سر سونے کی پشت گاہ سے نکال دیا۔

”میں کسی کی باتوں میں آنے والا نہیں ہوں ماما! اور یہ بات آپ بہت اچھے طریقے سے جانتی ہیں۔“

”پھر اس شادی سے انکار کی وجہ؟“ اس بار آواز اس کے پیچھے سے آئی تھی۔ عبا نے چونک کر مردوں موری در سونے کی پشت پر یاور صاحب کو کھڑے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”السلام علیکم یا پاپا!“

”وعلیکم السلام بر خوردار! کچھ پوچھا ہے میں نے آپ سے؟“ ان کے تیور کڑے تھے۔ عبا کو لگا اُگر اس وقت وہ کمزور پڑ گیا تو پھر بھی ان سے اپنی بات نہیں منوانے کا۔ بھی اس نے لب کھلتے ہوئے رخ پھیرا تھا۔

”میں کسی اور کو پسند کرتا ہوں پاپا! اور اسے پر پوز بھی کر چکا ہوں۔“

”بیمیں مطلع کیے بغیر۔ کسی بھی اہمیت کے قابل نہیں سمجھا تم نے ہمیں؟“

”ایسی بات نہیں ہے پاپا! میں نے صرف پر پوز کیا ہے نکاح نہیں کیا۔“

”تو وہ بھی سولو۔ ہم سمجھ لیں گے ہمارا کوئی بیٹا تھا ہی نہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ جیسی آپ کی خوشی میں کل ہی یہاں سے شفٹ ہو جاؤں گا۔“

وہ انہی کا بیٹا تھا اور بے حد ضدی یاور صاحب کے ساتھ آسیرہ بیگم بھی اس کا منہ دیکھتی رہ گئی تھیں۔ مگر وہ

وہاں سے سیدھا اپنے کمرے میں چلا آیا تھا۔

”سن یہ آپ نے؟“ وہ گھر چھوڑنے دیتا رہا۔

”ہوں! کمرے میں بھی اس کا باپ ہوں۔ اتنی آسانی سے اسے اپنی من مرضی نہیں کرنے دوں گا۔“

”مجھے ڈر لگ رہا ہے یا راولا! وہ قد میں برابر آجائے تو ان کے ساتھ زبردستی نہیں چلتی۔“

”جانتا ہوں مگر تم فکر مت کرو۔ ن شہانہ وہی ہوگا جو ہم چاہیں گے۔ ان کے ذہن میں چوتھا آئیہ نیگمان کے راز سے بے خبر ساری رات بے چینی سے گزرتی رہی۔ اگلے روز صبح وہ بھی بے چینی سے بے ہوش تھا کہ وہ باور صاحب کی ہدایت پر اس کے کمرے میں چلی آئیں۔

وہاں آ کر اپنے بالوں میں بنی نرم انگوٹوں کے لمس سے کئی کئی گھنٹے گزریں۔

”مما! آپ یہاں.....؟“ فوراً سے پیشتر وہ اٹھ بیٹھا جواب میں آئیہ نیگم نے اپنے آنسو پونچھ لیے۔

”ہاں دیکھنا کئی کئی برس پہلے وہیں سے اپنی کوکھ سے ختم دیا راتوں میں جس کے لیے جان و مال خود مختار ہو کر کسی ایک لڑکی کے لیے اس میں کو چھوڑ جانے کا فیصلہ کر کے تیرے سون کی نیند سوتا ہے۔“

”اوہ! کئی لڑکی کے لیے آپ کو بھی نہیں چھوڑ سکتا۔ مگر پاپا جو چاہتے ہیں وہ کرنا بھی میرے لیے مان نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے تمہارے پاپا کچھ بھی کہتے رہیں مگر میرے لیے میرے چاند کی خوشیوں سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں ہے۔ جو تم پہ ہوگا وہی ہوگا۔ بس ابھی نہ موش رہو۔ بعد میں مگر اسے خود کو بزنس میں مگر کر کے ثابت کر دو کہ تم کئی سے کم نہیں ہو! اس وقت تک کہ ان کے گلے ٹٹنی جا جائے انہیں ایک ماہ کے ٹور پر میں چاہتی ہوں اس بار ان کی جگہ اس ٹور پر تم جاؤ اور بس! پس آؤ تو اتنے کامیاب ہو کہ وہ خوش ہو کر ہماری ہر ایک بات تسلیم کر لے۔“ ویتا رہا تھا۔ ”عجب! تم نے بوط رحم ہاتھوں کو اپنے نرم ہاتھوں میں دبالتے ہوئے وہ اس کا ذہن بنارہی تھیں۔ مگر وہ ان کے چہرے پر ممتا کے رنگ دیکھتے ہوئے پتھر سوچ کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

”ٹھیک ممما! اگر آپ میرے ساتھ ہیں تو جیسا آپ کہیں گی ویسا ہی ہوگا۔“

”شباباش میری جان! چلو اب جدی سے اٹھ کر شاور لوارنا شتا کرو تب تک میں تمہارے پاپا سے بات کرتی ہوں۔“ اس کے اقرار پر بے پناہ خوش ہوتے ہوئے انہوں نے اس کی پیشانی چومی تو جواب میں وہ مہمل ہنایت ہوئے! ستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ آئیہ نیگم کی محبت اور رضا مندی نے اس کے اندر جیسے نئی روح پھونک دی تھی۔ اس کا دل چاہا وہ فوری صاف عتہ فون کر کے یہ خوش خبری سنائے مگر پھر خوب صورت سر پرانہ سوچ کر اس کام کو بھی اپنی واپسی پر اٹھاتے ہوئے اس نے صبح بتیر کے صبح کے ساتھ اسے اپنی سڈنی روانگی کی اطلاع دی اور مسرور سا دشاں روم کی طرف بڑھ گیا۔

☆ ☆ ☆

انزالہ کے قدم جو نہی حویلی کے وسیع صحن میں پڑے بہن داد کی ماں اور بابا دونوں کے چہروں پر مسرت و اگلی۔ دادی ماں کا چہرہ البتہ ابھی بھی شبیدہ تھا۔ وہ حیران سی آگے بڑھتا آئیں۔

”آئی میری دھی! بڑے مبارک قدم ہیں اس کے!“

بابا کے جب میں اس کے لیے صرف محبت ہی نہیں تو صیف اور ستائش بھی تھی اور یہ تو صیف و ستائش کیوں تھی اس وقت وہ نہیں جان پائی تھی۔

”استقامت! سب ٹھیک تو ہے نا!“ قدرے حیران سب سے پیار لیتی وہ دادی ماں کے پہلو میں ٹک گئی تھی۔ بہن داد نے پیروں کی طرف بڑھ گیا۔ دادی اب اس کی طرف دیکھنے بغیر کہہ رہی تھیں۔

”ہاں! منہ کے فضل سے سب ٹھیک ہے بس آج سے تو اس حویلی کی امانت ہو گئی ہے۔ نیہ کا فون آیا تھا بہن داد! نیہ کی طرف اس نے اجازت دی ہے۔“

”کیا اجازت! اور ماما! بہن داد سے کیا تعلق ہے۔“ امانت ہی تو رہی تھی تاہم اس سے پہلے دادی ماں ایسے جواب دیتیں بہن داد بول اٹھے۔

”حق یہ ہے میں ہو کا بیٹا بتاؤ تو تمہاری آپ کے بابا کا بہت برا تعلق تھا اس حویلی سے اور بہن داد تو حیدر آباد میں رہتے تھے۔ جب آپ پیدا ہوئی تھیں تو بھی میں نے بہن داد کے لیے آپ کو رکھ لیا تھا۔“

”مگر ماما! مجھ سے کبھی ایسی کوئی بات نہیں کی۔“ اس کا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا چہرے کی رنگت بھی بدل گئی تھی۔ ”ہی! دادی ماں نے کئی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”ہر بات وقت سے پہلے تیرے علم میں لانا ضروری نہیں۔“

”مگر یہاں میری زندگی کی بات ہو رہی ہے دادی ماں!“

”تو کوئی سولی تو نہیں چڑھا رہا ہے سچ۔ رشتہ ہی کچھ کر رہا ہے ہیں پھر اتنا شرمچانے کی کیا ضرورت ہے؟“

بڑی ماں اور بابا کے سامنے یہ عزت افزائی اسے غرق کر رہی تھی۔ وہ رہبان کی اٹھ کر حویلی کے کشادہ صحن سے نکل آئی۔ باہر ڈیرے کی طرف بہن داد اپنی گن صاف کر رہا تھا۔ وہ اس کی طرف بڑھ آئی۔

”بہن داد! یہ سب کیا ہے۔ آپ نے مجھ سے کہا تھا میں اسے اپنی محبت سے انسان بناؤں ساری برائیاں سارے غلط کام چھڑا دوں اور اب جب کہ وہ خوش میں بھی نہیں آیا ہے۔ آپ چہرے ہیں میں پتھر اس کے حال پر چھوڑ دوں۔ بھٹکنے دوں اسے گمراہی میں تنہا۔“

”ہاں۔“

”بہن داد! جب سب میں اس کی“ ہاں“ نے پل میں برف کر دیا تھا تو وہ بٹکا ہی اس کا منہ دیکھتی رہ گئی۔

”مگر کیوں؟“

”کیونکہ تم نے ساری دنیا کی بھلائی کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا۔ نہ ہی وہ شخص تمہاری کوششوں سے مدھرنے والا ہے۔“

”مگر پھر بھی میں اسے تنہا نہیں چھوڑ سکتی فی الحال اسے سہارے کی ضرورت ہے۔“

”تو تو اس شخص کے لیے تنہا رہی اس درجہ ہمدردی میری سمجھ سے باہر ہے انزالہ شاہ!“ وہ برہم ہوا تھا۔ انزالہ کو اس کا دماغ پھٹ جائے گا۔

”سوری بہر ادنیٰ مراد! میں اپنی زندگی کے ذاتی معاملات میں کسی کی بھی پابندی نہیں ہوں۔ جیسے خوش ہو پر کوئی پہرہ انہیں جھرنوں پر کوئی بندش نہیں ایسے ہی انزال شاہ بھی آزاد ہے۔ وہ شخص اس وقت ٹوٹ پھوٹ کے ٹکڑوں میں نہ رہتا ہے اور یہی وہ وقت ہے جب مجھے اس کی مدد کرنی ہے اسے حیوان سے انسان بنانا ہے۔ تم اس کے لیے چاہو تو اٹھو تاکراؤ۔ چاہو تو مجھ سے دستبردار ہو جاؤ۔ مجھے کوئی پروا نہیں۔“ اپنی بات مکمل کرنے کے بعد وہ پلٹ آئی تھی اور بہر ادنیٰ مراد کی پرسوجی کا ہیں دور تک اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہیں۔



دنوں بازو سر کے نیچے کانے بستر پر چیت لیٹا وہ جانے کس سوچ کے حصار میں تھا کہ انزال شاہ کی مرے میں آمد نے اسے چوتھا دیا۔ خیالوں کا تسلسل و ناتما تھا و راب وہ صرف اسے دیکھ رہا تھا۔ ”اسلام! یکم!“ اس چہرے پر بہت نرم سکراہٹ سما کر اس نے کہا تھا مگر سناؤں نے جواب نہیں دیا۔ وہ شاید اس سے بہت خفا تھا۔ ”تو اب تم نام کا جواب بھی نہیں دو گے؟ ٹھیک ہے مت دنگر میں تو پھر بھی یہاں آؤں گی اور بار بار آؤں گی۔“ وہ ستر آکر تھی پاس پٹی آئی تھی سانوں نے اس بار اپنی نظریں اس کے چہرے سے ہٹائیں۔ ”آئی رہنا میں آج ڈسچارج ہو رہا ہوں یہاں سے۔“ ”پاگل ہوئے ہو؟ اتنا بڑا آپریشن ہوا ہے ابھی ٹھیک نہیں ہوئے اور تم.....!“

”ہاں میں ڈسچارج ہو رہا ہوں۔ رٹموں کی پروا نہ میں نے پہلا کبھی کی تھی نہ اب کروں گا۔ تم رکھو اپنی ہمدردیاں اپنے پاس سنبھال کر۔“

”صرف ہمدردیاں سناؤں؟“ اس قدر دکھ سے اس نے اس کی طرف دیکھا تھا۔ وہ نظریں چرا گیا۔ ”بچے چند روز سے گاؤں میں بہت سون ہو گیا ہے۔ لوگوں نے پھر سے اپنے بچوں کو اٹکول جین شروٹ کر دیا ہے۔ اب وہ جمبولیاں اٹھا اٹھا کر تمہاری موت کے لیے دعا نہیں کرتے۔ کیونکہ انہیں یقین ہے اس بار تم زندہ گاؤں واپس نہیں آؤ گے۔ ہاں تمہارے مرحوم ڈرائیور کی بیوی اور بیٹیاں نہ ورنہ رات تمہاری مہر ت ناک موت کی دنیا میں مانتی ہیں اور وہ ڈرائیور کا بیٹا اس کی رگوں میں تاحال انتہا کا خون جوش مار رہا ہے۔ سنا ہے راتوں کو فینڈ نہیں آتی اسے۔ بات کھاتا پیتا کبھی نہیں ہے۔ اصل میں کسی طاقت ور امیر کے ہاتھوں جب کسی بے گس غریب پر ظلم ڈھایا جاتا ہے تو یہی کیفیت ہوتی ہے سانول! بہت اذیت میں گرفتار ہو جاتا ہے وہ بے گس غریب دنیا کی عدالتوں میں انصاف نہیں ملتا اسے۔“

”تم اپنی بو اس بند کرو گی یا میں کمرے سے باہر نکالوں تمہیں؟“ اس کی توقع کے عین مطابق وہ بھڑکا کر وہ مسکرا دی۔

”اب گھو کیسے ہیں تمہارے؟“ انگلی پل اس نے موضوع بدل دیا تھا۔ سانول نے خاموشی چٹائیں موندیں۔

”چھوڑو کچھ نہیں میں اپنے بڑے بھائی کو جتنے گھاؤ اس نے میرے وجود پر لگائے ہیں ایک ایک حساب لوں گا۔“

”ضرور لینا دوست اور اقدار کی سب سے بڑی پہچان ہی یہی ہے کہ خون کے رشتے کو بے حس کر کے بے جان چیزوں کی اوقات بڑھادیتی ہے اور کتنے مزے کی بات ہے قیس کہ یہ بے جان چیزیں مدتوں یونہی پڑی رہتی ہیں مگر رشتے نہیں رہتے۔“

”خدا کا واسطہ ہے انزال شاہ! تم جاؤ یہاں سے۔“ ایک بار پھر وہ بے زار بنا تو انزال خاموشی سے اٹھ کر اس کی دو اینٹیاں چیک کرنے لگی۔ کل بہر ادنیٰ مراد کی حویلی میں جو فیصلہ اس کی تقدیر کا ہوا۔ وہ اس پر بہت دل برداشتہ تھی۔ جانے کیوں کل سے پھر میرا انشاہ بہت یاد آ رہا تھا اسے جانے وہ کہاں چلا گیا تھا۔ زوہبی کے بعد ایک ہی تو تھا جو اسے اندر سے جانتا اور کھت تھا۔

دو اینٹیاں چیک کرنے کے بعد وہ پٹی تو سانول کو پٹلیں موندے بے خبر سوت پایا۔ نبی نے وہ جاگ رہا تھا یا نہیں۔ وہ نا اس کے چہرے سے نظریں ہٹائے قریب آئی تھی۔

موتی موتی بند غلامی آگئیں۔ مغرور تھی ہوئی تھی ناکبہ نشہ پیشانی پر کمرے سیاہ ریشمی بال مضبوط پورے کندھے بھاری موچکوں تلے دبے گداز ہونٹ وہ واقعی اس قابل تھا کہ اسے نظر بھر کر دیکھنے کے بعد رہا جاتا۔ جانے وہ کیوں بھٹک کر رہ گیا تھا۔ اسی تعلیم بھی اس کے اندر سے روایت جاگیر دار کی سوچ تبدیل نہیں کر سکی تھی۔ اس لئے جانے کیا سوچتے ہوئے اس نے شہادت کی انگلی سے اس کی پیشانی پھر ناک پھر ہونٹوں کو چھوا تھا۔

”تم بڑے ہوسانول شاہ! قابلِ غرت ہو لوگوں کے لیے پھر بھی انزال شاہ تم سے پیار کرتی ہے۔“ اس کا بے سرگوشی سے بند نہیں تھا مگر پھر بھی سانول شاہ نے آنکھیں ہول دی تھیں۔

”انزال شاہ سے کہو مت پیار کر۔ مجھ سے میں اس کی محبت کے قابل نہیں ہوں۔ بہت برا انسان ہوں میں۔“

”اسے پرے نہیں لیتے وہ تمہیں اپنا ناچ ہتی ہے قیس!“

”اس کا قیس نہیں رہا اب۔“

”اچھا! تو پھر بچپن کی رنگ سے تعلق کیوں توڑا؟ اپنے بھائی کی بات مان کر شادی کیوں نہیں کر لی؟“

”وہ بڑکی میرے قابل نہیں تھی۔“

”ایسا کب تک چلے گا قیس! کیا تم ساری زندگی خود سے یونہی لڑتے رہو گے؟“

”پتا نہیں مگر یہ طے ہے انزال کہ اب کسی خوب صورت خوش گوار زندگی پر میرا کوئی حق نہیں رہا ہے۔ بابا۔ بعد خدا کی کا جوشہ میں نے چھاپ وہ اب سون سے جینے لگی نہیں دے گا۔ میں جانتا ہوں ایک روز میں انہی پر پنج راستوں پر بھٹکتے بھٹکتے کسی بدنام و بشت گردوں کی طرح موت کی بے رحم ہانپوں میں چلا جاؤں گا۔ مگر مجھے اب اس کا افسوس نہیں ہے انزال! کیونکہ میں جانتا ہوں میں دنیا کے لیے جتنا بھی قابل نہ تھا مگر اب بھی کوئی ہے جو میرے مرنے کے بعد۔“

اس سے پہلے کہ وہ اپنی بات مکمل کرتا انزال شاہ نے سرعت سے ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔ ”جب تک انزال شاہ کے جسم سے روح کا تعلق برقرار ہے قیس! تب تک تمہیں کچھ نہیں ہو سکتا۔“ ایک دم

سے بہت حساس بہت جذباتی ہو گئی تھی۔ سانول شاہ اسے دیکھتا رہ گیا۔

”تمہیں خدائی کرنے میں مزا آتا ہے تم کرو خدائی مگر خدا کا واسطہ ہے سانول! مجھے میرا قیس واپس کرو۔ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی ہوں خوش نہیں رہ سکتی۔“ وہ رو رہی تھی۔ سانول کا دل جیسے کسی نے منھ میں لے لیا۔

”میں جانتی ہوں قیس! تم بہت اچھے ہو۔ تعینا تم بہت اچھے ہو۔ تینا تم نے بھی زندگی میں بہت دکھ اٹھائے ہیں۔ میرا قیس کرو میرا دل تمہارا۔ ہر نقصان پر تازہ زخم کی مانند رہا ہے۔ مگر میں تمہیں مزید ان اذیتوں کی کو د میں سانس دیتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔ وہ خوب صورت دن جو ہاتھ سے نکل گئے ہیں۔ بہت انمول تھے۔ میں انہیں دوس میں واپس جانا چاہتی ہوں قیس! تمہارا ساتھ ایک خوش گوار زندگی بسر کرنا چاہتی ہوں۔ اس سے پہلے کہ میری تقدیر ہمارے درمیان صدیوں کے فاصلے جا کل کر دے۔ میں تمہیں پالینا چاہتی ہوں۔ تمہیں یہ احساس لانے کے لیے ایک عاجز انسان بن کر جینے میں بھی زندگی بہت خوب صورت ہے۔ میں ساری اشتیاقیں جلا کر آتی ہوں سانول! پلیز میرے بوجھ کو۔ وہ مضبوط سوشل گراں تھی مگر اس سے محبت کے احساس میں ڈھل رہی تھی۔ سانول نے بہت آسانی سے اپنا ہاتھ اس کے سر ہاتھوں کی گرفت سے نکال دیا تھا۔

”میرے طبیعت تمہیک نہیں ہے انزلہ! پلیز اس وقت تم جو یہاں سے۔“ اس کا کوئی غور اس وقت اس پتھر والے انسان پر اثر نہیں کر رہا تھا۔ وہ مایوس سی اٹھ آئی۔

سانول نے اس کے سر سے باہر نکلنے پر بے ساختہ گہری سانس بھری تھی۔

کچھ مرحلے وفا کے جفا کے سپرد ہیں

وہ دیپ کیا جلیں جو ہوا کے سپرد ہیں

اس نے بھی اپنی ضد نہیں چھوڑی کسی طرح

تم کیا کریں ہم بھی انا کے سپرد ہیں



دن خاصا ڈھل چکا تھا۔

دور نیلے آسمان پر اڑتے پرندے اب جیسے تھک ہار کر اپنے ٹھکانوں کو واپس پلٹ رہے تھے۔ فضا میں جس قدر بڑھ چکا تھا۔ اونچے اونچے درختوں کے سر پہنچتے سناکت تھے۔ دو رات کے اس پار غروب ہوتا سورج اب اپنی تاریکی کر نہیں تیزی کے ساتھ سمیٹ رہا تھا۔ قریب ہی کچھ محلوں کے کھلے احاطے میں خواتین اپنے گھریلو فرائمنس سرانجام دیتی دکھائی دے رہی تھیں۔

گھر سے استہول جاتے ہوئے انزلہ شاہ نے غیب کی شکل سی نظر اٹھا کر دیکھا تھا۔ وہاں بہت دور تک مٹی سے اٹے کپتے پر کسی سانول شاہ کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ گاؤں کے اوکے سرور تھے مگر اس کا دل جیسے سنسان ہو کر رہ گیا تھا۔ آج کتنے دن ہو گئے تھے اس کی صورت دیکھے۔ اب تو ہنر ادنیٰ مراد بھی ملک سے باہر تھا۔ داوی ماں کے رویے میں تھوڑی بہت چل آئی تھی مگر اب وہ زیادہ خود ہی ان سے بات

نہیں کرتی تھی۔

دل جیسے بچھ کر رہ گیا تھا۔

تھکے تھکے سے قدم اٹھاتی وہ قبرستان کے قریب سے زور رہی تھی جب اچانک ٹھٹک کر رک گئی۔ وہاں قبرستان سے پچھلی فاصلے پر درختوں کے جھنڈ کے قریب سانول شاہ کا ڈیرہ تھا اور وہیں درختوں کے جھنڈ کے قریب سے قدرے فاصلے پر وہ ایک درخت سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔

وہ میرات سے اس کی طرف پئی۔

قیس

اس کی پار پر سانول شاہ نے بھی آنکھیں کھولنے میں ایک لمبے کی تاخیر نہیں کی تھی بلکی بلکی بڑھی ہوئی شیو کے ساتھ ساری دنیا سے بے نیاز وہ کتنے دل کے قریب رہ رہا تھا۔ گو بھی اس کے زخم پوری طرح سے مند مل نہیں ہوئے تھے مگر پھر بھی وہ گاؤں چلا آیا تھا۔ انزلہ دھڑکتے دل کے ساتھ وہیں اس کے مقابل بیٹھ گئی۔

”اب تین جلیعت ہے؟“

”نہیں ہوں تم آئیں نہیں دوبارہ۔“

”کوئی فائدہ ہی نہیں تھا آنے کا۔ بلکہ اب تو تمہیں بہت خوش ہو جانا چاہیے ڈیرہ کہ میں یہاں سے جا رہی ہوں شاید ہمیشہ کے لیے۔“

”کہاں جا رہی ہو؟“

”مما کے پاس۔“

”کیوں؟“

”تمہارا۔“ ”کیوں؟“ کا جواب نہیں ہے میرے پاس مگر میری تقدیر کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں ہے سانول! شاید جو بھی ہوا اچھا ہی ہوا۔ میں اب بھی تم سے یہ نہیں کہوں گی کہ تم یہ فائدہ بردی اچھوڑ دو۔ کہنہ میں جاتی ہوں تمہیں اپنی خوشی اپنی آواز و شان آج بھی ہر شے سے زیادہ پیاری ہے۔ میں یہاں میری بے لوث محبت کیا۔ بہت دھمکے لپٹے میں بولتے ہوئے اس کی آنکھیں جھل رہی تھیں۔ کبھی وہ بولا۔

”کیوں جا رہی ہو؟“

”شادی ملے ہوئی ہے میری بہن، دلی مراد سے اور اب اسے میرا تم سے میل جول رکھنا ہوا نہیں ہے۔ سچ پوچھو تو میں خواہ بھی اب کوئی حلق نہیں رکھنا چاہتی تم سے غرت کا نہ محبت کا تمہارا جو دل چاہے وہ کرنا کوئی منع نہیں کرے گا تمہیں نہیں پوچھوں گی اب کہ تم نے میرا شاہ کے ساتھ کیا کیا؟ اور لیس شاہ کی بہن گوری کا کیا کیا؟ وہ کہاں گئی؟ پوچھو نہیں پوچھوں گی اب میرا تم سے جو حلق تھا وہ ایک سہانے خواب کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا اور تمہاری مجھ سے جو نام نہاد محبت تھی وہ ایک بکواس کے سوا اور کچھ نہیں تھی۔“

”بس! آگے ایک غلط بھی مت بونا مزی! میں اپنی محبت کے معاملے میں تمہارا کوئی بہتان برداشت نہیں کروں گا۔“ شدت ضبط سے اس وقت اس کی آنکھیں خوب سرخ ہو رہی تھیں۔ مگر وہ بالکل سپاٹ پہرہ

لیے اس کے مقابل بیٹھی ان آنکھوں میں دیکھتی رہی جہاں اس وقت ایک ٹوفن چل رہا تھا۔

”سچ کڑوا ہوتا ہے سانول شہزاد اور تمہاری محبت کا سچ یہی ہے کہ وہ کھل ایک ہو اس کے سوا اور کچھ نہیں تھی۔“

”چناخ۔“

بہت دنوں کے بعد اس نے انزالہ شاہ کی کسی بات پر ضبطِ حویٰ تھا۔ مگر وہ تپنر کی شدت سے سرخ گال کے ساتھ بھی مسکرا رہی تھی۔

”تھیں ناس۔“ ڈبڈبائی آنکھوں میں اشک کا احساس لیے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بہت آہستگی سے اس نے کہا تھا جواب میں سانول شہزاد نے اصراراً اب کے عالم میں رن پھیر لیا۔

”میں زندگی میں سب کچھ چکا ہوں انزالہ! سب کچھ نوا دیا ہے میں نے سب کچھ۔ مگر تمہیں کچھ کر جینے کا حوصلہ نہیں ہے مجھ میں۔ خدا کا واسطہ ہے تمہیں۔ اپنی فتنوں ضد چھوڑ دو۔ یہاں پھینکی کی طرح جہنم کر دیوار سے لگ جانے والوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔ بس جس کے پاس طاقت ہے وہی ہر اٹھ کر زندہ رہ سکتا ہے۔“

”نہیں ایسی زندگی نہیں ہے سانول! ہمیں لوگوں پر اپنی دہشت اپنی دھاک بٹھا کر نہیں جینا۔ یہاں جس کو دیکھو وہی طاقت کے نشے میں پورے مست باغی کی طرح جھم رہا ہے۔ اپنے سے کمتر کو دبا کر سکون محسوس کرتا ہے۔ خدا کی زمین پر خدائی کا دھوی کرتا ہے۔ ہستی مسکراتی زندیوں کا فیصلہ کرتا ہے۔ یہاں بہت سے دیہات ایسے ہیں سانول جہاں کوئی نہ کوئی چوہدری کسی نہ کسی میران شاہ پر ظلم کے پہاڑ توڑ رہا ہے۔

جہاں تعلیم منہ چھپا رہی ہے۔ زبردستی رعیتیں فروغ پا کر انسانیت کو خون کے آنسو روکنے پر مجبور کر رہی ہیں۔ جہاں زندگی تھک رہی ہے سانول! مگر آج تک کوئی سی ڈرائیو کا بیلا بندوٹ اٹھا کر ان برائیوں کو جزا سے ختم نہیں کرتا ہے۔ کسی وزیرِ شیر کے پاس اتنی فرصت ہی نہیں کہ وہ محض چند گھنٹوں کے لیے ہی آئی۔

ابھی ان دیہاتوں میں آ کر یہاں فروغ پائی حیوانیت کا نظارہ کر کے جہالت کی بھیمنٹ چڑھتی زندگیوں کے اوراق پلٹ سکے۔ درد سے چور دلوں کا حال سن سکے۔ رنج و کرب سے برقی بلبس آنکھوں کے انمول موتیوں کو چھن سکے۔ ہم سب مر گئے ہیں! نفسی اور بے حسی کے نہ ہونے ہم سب کو پتھر کا بنا دیا ہے۔

اب ہم پر اچھے برے موسم اثر انداز نہیں ہوتے کسی کی سسپاں کسی کی بد دعا میں ہمارے ذہن کو نہیں جھنجھوڑیں ہم سب جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر اپنے ہی مسلم بھائیوں کا گوشت کھا رہے ہیں۔ اسی لیے تو اندر ب

اعزت نے بھی ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیا ہے۔ قدم قدم پر وقتی آفتیں ہمارا خیمہ بن کر رہ گئی ہیں۔ جب مرجانا ہی متقدر ٹھہرا تو پھر کیوں نا سرخرو ہو کر مریں۔ کیوں نا اپنے معبودِ حقیقی کے سامنے سرشار ہو کر

مریں کہ جس نے ہم سب پر اپنا خاص کرم فرماتے ہوئے ہمیں اپنے محبوب نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوب امت میں پیدا فرمایا۔ سانول کیوں نا ہم وہ راستہ ہی بند کر دیں جو ہمارے اس معاشرے میں جانے لگے ہی ہے۔ اس نو جوانوں کو غلط منزل کی طرف لے جا رہے ہیں۔ جب مرجانا ہی متقدر ٹھہرا تو کیوں نا اس زمانہ کو کسی کی بھائی کے لیے وقف کر دیں؟“ خوب صورت سیاہ آنکھوں میں اک جوت جگائے وہ اس کی طرف

دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ جواب میں سانول نے گہری سانس بھرتے ہوئے رخ پھیر لیا۔

”یہ کرنا چاہتی تھی۔“

”آپ نے نہیں اس جہالت کو تم کرنا چاہتی تھیں۔“ اس کے ذہنوں کو راہِ راست پر لانا چاہتی ہوں۔ گمراہ لوگوں کی درست رہنمائی کرنا چاہتی ہوں۔“

”نہیں کر سکتی تھی یا دلچسپی لیتا نہیں رہ سکتی۔“ شاہزادہ کیونکہ وہ اب بھی تھا اپنے ان احساسات کو ذہن کے حلقے سے نکال کر کھل کی باتوں کو کی تھی۔ مارویا جاکے ہمارے اپنے آزاد ذہن میں تمہارے اپنے لوگ نہیں ماروا تھے۔ ان پر پتہ نہ تھا کہ ان کی ان باتیں کدو کی سی تھیں۔ نیچا کر پٹلی جوں۔ کی

نہانی سمت سے آئی ہوئی ہوں تھے۔ مگر یہاں۔ کی طاقت اور برس۔ ان پٹنے سے تمہاری موت ہو جانے کی۔ یہاں کوئی تمہیں سچا نہ پوچھتا تھا۔ ان پر پتہ نہ تھا کہ ان کی ان باتیں کدو کی سی تھیں۔ نیچا کر پٹلی جوں۔ کی زندگی کو چھین لیں گے۔ انزالہ! ہمارا انیس کے تمہیں۔

یہ پورے کے۔ جدوہ پٹلی بار سے یوں جذباتی دیکھ رہی تھی۔ تجھی لبوں پر مسکراہٹ پھیلاتے ہوئے بولی۔ ”سب مرجانا ہی متقدر ٹھہرا تو کیوں نا سچائی کی راہ گزر پر چلتے ہوئے موت سے ہاتھ ملائیں قیس! بد

عامیوں کے کر کیوں مریں۔ جس زندان میں مزید ندھیرے کیوں بکیریں؟ ہماری زندگی میں کچھ تو ایسا ہو کہ ہم دنیا سے سرخرو ہو کر جا سکیں۔“

اس وقت انزالہ شاہ نے لبے میں ہونٹوں میں جو پیاس تھی اس نے سانول شاہ کی ذات پر چڑھے بے حسی اور کھنکھار پین کے نول پڑا دیا تھا۔ وہ دنائش میں چاہتا تھا مگر انزالہ نے ہال آ خر سے ریزہ ریزہ کر کے توڑ ڈالا تھا۔ تیز سیلاب کی مانند اس کی سرس کے پہاڑ نے اس مضبوط درخت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا تھا۔ وہ اس کی آنکھ میں مچلتے جدائی کے خوف سے اڑھکتے آنسوؤں سے بارگیا تھا۔

کوئی زنجیر دو پابند کی اپنا نہ کی تو رایت کی محبت توڑ سکتی ہے۔ یہ یہی احوال ہے جس پر زمانے کی کسی تلوار کا نالہ نہیں چلتا

اگر چشم تماشا میں ذرا سی بھی مدد نہ دیتا مینہ نہیں رہتا۔ یہ ایسی آگ ہے جس میں بدن شعروں میں جلتے ہیں تو رو جس مسکراتی ہیں یہ وہ سیلاب ہے جس کو

دلوں کی بستیاں آواز دے کے خود بلاتی ہیں یہ جب چاہے کسی بھی خواب کو تعبیر مل جائے وہ جو بٹھکانا ہوا ہے تا شیر مل جائے کسی رستے میں رستہ پوچھتی تقدیر مل جائے

یہ جب چاہے کسی بھی خواب کو تعبیر مل جائے وہ جو بٹھکانا ہوا ہے تا شیر مل جائے کسی رستے میں رستہ پوچھتی تقدیر مل جائے

محبت روک سکتی ہے اس کے تیز دھارے کو
کسی جلتے پتھر کے گونہ کے استعارے کو
محبت روک سکتی ہے کسی کرتے ستارے کو
یہ چاندیہ راتیں کی گرجیں جو رستی ہے
جدھر یہ ہے محبت یہ باگیں روز سکتی ہے
کوئی زنجیر اس کو محبت توڑ سکتی ہے

”تو تم نے قسم کھالی ہے کہ تم مجھے میری مرضی کے مطابق جینے نہیں دلاؤ گے؟“ اس نے اس کی پس انداز کا ہاتھ اس کی گرفت میں تھا وہ مسکرا دی۔

”ہاں! تمہیں شاید یاد نہیں ہے یونیورسٹی پریڈ میں تم نے خود کو میرے سپرد کر دیا تھا۔ تو پھر یہ میری مرضی۔ اس رات پر بھی چلاؤں۔“

”چونکہ یہ میری مرضی ہے اس لیے ہمارے بعد اس کا ہاتھ چھوڑا تو معاف نہیں کروں گا انزال۔“

”نہیں چھوڑوں گی بس تم میرا ساتھ دینا۔ ہر منزل ہر گام پر پلیز فیس!“

”ٹھیک ہے۔“

اس نے اس کے لیے سہارا دیا اور اس کی بے خبری پر مسکرا دی تھی۔

اس نے اس میں شگفتہ ہونے کے بعد وہ بہت خوش تھی۔

عبدجبار نے شاندار احساس نفس کا ساتھ کی جنت سے نہیں تھا اس کے لیے۔ وہ اس کی نوازشیں اس کے لیے نہ چتا تھا کہ وہ ہواؤں میں اڑنے لگے۔ گھر میں سب سے بڑی قوت پر شک کرتے نہ تھے۔ صائمہ اور آمنہ کی نگاہوں میں الگ ستارش ہوتی تھی۔ اس ایک شخص نے جیسے بہت معتبر کر دیا تھا اس نے سوچ لیا تھا وہ اب کبھی اس سے بدگمان نہیں ہوں۔ ابھی شک نہیں کرے اس کی محبت پر ہمیشہ اس کے چہروں کی دایہ بن کر اسے محبت اور راحت دیتی رہے۔

عبدجبار کو سڈنی کے وقت ہو گئے تھے اور ان وقتوں میں وہ پل اس سے رابطے میں رہا تھا۔ وہ وقتوں کے بعد پانک اس کی طرف سے خاموشی چھائی تھی اور ان خاموشی نے اسے پریشان کیا تھا۔ ایک دن ان دن تین دن صبر کی انتہا ہوئی تھی۔

ان نے خود سے عہد کیا تھا کہ وہ بدگمان نہیں ہوں مگر وہ بدگمان ہو رہی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ شک نہیں کرے گی مگر وہ شک کر رہی تھی۔ غیر ملک میں کسی بھی حسینہ کے حسن کا جادو چل سکتا تھا اس پر اور یہ دنیا اس کے بدن سے ہونچوڑنے کو کافی تھا۔ دل کے اندر نہیں اس کے خیریت بنی رہ نہ ہونے کا خدشہ بھی سراٹھاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس روز وہ ”جی ڈانڈ سٹری“ کے مین آفس میں آئی تھی۔ آمنہ اس کے ہمراہ تھی۔

اسی کے ساتھ ہی بریک سے قبل جب استنبال پر اس نے ”زمین“ کا نام لیا تو وہاں موجودہ کی نے پوچھا کہ اس کی طرف دیکھا۔

”سوری! یہاں اتفاق سے زمین نام کے کوئی صاحب کام نہیں کرتے۔ نیچر صاحب کا نام معد صدیقی ہے وہ ابھی آئے نہیں ہیں۔ آپ پلیز انتظار رکھیں چاہیں تو بیچہ رات تک کر سکتی ہیں۔“ ریسپشنسٹ کے الفاظ نے اس کے دل کو جیسے دھچکا کرایا تھا۔ وہ سنا بکائی اس کا منہ دھکتی رہ گئی۔

”کس نے کہا تھا؟“

ریسپشنسٹ اب اس کی بوہلاہٹ کو شک کی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ رو بکائی سی آمنہ کی طرف منہ پھیر گئی۔

”کس نے نہیں ہم نیچر صاحب کا انتظار کرتی ہیں۔“

بالآخر آمنہ نے لب بولے تھے۔ صاحبہ انکھوں میں آنسوؤں کے ساتھ جیسے سر دھڑاتی جا رہی تھی۔ اگلے دن اس کے وقت آمیز انتہار کے بعد انہیں کمپنی نیچر کے آنے کی اطلاع ملی تھی اور عباد نے یہی بتایا تھا کہ وہ کمپنی نیچر کا اسٹنٹ ہے۔ یقیناً انی نے اس کے حال سوال کی خبر مل سکتی تھی۔ اسے اب خود پر اور اپنی سب پر انیس پر غصہ رہا تھا کہ ایک ہی کمپنی میں کام کرتے ہوئے وہ اس کے قدم سے کیوں لٹکتی رہتی۔

جانے وہ واقعی وہاں کام کرتا بھی تھا یا نہیں۔ ایک کے بعد ایک خدشہ سر اٹھ رہا تھا اور اس کا دل دھڑک دھڑک کر صرف یہی صدا بلند کر رہا تھا۔

”نہیں وہ ایسا نہیں ہے مجھے اپنے رب پر اور اپنے پیاری پر پورا یقین ہے۔ وہ یہ ہوتی نہیں سکتا۔ مجھ سے جھوٹ بولے۔ یقیناً وہ کسی مشکل میں ہوگا۔“ کمپنی ریسپشنسٹ کو وہ ہر بھول رہا ہے۔

اس نے مزید بیٹھ کر اس کے بعد وہ نیچر کے آفس میں بیٹھی تھی۔

”بی بی بی فرمائیے۔“

عامر کی شغل و صورت کا حال ”جی نیچر“ صاحبہ خشک بندہ دھائی دے رہا تھا۔ وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر انہیں تر کرتی۔ بہت مشکل سے بول پائی تھی۔

”وہ“ مگر وہ مجھے زمین پاؤں صاحب سے ملتا تھا۔ وہ ہی کمپنی میں آپ کے اسٹنٹ کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ آج کل سڈنی میں ہیں شاید۔“

”آج کل سڈنی میں ہیں تو یہاں کس طرح مل سکتے ہیں آپ کو؟ ویسے بھی میرے کسی اسٹنٹ کا نام زمین نہیں ضرور آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہوں۔“

نیچر کا لہجہ اخلاق سے مبرا تھا۔ مین سی پل کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور باہر کی سینڈل کی آواز اس کی دانتوں میں اتری تھی۔

”بعد صاحب! یہ چند فکڑ ہیں آج فائل کرنی ہیں۔ یہ نکل کہہ رہے ہیں۔ آپ ایک نظر انہیں دیکھ لیں تو ان کو سمجھا دیتے ہیں۔“ نیچر اس کی آمد پر فوراً کھڑا ہو گیا تھا۔ بھی صاحبہ نے پت کر دیکھا تھا۔ تنگ دواؤں پر تنہائی شہر میں اور گلے میں نکاتا دواؤں اس کے ماڈرن ہونے کے ساتھ اس کی حیثیت و مقام کی حیاں مر رہا تھا۔ تاہم وہ اسے فوری پہچان نہ کی تھی۔ یہ وہی لڑکی تھی جسے عباد نے اپنے پاس کی بیٹی کہہ کر متعارف

کروایا تھا۔ دوسری طرف وہ لڑکی بھی اسے پہچان گئی تھی اس کے چہرے پر ناکہ پڑتا ہی ٹھک گئی۔

”تم یہاں؟“

”پائیس تھیں، انٹوں میں“ سے لگا وہ بھرے بازار میں نگے سر ہو گئی ہو۔

”اگر یہ ہے میرے میں بھیجیں سعد صاحب! بہت اہم مہمان ہیں یہ ہماری۔“ استہزاء سے لگا ہوں سے غیبی بن چلائی وہ ہونوں پر کمر اٹھ پھیلاتے ہوئے بولی اور اگلے ہی پل منجر کے کمرے سے باہر نکل گئی۔

صاعقہ کو لگا جیسے آج کا دن طلوع ہی اسے لیل کر رہے ہے۔ وہ اب وہاں آنے پر لپکتا رہی تھی۔ جانے ابھی آگے اور کون سی سچائی اس کا منہ چڑانے کو تیار بیٹھی تھی۔

شہزادے سے ہادیہ کے کمرے میں بھجوا دیا اور وہ جیسے ان دونوں کی منتظر ہی تھی۔

عبداللہ کی بات کو بے سمجھت ہی غریب نے اس کی ٹیبل پر بیٹھ گئی۔ صاعقہ وہ تصویر وہاں دیکھ کر مزید الجھ گئی۔ میں ان پینیاوریا صاحب وہاں کمرے میں داخل ہوئے تھے۔

”انکل! یہ کچھ گیسٹ آئے ہیں آپ کے عباد صاحب سے ملنے۔“ بنا انہیں بیٹھنے کی آفر یہ اس نے کھڑے کھڑے گولا داغ دیا تھا۔

یاد صاحب اس کی اطلاع پر چوٹے تے۔

”کون ہے یہ؟“

”وہی آپ کے عباد کی انڈل فریڈ جسے اس روز رین میں دیکھا تھا میں نے مرشدیہ لڑکی جس کی وجہ سے آج کل وہ بڑا سب پر وانا رہا ہے۔“

کتنا عجیب اور الجھا ہوا تعارف تھا اس کا۔ صاعقہ کی آنکھیں پتھریا آگیا خرواہات مہمان کے شناس سے کیوں منسوب کر رہی ہے آ منالک پریشان اور زیران ہو رہی تھی۔

یاد صاحب اب خاصی تنقیدی نگاہوں سے اسے سمجھ رہے تھے۔

”بیٹھو!“ حکم یوں تھا جیسے وہ ان کی زرخیز غلام ہو۔

وہ دونوں ارشد نیوزی بیٹھ گئی تھیں۔ جواب میں وہ بھی ان کے مقابل ٹک گئے۔

”شکل سے تو دونوں شریف تھے انسان لائق ہو چکے ہوں میں پرانے لڑکوں کے ساتھ ماں باپ کی عزت اچھالتے ہوئے شرم نہیں آتی؟“

اگلے ہی پل سگار جلاتے ہوئے انہوں نے جیسے اسے زندہ درگور کیا تھا۔ وہ رو پڑی۔

”معاف کیجیے گا سر! آپ کو نہ رو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہم دینی لڑکیاں نہیں ہیں جیسی آپ سمجھ رہے ہیں۔“ یہاں بھی آمنہ نے شدید برہم ہو کر لب ٹوٹے تھے۔

صاعقہ کا دماغ تو جیسے کام ہی نہیں کر رہا تھا۔

”عباد کو کیسے جانتی ہو تم؟“ آگے ہی پل وہ پھر اس کی روح کو گھیر رہے تھے۔ اس بار صاعقہ نے۔

اٹھایا تھا۔

”کون عباد؟“

”اللہ رے معصومیت! عبادین کا بیٹا اس کمپنی کا مالک وہی شخص جس کے ساتھ اس روز تم وہاں رہے ستوران میں بیٹھی صاعقہ کھارہی تھیں۔“ اس کے حیرانی سے پوچھنے پر ہادیہ نے آگ برسات لے لی جس میں جواب دیا صاعقہ کو لگا جیسے وہ کسی پہاڑ کے نیچے آ گئی ہو۔

”وہ عباد نہیں تھے۔ زین تھیں زین اس کمپنی کا ایک معمولی سا رکن۔“

”جسٹ شٹ اپ زیادہ اوارڈ بننے کی مدت نہیں ہے۔ وہ عباد تھا۔ میرا منگیتر۔“ حقی کے بل پلاتے ہوئے اس کا بس نہ چیتا تھا کہ صاعقہ کا پیر فوت پڑی۔ یاد صاحب کے ہاتھ کے بلوں میں بھی اضافہ ہوا تھا۔

”میں جھوٹ نہیں بول رہی اس نے اپنا نام زین ہی بتایا تھا۔“

”جھوٹ بولا تھا اس نے تم جیسی لڑکیوں کی کمی نہیں ہوتی امیر زدن کو کان بھول کر سن لو لڑکی! سب کی بات ہادیہ پنی سے ہے اور شادی بھی انتہائی اب اس کے ہاتھ میں۔ تم اپنا وقت نہیں اور ہریا کرو۔“ پہلے ہی تہہ رخی وجہ سے بہت تنہا کر دیا اس نے کمپنی کا۔ انہیں تم۔ اب اس وقت ان کے لبوں سے نکلنے والا ہر لفظ کسی شہر سے نہیں تھا۔ اس کے یہ کوئی عش سے فرشل پر کیت آتا ہے۔ یہ اس لئے صاعقہ احمد سے بہتر کوئی نہیں جان سکتا تھا۔ اس کا دل پاپا وہ چاہتا کر اپنی سنانی دے۔ روئے اور اپنے ساتھ ہوئے فریب کا گلہ کرے مگر اب اس کا فائدہ ہی کیا تھا۔

اس کے اور یہ وحیات صاحب کے درمیان منسلک ایک ٹیبل نہیں دوست اور دشمنیت کی بند فسیل بھی تھی۔ جس کے اوپر سے جھانک کر انہیں دیکھنا اس کے لیے ممکن ہی نہیں رہا تھا۔ کیونکہ عباد یاد کے جھوٹ اور فریب نے بہت پستہ قید کر دیا تھا اسے۔

آمنیہ یہ کہنا چاہتی تھی کہ اس کا ہاتھ بڑا سستا ہی موٹا کر دیا۔ تھی تہ لیل اس جیسی بڑی کے لیے کافی تھی۔

اس وقت وہاں اس کے محض دو اب نہیں بولے تھے۔ بلکہ وہ خود بھی نوٹ کر رہی تھی۔

”میں تھی ہی کہت بھی ہیں۔“ یہی تھی کہ وہ خود سے ٹھک کر کھڑی ہی ہو جاتی۔ لبوں پر چپ کا قتل گاہ کے خود سے کھڑے ہونے کی کوشش میں وہ لڑکھڑا کر رہ گئی تھی۔

اس روز آتا منہ عباس اس کے ہاتھ نہ ہوئی تو شاید وہ سچ سلامت کھڑے نہ پتی پاتی۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ)



انتظار کا موسم

نسیم ارشد

کوئی حرفِ وفا نہ حرفِ سادہ
میں خاموشی کو سننا چاہتی ہوں
میں بچپن کے کسی لمحے میں رک کر
کوئی جگنو پکڑنا چاہتی ہوں

ایک طویل تھکا دینے والے مرحلے سے گزر کر جب وہ خواب گاہ میں پہنچا تو مارے حیرت کے چکرا کر رہ گیا۔ محترمہ مہر یعنی لہن صاحبہ سیاحینز اور سفید لان کے کلیوں والے گرتے میں ملبوس انتہائی انہماک سے کمپیوٹر پر مصروف تھیں۔ مہندی رچے ہاتھوں کی مخروطی انگلیاں سبک رومی سے کی بورڈ پر محترک تھیں۔ چہرہ بالکل صاف شفاف تھا۔ بیوشن کی محنت و اش روم میں بہہ چکی تھی اور ساتھ ہی وہ نگڑی سی رقم بھی جو بیونی سیلون میں ادا کی گئی تھی۔ ہیئر اسٹائل شاید بہت پیچیدہ تھا۔ بھی تو ڈریسنگ ٹیبل پر ہیئر پنز کا ڈھیر پڑا تھا۔ کچھ پنیں ہلکے انگوری کارپٹ پر بکھری ہوئی تھیں۔ عروسی لباس بیڈ پر ڈھیر تھا اور زیورات ڈریسنگ ٹیبل پر..... بالوں کو کس کے جوڑے کی شکل دی گئی تھی عمر نے طویل سانس خارج کرتے ہوئے جائزہ لے لیا۔

منٹ شاو رے کر اس نے اپنا دماغ ٹھنڈا کیا اور باہر آیا تو وہ اکی طرح مصروف تھی وہ اپنی پچھلی کسر آت ہی پوری کرے گی اور تمام رکے ہوئے کام آج ہی مکمل ہوں گے۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر بال برش کرنے لگا تھا ہی اس نے آئینے میں سے مہر کا جائزہ لیا۔ اس کے چہرے پر انہماک کی بنا پر ایک تنگ نظر تھا۔ کافی دیر عادتاً بال سنوارنے کے بعد وہ پلٹ کر روم فریق کی طرف گیا۔ ٹھنڈے دودھ کا گلاس اور سیب لے کر وہ بڑے سکون سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ مہر کی مصروفیت میں کوئی کمی نہ ہوئی وہ سیاہ فائل سیٹے سے برق رفتاری سے ٹائپ کرتی چل جاتی تھی۔ کلاس خالی کر کے اس نے میز پر رکھا اور بینڈ کی طرف گیا لیکن بیڈ پر رہتی پٹروں کا ڈھیر پڑا ہوا تھا۔

”مہر!“ وہ چلتا ہوا اس کے پاس جا کر اس کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ مہر کے ہاتھ سیکنڈ کے دسویں حصے کے لیے رکے پھر متحرک ہو گئے۔ ”مہر!“ اس نے مہر کے شانے پر ہاتھ رکھا اور اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا۔ ”کیا ہے؟“ اس نے پلٹ کر دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ اندازاً بالکل سیاہ تھا۔

کی بورڈ ہنوز کھٹ کھٹ چل رہا تھا یعنی اس کی موجودگی کا کوئی اثر نہیں تھا۔ وہ بالکل متوازن انداز میں چلتا ہوا وارڈ روم کی طرف گیا اور شب خوابی کا لباس نکال کر واش روم میں چلا گیا۔ پچیس تیس

”بیڈ پر سے اپنا لباس فافرو اٹھاؤ مجھے نیند آرہی ہے۔“ وہ نرمی و حسیل کرانچہ کھڑی ہوئی۔ وہ وہیں کھڑا مانیٹر پر نکلتا تھا۔ جہاں سے ہوتے تھے۔ مہر کوئی اسائنمنٹ ٹائپ کر رہی تھی۔ رف میں بہت زیادہ کٹنگ دروازہ رانٹنگ تھی۔ مہر سیاہ فاس میں کلبب صحنات دوسری کٹنگ سے نکلتا تھا۔ وہ وہیں کھڑا تھا جب مہر دوبارہ کمری کھیٹ کر بیٹھ گئی۔ اس نے پت کر بیڈ کی طرف دیکھا وہی ڈھیراب صوفے پر پڑا تھا۔ عمر نے لمبی سانس لی۔ موت اور کباب کی مہک کو اپنے اندر جذب کیا۔

”مہر! مجھے بے ترتیبی سے الجھن ہوتی ہے یہ سب ٹھیک نہیں۔“ اس نے ناپسندیدہ نظروں سے ڈریسنگ ٹیبل پر بھرے زیورات اٹھانے پر پڑا لباس کو دیکھا۔

”مجھے سے زیادہ کون جانے گا کہ تم زندگی میں کام کو کس قدر ترتیب اور صفائی سے کرنے کے ہو۔“ مہر نے اس کی کمرے میں موجودگی کے ایک گھنٹے میں پہلی بار کوئی لمبی بات کی تھی۔ انداز سرد تھا لفظ بہت چبا چبا کر ادا کیے گئے تھے۔

”اچھا! اتنا جانتی ہو مجھے؟“ وہ زیریں مسکرایا۔ مہر کی باتیں مانیٹر پر تھیں وہ پپ رہی۔ ”جب باتیں تو جانتی کیوں نہیں؟“ کچھ دیر کے توقف سے وہ گویا ہو۔ ”بھتی کیوں نہیں ہو؟ بولو!“ اس نے نرمی سے مہر کے کندھے کو چھوا۔

”بیڈ خالی ہو چکا ہے سو جاؤ اور مجھے کام کرنے دو۔“ اس نے عمر دراز کے ہاتھ کو جھٹکا۔ عمر کی آنا پر کاری ضرب پڑی ہونٹ بھیج کر اس نے خود پر قابو پایا۔

”اگر تم نے چند سیکنڈ کے اندر یہ فضول کام نہ چھوڑا تو میں کمپیوٹر آف کر دوں گا۔“ اس نے

پھر کوشش کر کے اپنا لہجہ معتدل رکھا۔ ”کم آن مہر!“ اس نے کی بورڈ پر چلتے اس کے ہاتھ کو تھپایا۔ مہر نے ایک جلتی ہوئی نگاہ اس پر ڈالی اور پھنکارنی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”مہر۔ ذاتی معاملات میں دخل دینے کی کوشش مت کرنا اور ہاں مجھے ہدایات دینے کی یہ دت نہیں ہے۔“ مہر نے کوئی تاثر نہ دیا۔ ”تمہیں صرف بے ترتیبی سے الجھن ہوتی ہے اور مجھے تمہارے وجود سے تمہارے نام سے حتیٰ کہ تمہارے خیال سے بھی الجھن ہوتی ہے۔ بتاؤ کرسکتے ہو ترتیب درست۔۔۔۔۔؟ اگر میں تمہیں برواشت کر سکتی ہوں تو تم صرف یہ بے ترتیبی برواشت نہیں کر سکتے؟“ مہر نے کوئی پڑے گی۔ ”چلو پھر دو۔“ اس نے اوڑھنے لہجے میں غرائی۔

”تمہاری پتھر دوڑ رہی ہے۔“ مہر نے ٹھیک نہیں ہے۔ میں تو تم سے شت کرتا ہوں اور ہوا۔ اس نے باقی باتوں کو نظر انداز کر دیا۔ ”خا ہا سے ہیں ایک جملہ قابلِ رفاقت رکھتا تھا۔“

”جس کے پاس جو خود وہی بات اور رہی۔“ مہر نے ہاتھ بٹاش کی بات تو تم شت نہیں تارہ بار کرتے ہو۔ کاروباری نکلے نگاہ سے۔۔۔۔۔ ہے نا!“ اس نے کم طنز کیا۔ عمر حوصلے سے لی گیا۔

”تم تھوڑا سا غلط بولی گئیں میں عشق کو صرف عشق سمجھتا ہوں۔ تم سمجھنے کی کوشش تو کرو۔“ اس کی بات نے بغیر مہر تیزی سے صوفے کی طرف بڑھی بھاری لہنگا دوپٹا وغیرہ اس نے بڑی مہارت سے تھپکایا اور وارڈ روب میں رکھ دیا۔ زیورات کو ڈبوں میں بند کر کے ڈریسنگ ٹیبل کی دراز میں رکھا اور واپس اس کی طرف آئی۔ عمر نے کچھ کہنے کے لیے سب ایک

”ایک لفظ نہیں ایک لفظ بھی نہیں۔ جاؤ۔“ اس نے

جا کر۔ تمہیں چھوٹی چھوٹی چیزوں سے الجھن ہوتی ہے کبھی دوسروں کے بارے میں سوچا ہے؟ ایسا دہرا معیار اور دوغلا پن۔۔۔۔۔؟“ وہ درشتی سے کہتی ہوئی رخ موڑ گئی۔ عمر کچھ دیر اس کی پشت پر نظریں جمائے کھڑا رہا پھر پلٹ گیا۔

”میں الجھن آف کر رہا ہوں۔“

”کر دو!“ مہر نے جان چھڑائی۔ لاسٹ بند ہو چکی تھی۔ سن۔ نیٹر کی اسکرین سے نکلتی ہوئی روشنی کمرے میں پھیل رہی تھی۔

”مہر! پتھر آف کر دو مجھے روشنی میں نیند نہیں آتی۔“

”جن کے اندر اندھیرے ہوں نہیں باہر بھی اندھیرے ہی اچھے لگتے ہیں۔“ زہر میں بچھے الفاظ اس کی سماعتوں میں اتار کر وہ ماحقہ اسٹڈی روم میں چلی گئی۔ کافی دیر کروٹیں بدلنے کے بعد وہ اس کے پیچھے چلا گیا۔

”مہر! مجھے اکیلے میں نیند نہیں آرہی۔“

”عمر! تم کیا چاہتے ہو؟“ وہ غصے میں بے قابو ہو گئی۔ عمر کی دھڑکن بے ترتیب ہو گئی۔ آج پہلی بار مہر نے اس کا نام پکارا تھا۔ ”صرف عمر۔۔۔۔۔ یعنی رشتے کی نوعیت بدلنے سے روئے بھی بدلیں گے۔“ وہ اس کے خوب صورت ہونٹوں کو دیکھ رہا تھا جن سے چند لمحوں پہلے اس کا نام نکلتا تھا۔ اس کی بے انداز پتھریں نگاہیں مہر کو پگھلانے لگیں۔

”تم کیا چاہتے ہو؟“ مہر کی خفگی آمیز آواز اسے واپس کھینچ لائی۔

”میں صرف تمہیں چاہتا ہوں اگر تم یقین کر سکو تو کرو۔“

”اور تمہارے خیال میں محبت اور جنگ میں سب کچھ جارتو ہے؟“ اس کا لہجہ سلاکتا تھا۔

”مہر! میں نے تمہارے ساتھ شادی کی ہے اور بس۔۔۔۔۔“ وہ نہ جانے کیوں اور کیسے اس قدر لچک کا مظاہرہ کر رہا تھا ورنہ خلاف مزاج ذرا سی بات ہو جانے پر وہ زمین اوپر آسمان ایک کر دیتا تھا۔

”ہاں شادی کرنا بھی تمہیں مجھ سے۔۔۔۔۔ جیسے بھی ممکن ہو۔ اب ہوئی ہے اور وہی بڑی مہارت اور صفائی سے تم نے سب کو بے وقوف بنایا ہے اب اور کیا چاہتے ہو تم۔۔۔۔۔ مجھے یقین دلانا چاہتے ہو؟ یہ بات اہمیت نہیں رکھتی۔“ مہر نے یقین کرنے نہ کرنے سے یہاں سے نہ پھرتا۔ ”اب ہوئی ہے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں امریتین نہ کروں گی تو مجھے نہیں ہونا کوئی قیمت نہیں آتی۔“ ہاتھ اسی طرح جیت میں تمہاری لمبن نہیں بننا چاہتی تھی مگر بن گئی ہوں۔ میرے چاہنے یا نہ چاہنے سے کچھ بھی نہ ہو سکا۔ تم یہ فضول کوششیں ترک کر دو اور مجھے سکون دینے یا مجھ پر زندگی اس قدر ٹٹ کر نہ چاہتے ہو کہ میرا سانس بھی نہ لے پاؤں؟“ عمر کا وجود جھٹکوں کی زد میں تھا۔

”تم یہاں اسٹڈی میں کیوں آئی ہو؟“ بہت دیر بعد اس نے خود کو بولنے کے قابل پایا تھا۔

”میں سب کچھ تمہاری مرضی سے نہیں کروں گی۔“

”ٹھیک ہے لیکن تم سب کچھ اپنی مرضی سے بھی نہیں کرو گی۔ ابھی تم نے خود کہا ہے کہ تمہارے چاہنے یا نہ چاہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ کہتے ہوئے عمر دراز نے مہر کو ننھی سی گڑیا کی طرح بازوؤں میں اٹھالیا اور بڑی احتیاط سے بیڈ پر لٹا دیا۔

”تمہارے چاہنے اور نہ چاہنے سے مجھے بہت فرق پڑتا ہے مہر! میں تمہاری چاہت کے بغیر تمہیں دیکھوں گا بھی نہیں اچھوٹا تو بہت دور کی بات ہے۔“ بے کار کے تھدھے دل سے نکال دو اور پھر سکون ہو کر

سوجاؤ۔“ ٹھہرے ہوئے لہجے میں جبہ اس نے مرکزی ایٹ بند کر کے ناعث باب جہا اور ساتھ ہی اس کی کونٹ بڑھا دی۔

”نہ! انھوں کا سر ایک بار پھر تھما۔ عمر دراز کا رواں رواں ناعث بن چکا تھا۔

”ہوا“

”نکے کچھ دیر کا مکرنا ہے تم سوجاؤ۔“

”کام سچ بھی ہو سکتا ہے۔“

”صح نہیں ہو سکتا، ویسے کا فنکشن مہمانوں کا ہنگامہ..... مجھے کل یہ اسائنمنٹ جمع کروانی ہے۔“

”او کے!“ عمر نے کروٹ بدل کر کبل سر تک تان لیا نا بوائے کا مکرنا کی اجازت دی تھی۔ مہ کے اندر ایک بار پھر توڑ پھڑش مچا دی تھی۔

”تو میں اب پابند ہوتی ہوں تمہاری مرضی اور اجازت کی..... نہ چاہتے ہوئے بھی مجبور ہوئی ہوں اتنی کہ کمپیوٹر استعمال کرنے سے پہلے مجھے تمہاری اجازت و رضامندی کی ضرورت پڑے۔ مریں پتہ وقت اندی میں اپنی مرضی سے نہ ترا سکوں!“ تم نے مجھے مغلوب کر لیا اور تم برابر مجھے ہاتھ چلے جاؤ گے اور میں اتنی بے بسی ہوں کہ تمہاری بات ماننے کے سوا میرے پاس کوئی چارہ نہیں اور میں..... جو وقت و اپنے مطابق ڈھالنے کے خواب دیکھا کرتی تھی اب ذرا ذرا سی بات کے لیے مجھے تمہاری طرف دیکھنا پڑے گا۔ تمہاری ابرویں جنبش میری خواہش میری خوشی اور اختیار پر اثر انداز ہوا کرے گی۔ اب ایک سلسلہ شروع ہو گیا ہے حکم چلانے اور رعب جمانے کا..... تم نے آج تک اپنی من مانی کی تم نے حالات کا رخ ہمیشہ اپنی طرف موڑے رکھا، تم نے وہی پایا جو تم نے چاہا۔ تو کیا میں حالات کا ایک حصہ ہوں یا میں کسی گاڑی کا برانڈ نیو ماڈل ہوں یا کسی فائن

یونیورسٹی کی ڈگری۔ جسے تم نے حاصل کر لیا ہو؟ میں بھول رہی ہوں کہ مہر جمال ایک جیتی جاتی انسان ہے۔ ایک باشعور و آزاد ذہنی انسان کیسے سن سکتی ہے اپنے اچھے بُرے کا فیصلہ خود کر سکتی ہے۔ محض اپنی انا کا پرچم سر بند رکھنے کے لیے تم نے میری ذات کی نی کی اور اب نفی کا یہ سلسلہ آگے بڑھا رہے ہو۔ مہر کی آنکھیں جلنے لگیں۔ ”تم نے یہ نہ سوچا کہ میں کس بحران سے زبردستی ہوں۔ منقبت کے طور پر ہی یہی پتہ تو خیال کیا ہوتا تھا اس میں سہمی..... اسے بیڈ سے اپنا لباس اٹھانا یاد آ گیا پھر وہاں سے وارڈ روب میں اور جیولری جو اس نے ڈبوں میں رکھی تھی اور پھر اسٹ فف کی تھی۔ یہ تو یہ ہی ہو گئی کہ مجھے اسٹڈی سے اٹھالایا۔ یعنی میں اپنی اپنی مرضی سے مل بھی نہیں سکتی۔ ایسے جیسے تم نے مجھ سے شادی نہیں کی بلکہ تم نے مجھے خرید لیا۔ بہت بڑی خوش فہمی و منقبت۔ جوں جوں وہ سوچی رہی تھی مجھے کا عرف بلند ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے بڑے جوش سے گری تھیں اور مہر کی ہوتی۔ جتنی بھی کرے ساری انہیں آج پہنچ گئیں۔ مہر نے جب نہیں کا راز کھول کر اس نے جیولری کے ڈبے باہر نکالے اور ایک ایک چیز اٹھا کر چھیننے لگی۔ چوڑیاں نیکنکس، ایسے رنگڑے رنگ انوری کا رپٹ پر جا بجا گوند اور ڈانڈ کے مختلف زیورات بھر چکے تھے۔ چوڑیاں کول گول ہوتی ہوئی بید کے نیچے تک جا پہنچی تھیں۔ اس کا اشتعال بڑھتا جا رہا تھا۔

”ترتیب اور سلیقہ ہو نہ!“ اس نے الماری کھول کر لہنگا باہر نکالا اور الماری کے پٹ زور سے بند کئے۔ کھٹکے کی آواز سے عمر کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے کبل منہ سے ہٹایا تیز روشنی سے اس کی آنکھیں چند سیکنڈ لگیں۔ اس نے بے اختیار آنکھیں میو

ہاتھوں سے رڑیں۔ مہ نے آگے بڑھ کر کبل کھینچ لیا۔ وہ حواس باختہ رہ گیا۔ مہر نے زور سے بھری لباس اس کے اوپر پھینکا۔ جتنی غنیمت سے بیدار ہونے کے سبب عمر کے حواس پوری طرح بحال نہیں ہوئے تھے اس لیے وہ ناچھی کی کیفیت میں سرخ آنکھیں کھولے اسے دیکھ رہا تھا۔

”تمہیں آنکھیں ہوتی ہے بے ترتیبی سے اور روشنی میں نہیں غنیمت نہیں آتی؟ سے نا! اب لائٹ آف کر کے اٹھو اور مجھے کہہ کر دیکھو کہ میں یہ چیزیں غمراں کی جگہ پر رکھوں اور اب مجھے پیسہ آف کرنے کی آسانی دو پیر میں تمہیں بتا دوں گا۔ مہر جمال کیا چیز ہے..... یہ دیکھو یہ پیسہ زچیں نا جو میں پرنٹ نہ کر پائی تمہارے کمپیوٹر آف کرنے کے لیے تھی۔ اس نے کمپیوٹر پر نر سے نکالے صفحات اس کے آگے لہرائے۔ ”یہ لو!“ اس نے صفحات ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے اور ششدر بیٹھے عمر راز کے منہ پر۔

”مہر!“ عمر کا ہاتھ ایک دم اٹھا لیکن مہر نے راستے میں ہی تھام لیا۔

”نہ! راز! میں تمہاری باندی نہیں ہوں جو یہ بدترین بدداشت کروں۔ مجھ پر ہاتھ اٹھانے کی غلطی ابھی نہ کرنا۔ میں کسی چپ کی نوکری نہیں ہوں جو تمہارے منصب میں آ جاؤں اور نہ ہی تمہاری بولی قمر ڈکھاس اس متری کی ماری یونیورسٹی فیلو جو تم سے متاثر ہو جاؤں۔ زمین آسمان ایک کردوں کی اگر کوئی ایسی دینی حرکت کی۔“ اس نے جھگڑتے مہر کا ہاتھ چھوڑا۔ ”میں اس گھر میں ذہن بن کر رہتی ہوں اور یہ گھر میں تمہارے ساتھ نہیں بلکہ تم میرے ساتھ شیئر کرو گے۔ برابری کی بنیاد پر..... سمجھے! میں جیسے چاہوں رہوں تم جو چاہو کرو۔“ وہ ایک ٹکٹ اس

کے برہم انداز اور شعلے برساتے شبنمی ہونٹوں کو دیکھ رہا تھا مہر کے ہاتھ کا لمس اس کے مضبوط ہاتھ پر ٹھہر سا گیا تھا۔

زخم بھی لگاتے ہو پھول بھی کھلاتے ہو کتنے کام لیتے ہو ایک مسکرانے سے وہ سانس روکے اس کو گرجتے برستے دیکھ رہا تھا۔

”اچھا آغاز ہے یا الہی!“ عمر نے اوپر کی طرف دیکھا۔ وہ خود کو ڈھیلا چھوڑ کر تکیے پر ٹھہر گیا۔ خوش بو میں رچا نازک دوپٹا منہ پر اوڑھ لیا۔

”اتنی بکواس کا یہ اثر.....؟“ مہر نے بعد کر بند کے گرد لگی پھولوں کی لڑیاں نوچنا شروع کر دیں۔ نہ چھٹنگ لگے کر اس تک چھینا اور اسے بازوؤں سے پھرنایا۔

”ارے یہ غضب نہ کرو مہر۔ کی سجاوٹ پر ہزاروں روپے خرچ ہوئے ہیں۔ کچھ تو اپنے بڑی خدا کی خون پسینے کی کمائی کا خیال کر لو۔“ اس نے مہر پر جھگڑتے ہوئے کہا وہ خود کو چھڑا کر پیچھے ہٹی۔ ”مجھے یقین ہے کہ تمہارا اوپری خانہ خالی ہے۔“ وہ مسکرایا۔ ”اپنی حدود میں رہو۔“ وہ سلگ کر چٹخی۔

”او کے میم! اب سوجاؤ تین بج چکے ہیں۔“ اس نے گھڑی کی طرف اشارہ کیا۔ ”اوہ سوری! تم اپنی مرضی کی آپ مالک ہو۔ چاہو تو سوجاؤ چاہو تو..... بیتے تمہاری مرضی۔“ وہ کندھے سے اچکا کر رہ گیا۔

”پتا نہیں یہ شخص میرا خون کھولانے سے باز کیوں نہیں آتا۔“ ببال ہے جو کوئی ایک دن بھی میری زندگی میں آرام سے گزرنے دیا ہو اور اب ساری عمر کے لیے مسلط ہو گیا ہے۔“

”عمر! تم مجھے طلاق دے دو۔“ اس نے جھلاہٹ میں بلا سوچے سمجھے خود کلامی کی۔ عمر کا ہاتھ پوری قوت سے گھوما اور مہر بیڈ پر لیٹ گئی۔ اس کا ایک ہی جملہ عمر

کو جلا کر خاکستر کر گیا تھا سارے نرم احساسات ساری مصلحت کوشی بھک سے اڑ گئی تھی۔

”اب اگر ایسی فضول بات بھی بھی تو میں تمہاری جان لے لوں گا۔“ مرنے جھک کر اسے کندھوں سے تھم کر سیدھا یا مریکی براہ راست تخت لہجے میں تنبیہ کی پھر اسے سمجھتے ہوئے سیدھا ہو گیا۔ مہر کی آنکھوں میں سیلاب اتر آیا تھا لیکن مرنے سے رن بچہ لیا تھا۔

”میری نرمی کا اس قدر ناجائز فائدہ..... بہت غلط بات ہے مہر!“ وہ محض سوچ کر رہ گیا۔ اس نے مہر کا جوڑا اٹھا کر الماری میں رکھا۔ ایک ایک کر کے سارے زیورات اکٹھے کیے اور ڈرائنگ ٹیبل کی دراز میں رکھ کر پیپرز کی طرف بڑھ گیا۔ مہر دیتے روتے سوچتی تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے پلٹ کر بیڈ کی طرف دیکھا اور اٹھ کر اس کے پاس آ گیا۔ احتیاط سے کمر اس پر ڈال کر اس نے لائٹس آف کیں اور دوبارہ کپیڈر کے سامنے بیٹھ گیا۔ برق رفتاری سے ٹائپ کرتے ہوئے اس نے اسائنمنٹ کے پرنٹ دوبارہ پکڑ لے۔ شکر ہے مہر نے اصل اسائنمنٹ نہیں پھاڑی تھی۔

☆.....☆.....☆
موبائل فون سلسلے بجنے پر اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اس نے بمشکل آنکھیں کھول کر موبائل فون کان سے لگایا۔

مہر تم اتنی وقت کی پابند ہو کہ.....
”سوری یار! اسائنمنٹ مکمل نہیں ہو سکی۔“ اس نے راحیلہ کی بات کاٹی۔

”لیکن مہر.....!“ راحیلہ حیران ہوئی۔
”بس کہا نا! نہیں ہو سکی۔ پھر کیوں پیچھے پڑ گئی ہو؟“

”یار! میں صرف حیران ہوں کہ تمہیں اسے ویسے دن بھی اسائنمنٹ جمع کروانے کی فکر لگی ہوئی ہے؟“

”یہ مطلب.....؟“
”مطلب یہ کہ تمہاری اسائنمنٹ سر نہیں تک پہنچ سکی ہے اور میں حیران ہوں کہ تم شادی انجوائے کرنے کی بجائے کتابوں میں مغز ماری کر رہی ہو۔ خدا کا خوف کرو مہر!“ راحیلہ نے اندر دھپنے کے ساتھ ساتھ اسے ڈانٹا۔

”اچھا! ٹھیک ہے اللہ حافظ۔“ اس نے جلدی سے لائن کاٹ دی۔ ساری سستی حیرانی کی نذر ہو چکی تھی۔ ”اسائنمنٹ کیسے پہنچی۔ عمر دراز؟ نہیں وہ صرف مینگی دکھا سکتا ہے۔ اب خود تو چل کر اسائنمنٹ جانے سے رہی۔“ کوئی سر ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ ”صبح ہی سچ یہ ناشتہ ہوتا تھا۔ اس نے ہمدردی سے مانر دیکھا۔ ”اوہ! ایک نچ پکا ہے (اور انکشاف)۔“ وہ واش روم کی طرف بڑھتی۔ عمر کمرے میں نہیں تھا۔ وہ فیش ہو سائی تو ملازمہ ناشتہ پہنچاتی تھی۔

”میں ناشتہ ڈرے۔“ کمرے میں گھس گئی۔ اس نے خائنیت سے کمرے میں گھس گئی۔ پلنگہ پر خاموشی سے ٹرائی واپس لے گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ڈرائنگ روم میں پہنچی تو آج اور دوسرے کمرے میں گھما گئی۔ اسے چاہا کہ وہ وہاں تہہ تیہ رشتہ دار تھے جو شادی میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ وہ ادھر ادھر دیکھے بغیر کرسی پہنچ کر بیٹھ گئی اور چائے پینے لگی۔ ایک دن کی دن دن کے فیزہ بکے ڈائننگ روم میں اکیلی ناشتا کر رہی تھی۔ عمر کی بہن تارا آپی نے عمر کو وہاں بھیجا تا کہ رشتہ داروں کے سامنے ہونے والی ممکنہ شرمندگی سے بچا جاسکے۔ عمر نے بمشکل تمام ایک کپ چائے زہر ماری ورنہ بے وقت

اتنی نرمی میں وہ بھی دن کے اس حصے میں چائے پینا اسے بہت ناگوار لگ رہا تھا۔ اسے سامنے بیٹھ کر چائے پیتا دیکھ کر مہر کے انداز تھکے ہوئے۔

”اچھی طرح فارمیڈیو پوری کرواتی ہوں تمہیں۔“ اس نے دانت پیستے ہوئے سانس کی پیٹ اپنی طرف کھینچ لی۔ بالی درسا اس پر بڑی باریک بینی سے ماریا پین کاٹنے کی۔ کافی دیر بعد اس کام سے فارغ ہونے کے بعد اس نے کارن فلیکس میں چمچ چھاننا شروع کر دیا پھر آئیٹ اپنی پیٹ میں رکھ کر اس کی پیٹوں سے چھوٹے ٹکڑے اٹھا کر منہ میں رکھے۔

”تاج! اخبار لاؤ۔“ اس نے تلے ہوئے انداز پر سیدھا سرچ چھنڈتے ہوئے بڑی فرصت سے ملازمہ کو پکارا۔ مہر چائے تم کر چکا تھا۔ اب اس کی تاؤ ڈالنے والی فضول حرکتیں دیکھ کر اس کا خون کھولنے لگا۔ ملازمہ اخبار لے کر گئی۔ اس کی صفحہ کھولتے ہوئے اس نے یہ علم جاری کیا۔ ”تاج! میں ناشتہ میں جوں بیٹی ہوں۔ ایک کا اس جوں لاؤ فوراً۔“ وہ اطمینان سے اخبار پڑھنے لگی۔ مہر جاتی چاہ رہا تھا اس کا کاروبار ہے۔ چند منٹ بعد تاجی جوں سے آئی۔ اب مہر بیا کرتی۔ وہ ناشتہ میں کاشٹل پائے کا ایک پاپ اور آئسن کے ساتھ پتی تھی اب وقت ناشتہ کرنے سے پہلے جھوک کر اس کی مارے باندھے اس نے ٹیبل نمروں کے سامنے یہ ایک دو ٹیبلٹ جوں کے پیٹے۔ اسی وقت عمر کا سیل فون بج اٹھا۔ اس نے ایک گونہ سکون محسوس کرتے ہوئے سیل اٹھایا اور ڈائننگ روم سے نکل گیا۔ اب بیٹھنا بے کار تھا۔ اخبار اٹھا کر مہر اپنے کمرے میں چلی آئی۔

”یہ تو ٹریڈر ہے مہر دراز! آگے کے دیکھنا میں تمہارا کیا حال کرتی ہوں تم بال نوپنے پر مجبور نہ ہو گئے تو کہنا۔“ فیصد تن انداز میں اس نے منہ پر

ہاتھ پھیرا اور بیڈ پر نیم دراز ہو کر اخبار دیکھنے لگی۔ ”مہر جانو! پارلر کب جانا ہے؟ ویسے کا فنکشن شام چھ بجے ہے اور دو بج چکے ہیں۔ انھوں میں گاڑی انگوٹھی ہوں تم ضروری چیزیں لے لو۔“ تارا آپی کمرے میں آئیں اور اسے ٹوٹا کھاد دیکھ کر بڑی محبت سے بولیں۔

”ٹھیک ہے آپی! لیکن ضروری چیزوں کا مجھے نہیں پتا آپ خود ہی دیکھ لیں۔“ اس نے بڑی سعادت مندی سے کہا۔ ”اور کپڑے یہی ٹھیک ہیں۔“ انٹ اور بج شلوار سوٹ اور دوپٹے میں ملیوس اس نے پناہ کا اشارہ کیا۔

”ہاں چائے تو ٹھیک ہیں بس تم چھو۔“ اماری سے مختلف پیٹ اور بے نکالتے ہوئے وہ صوف انداز میں بولیں۔ مہر ان کے ساتھ پورج میں آئی گاڑی کی ورائیونگ سیٹ پر مہر کود دیکھ کر اس کا حلق ٹڑوا ہو گیا۔ ساری تباہ کاریاں اڑ چکی ہو چکی تھیں۔ وہ اپنے تاثرات چھپائی ہوئی فرنٹ ڈور کھول کر بیٹھ گئی۔ تارا آپی شہر دار گئی ہوئی واپس چلی گئیں۔ مہر نے اسے دیکھ کر کوئی تاثر نہ دیا، مہر کی سنجیدگی سے گاڑی ڈرائیو کرتا رہا پھر بیون کے سامنے گاڑی روک دی اور اس کی مٹھی کے ساتھ صوبہ سامان گاڑی کی پچھلی سیٹ سے اٹھا کر اس کی طرف بڑھ دیا۔ مہر سامان لے کر چلی گئی۔ مہر نے گاڑی ریس کی اور واپس کے لیے روانہ ہو گیا۔

☆.....☆.....☆
”عمر! تم لوگ اپنی ممان کے لیے کہاں جا رہے ہو؟“ تارا آپی نے اپنے چھوٹے بیٹے کو ڈنڈا کھاتے ہوئے پوچھا۔ مہر کے چہرے سے ناگواری جھلکنے لگی۔ ”نہیں جی نہیں آتی!“ عمر نے اطمینان سے کہا۔ ”کیا مطلب.....؟“ حد درجہ حیرانی سے

اس کی طرف دیکھتے ہوئے آپ نے دریافت کیا۔
 ”آپلی ابتایا تو ہے کہیں گئی نہیں۔“ مجھے آفس
 دیکھنا ہے۔ پایا اور چھوٹے پایا یہاں نہیں ہیں اب
 کام کا دہرہ ادا ہوئے تو ایسی مصروفیت میں میں تھیں
 جانے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ اس نے دونوں کہتے
 ہوئے چینل بدلا۔ تارا آپلی اپنے بیٹے کا منہ
 دھلانے چلی گئیں۔

”یہ وہ کام اور باؤٹھنے کی ضرورت نہیں
 میں اپنے پایا کا بڑس خود دیکھ سکتی ہوں تم مجھ پر
 احسان کرنے کی کوشش مت کرو۔“ مہر سا تاپا سلگ
 گئی۔

”چھ!“ مہر نے بڑے غور سے اس کی
 طرف دیکھا۔

”تم چھوٹے پاپا سے بات کرو اور وہ اب ذرا
 دیر تو تمہارا ساتھ رہے گا۔“ وہ چھوٹی مہر اس
 کی طرف دیکھ کر کہنے لگی۔ ”چھوٹے پاپا بھی
 تھی مہر پر فوقیت نہ دیتے۔ نہ جانے عمر نے انہیں
 یہ حال کر پایا تھا۔“

”تم نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا ہے۔
 میرے پاپا کو بھی تمہاری فضول حرکتوں نے مجھ سے
 میرے ماں باپ بھی چھین لیے۔“ ارڈاں کی طرح
 ان کے بغیر ہی شاہی مردہ بھی زبردستی وہاں آیا
 بات ہے تمہاری۔ میں ایک یگانہ ہے یہ وہ
 کی۔ انہی بچے جو مرنا ہے اس پتھر پر اور تمہاری
 ساری ساری چیزیں تمہارے منہ پر انت سرد ماروں
 کی۔ تم نے بہت کہتے ہو میں اب جنگ لاتی ہوں۔
 مائیکل جنگ اور مجھے اپنی عزت سے بڑھ کر پتھر
 گئی عزت نہیں۔ تم نے میری ذات کی آئی کی ہے مہر
 دراز! میں یہ جرم بھی معاف نہیں کروں گی۔“
 عمر دراز سے اس کی پہلے بھی کون سا بانی تھی لیکن

اب تو حد ہو گئی تھی۔ اس قدر پے در پے جھگڑے اور پورے
 طرح اس سے متنہ تھی۔

وہ شوقین ہی سے بہت بد مزاج تھی۔ جب کہ وہ
 اپنی من مانی کرنے والے۔ اونٹنے طریقوں سے
 دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کرنے والا۔ یوں کہ مہر کی
 نہ کسی طرح پس منظر میں رہے۔ کبھی کوئی تقریر
 متاثر نہ دیت کر وہ بھی کسی شے کی توجہ نہ لگے۔
 پتے میں مرزئی رہا اور بھی حیلے میسر نہ آئے
 کامیابیاں۔ وہ اپنے آپ کو گھر میں نمایاں رکھتا تھا۔
 ہر کامیابی پر اسے گفٹ دیے جاتے۔ مہر کے ماما پاپا
 بھی اسے انعام دیتے۔ دنوں عمر کے کارناموں کا
 چرچا رہتا اور تب تک کوئی نیا کارنامہ کسی امتحان میں
 فرسٹ پوزیشن کبھی غیر نصیبی رہا۔ میڈیوں میں
 بہترین کارکردگی۔ وہ کسی نہ کسی طرح خود کو نظروں
 میں رکھ لیتا تھا۔ جنرل مانج اس کی نشیب کی تھی۔
 بین قوامی سیاست کا وہ بڑی دنیا کے آثار پر حوالہ
 چھوٹے پاپا اور بڑے پاپا کے ساتھ مل کر رہا۔
 بحث مباحثے میں اس نے اپنی اپنی بات
 بٹھائے رکھی تھی۔ اسکول بول ٹب تو وہ یہ بھی ہوتے
 میں تو لیکن کالج ہمارے تو زیادہ ہی بے رحم تھے۔
 پڑھائی بے حد وہ اس کی سرزمین میں پڑھائی پر بہا
 اسے پریش کرنے سے کہ میں اس کی فوجی افواج
 کی جاتی۔ ڈانٹ بٹھل پر سب سے زیادہ فوجی
 تعداد میں پسند کی ہوئی۔ نہیں آنے جاتے
 یہ مختصر کا پرہیز مہر کی مصروفیت اور فوجیت سے
 حساب سے رہا جاتا تھا۔ وہ چھپا ہوا تھا۔ اسے خود
 نمایاں رکھنا آتا تھا وہ خود کو ایسے لوگوں میں سے سمجھتا
 تھا۔ جو آتے ہیں دیکھتے ہیں اور فتح کر لیتے ہیں۔
 اس کی شخصیت کا تاثر آپ کی خود نمائی اور خود مری کا

زوال بہت بڑے طریقے سے شروع ہوا تھا۔ مہر کو خود
 بھی افسوس تھا۔ اگر مہر کو بدلے کے لیے اسے اپنی
 اوقات میں واپس آنے کے لیے کسی ایسے بڑے
 نقصان کی ضرورت تھی تو مہر کی باا ست وہ پہلے
 سے بڑھ کر بگڑتا لیکن وہ سب نہ ہوتا جہاں تھا۔ وہ ان
 دنوں بی بی اے کا طالب تھا جب بڑی ماما کی وفات
 نے مہر کو ہلا کر رکھ دیا۔ عمر بھی بڑی طرح متاثر
 ہوئی۔ بڑی ماما کی جدائی میں جہاں سارا گھر میراں
 ہوا تھا۔ وہاں مہر کے ہونٹوں پر چپ سے تارے لگ
 گئے تھے۔ بنا تو سب کوئی بے اور پتھر ہے جائیں
 نہیں جہاں وہاں رہا۔ سنا ہے تان مہر کا پتہ زیادہ ہی
 سنا ہے اور پتہ۔ وہ یہاں شہر میں ہی شہریت
 پسند مہر اکثر اس کے انتہا پسند رویے پر چڑتی ہے۔ پتہ تو
 وہ پتہ بھی کئے۔ مہر کی مخالفت کرتی تھی اب اس کی
 نازک صورت حال پر وہی بات کہہ کر لیٹیا خود ہی
 مہر کا راز شہر کی۔ مہر کے رزمیاں ترک کر کے مہر
 کے فکریوں میں رہ گیا تھا۔ اس نے بون بہت
 کر دیا تھا۔ اس کے چہرے پر بھی مسکراہٹ آتی تھی تو
 بے حد اجنبی اور مضنوی سی۔ وہ جو اپنے آگے کسی کو
 ٹھہرنے ہی نہ دیتا تھا جس کے قبضوں سے پورا گھر
 گونجتا تھا وہ عمر جس کی باتیں ختم نہ ہوتی تھیں جس
 کے پاس سنانے کے لیے ہر وقت من گھڑت قصے اور
 فرضی کہانیاں ہوتی تھیں۔ اب سب کچھ بھول گیا تھا
 اس کی زبان سے نپے تلے لفظ نکلتے تھے لیکن یہ دیکھ
 کر مہر کی جان جل جاتی کہ اس کے منہ سے نکلتے
 والے چند نپے تلے لفظ بھی مستند سمجھے جاتے۔ اس کی
 ہر فرمائش پوری کی جاتی۔ ماما پہلے سے بڑھ کر اس کا
 خیال رکھتیں۔ چھوٹے پاپا اور بڑے پاپا پہلے سے
 بڑھ کر اس کے آگے پیچھے پھرتے مگر وہ کم کڑھا بن چکا
 تھا۔ ماما سارا وقت عمر کی دیکھائی میں گزارتا تھا اور ایسے

میں مہر نظر انداز ہونا شروع ہوئی۔ مہر جو پہلے ہی اس
 کی چھائی ہوئی شخصیت سے چڑتی تھی اس کی کم سم
 کیفیت سے مزید کوفت میں مبتلا ہوئی۔ عمر نے اس
 کے ماما چھین لیے تھے لیکن وہ پتھر بھی نہیں سکتی
 تھی۔ عمر کی ماما تو اسے چھوڑ کر پچی کی نہیں مہر کی
 جیتی جاتی ماما اس سے چھین کی تھیں۔ انہوں نے
 بڑی ماما کی کمی پوری کرنے کی کوشش میں مہر کو بالکل
 بھلا دیا تھا۔ اب مہر کو کیسے عمر سے ہمدردی ہوئی وہ تو
 نہ سب تھا۔ اس کی بی بی ماما نہ تھیں تو اس نے مہر کی ماما
 کی۔ تارا آپلی بھی تو تھیں بے جاری خود ہی سنبھل
 گئی تھیں انہوں نے حقیقت کو قبول کر ہی لیا تھا لیکن
 مہر کے قتل کے بعد اس کی حالت تھی وہ اپنے ہی تو
 نہیں وہ مہر کی توجہ کا مرکز بن جاتا تھا۔ عمر دیکھتا
 بیٹا سے منسوب کیا جاتا تھا یہ ضروری بات ہیں
 اس سے رائے کی جاتی تھیں اس لیے کہ وہ بات کرے
 اور تارا آپلی اپنی شاپنگ کے لیے بھی اس سے
 مشورے لیتی تھیں۔ مہر کے لیے یہ سب ناقابل
 برداشت تھا۔ وہ چڑ جو بڑی ماما کی وفات پر ختم ہو گئی
 تھی اب پہلے سے بھی بڑھ گئی تھی۔ مہر پہلے بھی اس کی
 وجہ سے نظر انداز ہوتی تھی اب بھی اس کی وجہ سے
 سب مہر کو نظر انداز کر رہے تھے اور یہ عمر تو جیسے کہیں کا
 شہزادہ بن گیا تھا۔ سب اس کا حکم بجالانے کو تیار۔
 عمر کی خواہش پوری کرنا عین سعادت سمجھی جاتی تھی۔
 انہی دنوں مہر نے آئی کام میں ٹاپ کیا تھا اگر عمر کو
 بڑی کامیابی ہوئی تو اسے بڑے پپا نے پرسلیم ریٹ
 کیا جاتا لیکن یہ عمر کی نہیں مہر کی کامیابی تھی سو بھلا
 تلاش کرنے کی رشتہ داروں کو بلانے کی کیا ضرورت
 تھی؟ واہ واہ تو صرف عمر کے لیے تھی۔ ستائش کا حق
 دار تو صرف وہ تھا۔ تحسین کے ڈوگرے عمر دراز پر
 برستے اور مہر کے لیے کچھ بچتا ہی نہ تھا۔ بڑی ماما کی

**We at Paksociety.com
giving you the facility to
download urdu
novels,monthly digest,imran
series etc with direct links
and alternatively 21 other
mirrors.**

**for complaint about site not
opening contact us @**

**admin@paksociety.com or
message at 0336-5557121**

نہیں پہنچ سکا، میرے دوست کی طبیعت اچانک
خواب ہوئی تھی۔ اسپتال میں سارا نام نکل گیا لیکن تم
ماسند نہیں کرو، ہم تینوں مل کر آکس کریم کھانے چتے
ہیں تمہارے پسندیدہ پارلر۔ تارا کو تیار ہونے
کے لیے بہہ آیا ہوں۔ تم بھی تیار ہو جاؤ پھر چتے
ہیں۔ میں اپنی کزن کے اعزاز میں کم از کم آکس کریم
تو کھلا ہی سکتا ہوں نا، اور یہ تمہارا گفٹ۔“ عمر نے
بلکے جانتی کور میں بڑا سا پیٹ مہر کے سامنے رکھا۔
مہر نے نور سے نم کا حلیہ دیا۔ اس کی حالت واقعی
کافی ابتر تھی ورنہ وہ بڑے تک سکتے تیار رہتا تھا۔
اس کے بال بھی بے ترتیب تھے اور چہرے پر تسکین
تھی۔“ گفٹ میں کل ہی لے آیا تھا آج دینا تھا
سب کے ساتھ لیکن بتایا نامسنہ ہو گیا تھا۔“ عمر نے
اپنی سرخ آنکھیں مہر پر۔

”تھینک یو! تھینک یو سو مچ! گفٹ! اسے
کاہوت شکر یہ۔“ وہی بات نہیں اگر تم ڈنرا اینڈ نہیں
کرتے ہم پھر پتے جائیں گے۔ وہ ڈنرا تو پایا نہ دیا
تھا۔ میں اپنی پاکٹ مٹی سے سب کو ڈنرا کرکوں کی اور
آکس کریم ہم کل کھا میں نے۔ اس وقت تم تھکے
ہوئے ہو اس لیے آرام کرو۔ کل ہم ضرور آکس کریم
کھانے جائیں گے وہ بھی تمہاری جیب سے۔“ مہر
نے مسکراتے ہوئے کہا عمر باقی لوگوں کے لیے
ہوئے گفٹ اٹھا کر دیکھ رہا تھا۔

”بہت اچھے گفٹ تھے تمہیں اور یہ کرکس
فریم اس میں تم اپنی میڈل والی تصویر لگانا۔“ عمر نے
تارا کا دیا فریم اٹھ کر معائنہ کرتے ہوئے مشورہ دیا۔
کتنا اپنا اپن لگ رہا تھا عمر۔ مہر کو یقین کرنے میں
دقت ہو رہی تھی۔ ”اچھا! میں چلتا ہوں۔ کل چلیں
گے آکس کریم کھانے۔“ مرخدا حافظ کہتا ہوا چلا
گیا، مہر نے اپنا آپ ڈنرا اچھوز دیا۔

وجہ سے عمر کی دل آزاری نہ ہو۔ بڑی خاموشی سے
سب نے اسے مبارک باد دی تھی۔ پاپا انہیں ڈنرا کے
لیے باہر لے کر گئے تھے اور وہ اس کا ڈنرا خاص وہ ڈنرا
پر نہیں آیا تھا۔ وہ مجبوراً اس کی عمر کا پرفیشن اینڈ کرتی
تھی لیکن عمر نے اس کی کامیابی کی خوشی میں دیا جانے
والا ڈنرا اینڈ کرنے کی بھی زحمت نہیں کی۔ اسے کہاں
گوارا تھا کہ مہر سب کی وجہ کا مزنز بنے۔ اسے تو بس
اپنی بی بی خضریٰ کا شوق تھا۔ تارا آتی بڑے پاپا اور اس
کے ماما پاپا نے اسے گفٹ دیے تھے۔ وہ ڈنرا کرکے
سب کے ساتھ خوشی خوشی گھر آتی تھیں۔ وہ اپنے بیرو
میں سب کے دیے ہوئے گفٹ دیکھتی تھی سب
دروازے پر دستک ہوتی۔

”میں!“ اس نے اتنی ملن انداز میں کہا۔ اندر
آنے والا عمر دروازہ تھا۔ مہر کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ
آیا۔ مرنے بھی اس کے کمرے میں نہیں آیا تھا بڑی ما
کی وفات کے بعد وہ بہت کم اپنے کمرے سے نکلتا
تھا۔ پہلے تو وہ پھر بھی ست جاتے کے لیے اپنی
فتوحات کی داستانیں سناتے تارا آتی کے ساتھ اس
کے کمرے میں آ جاتا تھا لیکن اس ایک سال میں پکی
بارود اس کے کمرے میں آیا تھا۔

”بہت بہت مبارک ہو مہر! مجھے بہت خوشی ہوئی
تمہاری اس عظیم کامیابی سے۔“ وہی کانج جہاں میں
نے آئی کام میں سابقہ ریکارڈ توڑا تھا اسی کانج میں
میری کزن نے میرا ریکارڈ بریک کیا۔ مجھے واقعی تم پر
فخر ہے۔“ وہ بڑی پُر خوس مسکراہٹ کے ساتھ بہہ رہا
تھا۔ مہر آنکھیں پھڑپھڑاس کی طرف دیکھ رہی تھی۔
”کیا یہ عمر ہے؟ عمر دروازہ مسکرا بھی سکتا ہے۔ وہ
بھی مہر کی خوشی میں.....؟“

”آئی ایم سوری مہر! میں ڈنرا اینڈ نہیں کر سکا۔
کامیابی ایسا پڑ گیا تھا کہ میں باوجود کوشش کے ڈنرا پر

پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”مہر! بس کرو اور کتنا روو گی؟“ عمر نے اس کے برابر میں بیٹھتے ہوئے اس کے کندھے پر اپنا بازو پھیلا کر اسے تسلی دی۔ مہر نے تیزی سے بہتے آنسو صاف کیے اس نے عمر سے کوئی بات کرنے کی کوشش نہ کی۔ ”تمہارے امتحانات قریب ہیں تم یونیورسٹی جانا شروع کر دو۔ باہر نکلو گی تو جی پہل جائے گا۔ یہ سب کب تک چلے گا؟“ وہ اسے تسلی دے رہا تھا۔ مہر اب بھی خاموش تھی۔ وہ ماما پاپا اور تارا آپ کی باتیں بھی اسی خاموشی سے سنا کرتی تھی۔ کافی دیر یکطرفہ گفتگو کے بعد عمر اپنے خیال میں اسے یونیورسٹی جانے کے لیے تیار کر کے اٹھ گیا تھا۔ وہ ابھی تک وہیں بیٹھی تھی۔

بی بی اس کے بعد عمر نے ایم بی اے میں ایڈمیشن کے ساتھ ہی آفس جانا شروع کر دیا تھا۔ پرنسپل لائف میں آنے کے بعد وہ مزید تنجید ہو گیا تھا۔ والد اتنی ہی عمر میں اس کے ساتھ رانا مہارویہ پر شکر کرتے تھے۔ عمر وراثی عمر کے لئے بھی کاچر میں تھے اور وہ اپنے پاپا اور چچا کے پیچھے کا بڑا سون کر چکا تھا۔ گھر کا اکلوتا چھوٹا چچا بننے کی وجہ سے ظاہر ہے بزنس اسی کو سنبھالنا تھا سوا بھی اس نے آفس پر توجہ دینی شروع کر دی تھی۔ مہر نے خیال میں یہ بھی عمر کی ایک شاطرانہ چال تھی۔ وہ یقیناً مہر کے حصے پر بھی قہر میں ہوتا چاہتا تھا اگر مہر کے پاپا براہ راست فیکٹری اور لمپنی کے شیئر ز اس کے نام نہ بھی کرتے تو وہ ہاتھ کی سفاکی دکھاتے ہوئے بہت ہتھ بڑپ کر لیتا۔ مہر کا کون سا کوئی بھائی تھا جو عمر کے مقابل حیرا ہوتا۔ وہ کئی مہر تو اسے تارا آپ کی طرح شادی کر کے اس گھر سے چلے جاتا تھا پھر باشرکت غیر۔ یہ عمر کی راج دھانی ہوئی اور وہ راجگمار۔ مہر

کے خدشات کو تقویت اس وقت ملی جب عمر نے آفس جوائن کرنے کے چند دن بعد ہی اپنی گاڑی بدل لی۔ اس کے پاس پہلے بھی اچھی خاصی گاڑی تھی۔ جو اس نے دو سال پہلے لی تھی۔ مگر اب وہ گاڑی چھوڑ کر اس نے پچیس لاکھ کی زیرو سٹر گاڑی لی تھی۔ ظاہر ہے جب مفت میں ریوڑیاں بٹ رہی ہوں تو پھر دونوں ہاتھوں سے لی جاتی ہیں۔ وہ کیوں نہ پیش کرتا۔ مہر بے شک اکلوتی تھی لیکن اس کے پاس تو وہی کروا بھی جو پاپا نے اسے کانچ جانے کے لیے لے کر دی تھی اور اسے گاڑی ڈرائیور کرنے کی بھی اجازت نہ تھی ہر وقت ڈرائیور کے ساتھ جانا پڑتا۔ اب اسے مکمل بیوتے ہی تارا آپ کی شادی ان کے ذات سے ہوئی اور بھی عمر نے مہر کی اور اپنی مرضی کا شہنا چھوڑا۔ مہر نے سن تو اس کے سر کوئی تلوون پر بھی نہ تھی۔ یہ تو وہ سہتی تھی کہ شادی کے بعد اس کی جان تم کی خوش سعادت سے چھوٹ جائے گی اب اس کی شادی عمر سے ہو جائے تو وہ تو ساری زندگی یہی گھر گھر نرم جاتی۔ عمر نے جائیداد پر قبضہ کا بڑا اچھا منصوبہ بنایا تھا۔ شادی بھی ہو جائے مہر کو ساری عمر جانے کے لیے اور سب بھانے کے لیے اور ساتھ ہی عمر جائیداد پر بھی ہاتھ صاف کر لیتا۔ ماما پاپا تو پہلے ہی عمر کے قبضے میں تھے اگر عمر اسے پیچھے کرتی تو اسے نون سمان دونوں سے شکایت کرنی تھی۔ اسے ہی تارا رتے رہتے کہ جیسے سارا قصہ راسی کا ہو۔ مہر نے سنتے ہی انکار کر دیا۔ اس کے والدین نے اس انکار کو جذباتی پن سمجھا۔ مہر نے جب دیکھا کہ ماما پاپا اس کی بات سننے کو تیار نہیں ہیں تو وہ سیدھی عمر کے پاس جا پہنچی۔

”اگر تم نے رشتے سے انکار نہ کیا تو میں خود شی کر لوں گی۔ تمہارے خواب زیادہ اچھے طریقے سے

پورے ہو جائیں گے“ ساتھ بھی مہر جانے کا اور بھی جی نہ ٹوٹے گی۔ تم اکیلے ہی پیش کرنا۔“ عمر نا بھی کی کیفیت میں حیرت سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ اسے اصل بات سمجھ میں آئی یا نہیں لیکن اس نے مٹھنی والا معامہ خود ہی کسی نہ کسی طریقے سے ختم کر دیا تھا۔ وہ ویسے بھی پورا کھاڑی تھا ہر ایک کو اپنی اٹیوں پر بچانے والا۔ ہاں لا ورنہ کوباں میں بدلواتا اسے اچھی طرح آتا تھا۔ لیکن یہاں ماما پاپا جیسے سیدھے ماموں لوگ نہیں تھے جو اس کے چکر میں آ جاتے۔ یہاں مہر بھی جو اس کی تمام چالاکیوں کے بارے میں اچھی طرح جانتی تھی۔ اسی لیے اس نے دو ٹوک انکار کر کے عمر کی سازش کو ناکام بنا دیا تھا۔ گھر میں وہ بارہ برس کے اور عمر کے رشتے کے حوالے سے بھی بات نہیں ہوئی تھی اور وہ اس بات پر بری خوش تھی۔ یہ پہلا وار تھا جو اس نے عمر کو اپنا دیا تھا اب آہستہ آہستہ سب باتیں سامنے آ جاتی۔ وہ اپنے خستہ و بیدار کی عمر۔ اس وقت اس کی سسٹن عمر جیسے اپنی دوستیں۔ وہ ایم بی اے کے پانچ سال میں بھی جب ایک بار راج راج کی عمر لی شادی کا شہنا سن۔ اس نے کئی سے بھانے دیا تھا۔ عمر ایم بی اے میں صرف کے پاپا کا بڑا سون سنبھال پکا تھا۔ شادی کرنے والے تھے پہلے بڑے پاپا۔ ماما پاپا سے شادی کے لیے تھے۔ انہیں وہ بڑی سسٹن نے اس بات میں اب چاہئے تھا یا اب کب سے۔ بڑے پاپا کی عمر تھی۔ صورت شادی کے لیے تیار نہیں تھا۔ یقیناً اس نے اس کی ملکیت میں باریکی میں اس نے ابھی تک مہر کی پاپا پر نظر رکھی ہوئی تھی لیکن مہر کی ایک کاپی اس کی اذیت کر رہی تھی۔

اب ایک دن تیار ہونے لگا۔ اس نے بات کی۔ ماما پاپا آپ کی طرف سے ہونے والے ہر عمر کیسے۔

بڑے پاپا نے مہر سے زبردستی کی تھی کہ وہ شادی کے
پتہ نہ ملے۔ یہ وہ تھی اور اس شادی کے لیے
تیار نہیں کر سکا۔ پاپا بہت جلد مرنے لگا تھا۔

مہر سے مہر کے لیے مہر مانا جا سکتا تھا۔ یہ تو اب
دن کا زمانہ تھا۔ مہر اور شادی کے لیے نہیں مانا جاتا
تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح مہر کو باقی میں لاکر اس سے
شادی کرنا چاہتا تھا۔ مہر نے بڑے سلیقے سے بڑے
پاپا سے معذرت کی تھی وہ کچھ زیادہ ہی مایوس ہو گئے
تھے یا شاید انہوں نے مہر کے انکار کو بہت سنجیدگی سے
لیا تھا ان کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی۔ اسپتال
میں انہوں نے روتے ہوئے مہر سے التجا کی کہ وہ عمر
سے شادی کر لے ورنہ عمر شاید ساری زندگی شادی نہ
کرتا۔ مہر شش و پنج کا شکار تھی۔ وہ ابھی بولی کہ
آگئی۔ ماما پاپا اسپتال میں تھے۔ ایک طرف بڑے
پاپا کے آنسو اور دوسری طرف عمر جیسی ناپسندیدہ ہستی۔
وہ ان ہی خیالوں میں تھی جب عمر دندنا کرنا شروع
کمرے میں آ گیا۔ پاپا کی حالت اور مہر کی ہٹ
دھرمی دیکھ کر وہ اپنے حواسوں میں نہ رہا۔

”مہر تم نے مجھے خود کشی کی دھمکی دی تھی اس لیے
میں پیچھے ہٹ گیا۔ اب تم نے پاپا کو بھی انکار کر دیا۔ تم
انتہائی خود غرض اور بد مزاج ہو۔ ایک آدمی کو بستر پر
پہنچا کر بھی تمہیں سکون نہیں آیا؟ تمہارا کیا خیال ہے
میرے علاوہ تمہاری شادی کہیں اور ہو اور میں چپ
چاپ تماشا دیکھتا رہوں؟ میں ہر حال میں شادی تم
سے ہی کروں گا چاہے تم نکاح کے آدھے گھنٹے بعد
خود کشی کر لینا۔ مجھے صرف اپنے پاپا کی پروا ہے میں
انہیں ہر حال میں خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔“ انتہائی
غصیلہ انداز میں کہتے ہوئے عمر نے اسے بازو سے
گھسیٹا اور کھینچتا ہوا گاڑی تک لے گیا۔ وہ اپنا ہاتھ

چھڑانے کی کوشش میں بڑی طرح کانپ رہی تھی
لیکن عمر کی گرفت آہنی تھی۔ اسے گاڑی کی سیٹ پر
پھینک کر اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اس کا مرنے
اسپتال کی طرف تھا۔ مہر کا دماغ عمر کے جارحانہ انداز
پر صاف ٹوٹ گیا تھا۔ بڑے پاپا اس طرح سے
جانب پر بہت دیر بعد شادی ہوئے تھے۔ ان کی شادی
مزید بڑی تو انہیں اتنی ہی بویس شفت کر دیا۔ مہر
کی دھمکی مہر کو بولی پر انہیں تھی۔ محنت بڑے پاپا کی
حالت اچھا نہ تھی۔ اسپتال میں ہی ان کا انتقال
ہوا۔ مہر نے اپنی کھنڈوں بعد وہ بوش میں آ کر اپنے
استہسار میں وہ پڑا رہا۔ مہر نے پاپا سے نہیں
بچیں ساتھ تھا۔

”بڑے بھیا! یہ مہر آپ کی بیٹی بھی ہے اور بہو
بھی۔ ہم نے عمر اور مہر کا نکاح کر دیا ہے۔“ بڑے پاپا
یہ خبر سن کر جیسے جی اٹھے تھے۔ انہوں نے ہاتھ بڑھایا
تو مہر نے سر جھکا کر ان سے پیار لیا۔ بڑے پاپا کی
حالت دیکھ کر اس کے آنسو ٹپک آئے تھے وہ غماز سے
مہر کے ہاتھ انہوں نے مہر کا ہاتھ عمر کے ہاتھ میں
تھم دیا۔ آگئی۔ بڑے پاپا کی زندگی ختم ہو گئی۔

”پاپا! مہر اور عمر دونوں کو اس بات سے ہولناک
جھکے۔ انہوں نے آنکھیں کھل کر ان کو دیکھا
اور سکرا دیا۔“

”طیبہ! تم جمال سے کہو رخصتی کی تیاری کرے
اسی جمعے کو۔“ انہوں نے مہر کی ماما سے کہا۔ مہر کی جان
اٹل گئی جب کہ شدید پریشانی کے باوجود عمر کو اپنے
اس سہارا سے بدلتے ہوئے محسوس ہوئے۔

”جس پانچ دن بعد.....؟ اوہ نو.....!“ مہر بڑی
طرح گھبرا گئی۔ نکاح تو ہو ہی چکا تھا اب کسی صورت
جان نہیں چھوٹ سکتی تھی لیکن وہ زیر دستی ہی سہی خود کو
اس رشتے کے لیے تیار کرنا چاہتی تھی لیکن بڑے پاپا

نے بہت جلدی مچا دی تھی پھر رخصتی سے ایک دن قبل
پاپا اور بڑے پاپا علاج کی غرض سے انڈینڈ روانہ
ہوئے۔ عمر اور مہر کی شادی میں صرف تاراج آپنی تھیں یا
قریبی رشتہ دار رہ گئے تھے۔ عمر نے سارے
علاقے میں خود ہی مکمل کیے تھے۔ شادی کے پندرہ دن
بعد بڑے پاپا کی وفات ہو گئی تھی۔ انہیں جگر کا کینسر
تھا۔ انہوں نے اپنی بیماری کو سب سے چھپائے رکھا
اور خود ہی علاج کروا رہے تھے لیکن اب ان کی تکلیف
بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ انہوں نے عمر اور مہر کی
شادی کو بچا ہی تاکہ مہر سنبھل سکیں۔ انہیں اس بات
کا یقین تھا کہ ان کے بعد اگر مہر نہ مانی تو مہر بھی کسی
دوسرے شادی نہ کرے گا وہ اپنے اکلوتے بیٹے کا سر
پانا چاہتے تھے اس لیے انہوں نے مہر کی پیشگی
تائید کی۔ اگر مہر کو پتا ہوتا تو وہ بہت پہلے مان چکی
ہوتی۔ وہ بڑے پاپا کو انکار کر کے انہیں گھبراہٹ
لیکن اسے اصل بات کا پتا ہی کب تھا۔ وہ تو عمر کی ضد
کو اس کا لالچ سمجھتی رہی۔ ماما اور پاپا بڑے پاپا کو لندن
لے کر گئے تھے۔ انہوں نے وہاں بڑے پاپا کی
سرجری کے لیے ٹائم لے رکھا تھا۔ ڈاکٹر نے اچانک
ڈیٹ دی تھی اگر وہ مقررہ تاریخ پر نہ جاتے تو آپریشن
نہ ہوتا۔ آپنی شادی کے جاسکتی تھی۔ بڑے پاپا کی
حالت اتنی اچھی نہ تھی کہ اتنی دیر انتظار کیا جاسکتا اس
لیے شادی ٹینڈر کے بغیر وہ نوک انداز چلے گئے۔ اس
امید پر کہ شاید بڑے پاپا ٹھیک ہو سکیں لیکن پندرہ
دن ہسپتال میں رہنے کے بعد ان کا انتقال ہو گیا تھا۔
ماما پاپا فون پر یہی بتاتے رہے کہ بڑے پاپا ٹھیک
ہیں۔ کسی نے اسے ذرا سا شک بھی نہیں ہونے دیا۔
ابنا تارا آپنی اپنا دھچھپائے اس کی ناز برداری کرتی
رہیں۔ مہر کو اپنا آپ بہت چھوٹا لگ رہا تھا۔ سارے
گھر کے لوگ ہی تنظیم تھے سب ہی ایک دوسرے کو

اتنی اچھی طرح جانتے تھے۔ بڑے پاپا کو مہر
مہر سے اتنی بات کرتا تھا۔ ماما اور پاپا نے بھی بڑے پاپا
کی خواہش کا احترام کیا تھا صرف ایک وہی تھی جو کسی
کی نہ بات مان سکی نہ کسی کو سمجھ سکی۔ عمر کی محبت جو
اسے ایک سازش لگتی تھی۔ بڑے پاپا کی بیماری میں عمر
نے اسے جس طرح برداشت کیا تھا مہر اب ایک لفظ
بھی نہ کہہ سکتی تھی۔ سب نے اپنے اپنے حصے کا فرض
نبھایا تھا۔ سب نے حق ادا کیا تھا۔ ایک وہی تھی جو کسی
قابل نہیں تھی نہ اپنا ہی۔

عمر راز فاح تھا۔ وہ اول سے آخر تک درست
تھا۔ ایک مہر کی جذباتی اور پاپا کی۔ اس آزمائش پر
پوری نہ اتر سکتی تھی۔ آنسو ایک بار بہا۔ سب نے اس
قدر بڑا خسارہ دیکھا شاید میں ساری زندگی اس احساس
سے جان نہ چھڑا سکوں۔ اس کی چپیاں نہیں رک
رہی تھیں۔ لان میں اندھیرا اتر آیا تھا۔ بائیں
اندھیرا مہر کو اپنے دل و دماغ پر چھایا ہوا نظر آ رہا تھا۔
بڑے پاپا کے آنسو ان کا لہجہ الفاظ بار بار اس کی
آنکھیں بھگو دیتے اور جس دن بڑے پاپا کی وفات
کی خبر ملی وہ ساری رات اکیلا ہی روتا رہا۔ اس کی بیوی
اس کی شریک حیات ہونے کے باوجود اس نے عمر کی
پریشانی کے بارے میں اس سے نہ پوچھا صبح بھی
اس کا اجڑا حیدر دیکھ کر وہ سٹنڈلی کی انتہا کرتی ہوئی
یونیورسٹی چل پڑی۔ کیا وہ واقعی اتنی ہی سٹنڈل تھی۔
اتنی ہی بے حس کہ کسی کا دکھ اور خوشی محسوس نہ کر سکتی۔
کسی کے احساسات کو نہ سمجھ سکتی؟ اپنی ابھی ہوئی
سوچوں کا سر ڈھونڈتی ہوئی وہ گھر کے اندرونی حصے کی
طرف بڑھاتی۔

”تارا آپ کیسی ہیں عمر!“ نوب کے تک لاؤنج اور
پورچ کے چکر کاٹ کاٹ کر اس کی ٹانگیں شل ہو چکی

تھیں۔ اس نے کئی بار عمر کو موبائل پر ٹریس کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کا موبائل مسلسل آف تھا۔ خدا خدا کر کے پورے میں مہر کی گاڑی رکنے کی آواز آئی تو مہر بھاگتی ہوئی اس کے پاس پہنچی۔

”وہ اب ٹھیک ہیں۔“ وہ اس کے ساتھ چلا آیا۔

”تمہارا موبائل کیوں آف تھا؟“

”بیٹری لو ہونے کی وجہ سے آف ہو گیا تھا۔ یہ لو

چار جنگ پر لگا دو۔“ عمر نے جیب سے موبائل فون نکال کر اسے پکارا دیا۔

”تم منہ ہاتھ دھو لو میں کھانا لگاتی ہوں۔ شوکت

جا چکا ہے۔“ مہر موبائل فون لے کر کمرے میں

آ گئی۔ عمر منہ ہاتھ دھو کر کچن میں آ گیا۔

”میں لے آؤ۔“ اس نے اسٹول کھینچ کر

شیانے کے قریب کیا۔ مہر نے کھانا گرم کرنے میں پ

رہا۔ فریج سے رائیو اور سلا اور سونٹ ڈش نکال کر وہ

بھی اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔ پلیٹ میں سات

نکالتے نکالتے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اب کیا ہوا؟“ عمر نے نوالہ روک کر اسے

نظر میں سے دیکھا۔

”کچھ نہیں! میں چائے کے لیے پانی رکھ رہی ہوں۔“

”کھانا کھا لو پھر چائے بھی بن جائے گی۔“

”ہاں اسی لیے رکھ رہی ہوں تاکہ کھانا کھانے

تک چائے تیار ہو جائے۔“ اس نے برز جلا کر ساس

پین اوپر رکھا اور دوبارہ کھانا کھانے کی۔ ”عمر! میں تارا

آپی کو دیکھنے کے لیے جانا چاہتی ہوں۔“ چائے

دے کر اس نے جلدی سے برتن سمیٹے۔ عمر کو اس کی

اس قدر جلدی سمجھ میں آ گئی۔

”تارا آپ! بالکل ٹھیک ہیں تم صبح چلی جانا۔“ وہ

رسانیت سے بولا۔

”نہیں عمر! میں ابھی جاؤں گی۔“

”مہر! وہ سو رہی ہوں رہی گی ورنہ میں فون پر

تمہاری ان سے بات کروا دیتا۔ تم صبح۔۔۔۔۔“

”میں صرف ایک نظر ان کو دیکھنا چاہتی ہوں۔“

اس نے عمر کی بات کاٹ دی۔

”ٹھیک ہے۔“ وہ کندھے اچکا کر جلدی جلدی

چائے کے ٹھونٹ لینے لگا۔ تارا آپ کی ذیلیوری

قریب تھی اور ان سلسلے میں کوئی پیچیدگی تھی۔ اسی

لیے وہ اسپتال میں داخل تھیں۔ ماما ان کے پاس

اسپتال میں تھیں پاپا کسی کام سے کراچی گئے ہوئے

تھے۔ مہر کو یقین تھا کہ عمر اصل بات اسے نہیں بتا رہا

اسے حسب سابق بہلایا جا رہا ہے اسی لیے وہ تارا

آپی کو دیکھنے کی غرض سے یہی تھی۔ عمر اس کی کیفیت سمجھ

رہا تھا اس لیے رکنے پر زیادہ اصرار نہیں کیا۔ تقریباً

سیڑھے گیارہ بجے ان کی اسپتال سے واپسی ہوئی

تھی۔ کپڑے بدل کر عمر سونے کے لیے ایت گیا۔

مہر چیزیں سمیٹ کر جگا پر رکنے کے بعد سونے کے

لیے آ گئی۔ وہ اب میر تو عمر گھر کے ہر فرد کا خیال

رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ وہ ابھی تکیہ سیدھا کر رہی

تھی جب عمر نے اسے پکارا۔

”مہر! یہاں میرے پاس آؤ۔“ وہ فوراً دوسری

سائیڈ پر آ گئی۔ عمر نے پیچھے سرک کر اس کے لیے جگہ

بنائی۔ مہر جھکتے ہوئے کنارے پر ٹپکتی۔ ”مہر پاپا

سیدھے ریلوے“ میر کے لہجے میں بابا کی حلاوت تھی۔

مہر نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ عمر دیکھ رہا تھا کہ وہ پچھلے کئی

دنوں سے دوسروں پر بہت زیادہ انحصار کرنے لگی تھی۔

اس کی ذاتی رائے جیسے ختم ہوتی جا رہی تھی یا پھر وہ نہ

چاہتے ہوئے بھی دوسروں کی ہر بات مانتی تھی۔ ”مہر!

تم مجھ سے ناراض ہو؟“ عمر نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

مہر کا جسم ٹھنڈا پڑنے لگا۔

”نہیں!“ وہ بدلت ہوئی۔

”پھر بات کیوں نہیں کرتی ہو؟“ وہ بڑی نرمی سے

دریافت کر رہا تھا۔ عمر کی محبت ایک طرف لیکن مہر نے

اس کا یہ انداز کب دیکھا تھا۔ اس کی دھڑکنیں منتشر

ہوئے تھیں۔

”بات کرتی تو ہوں۔“ اس کا لہجہ پست تھا۔

”تم یہ کیوں کہتی ہو کہ سب تمہیں اہمیت نہیں

دیتے؟“ یہ بالکل غلط ہے۔“ عمر نے بڑی احتیاط سے

آواز میں مہر جیسے پہلے ہی تیار تھی۔ اس نے فوراً

سکھ شروع کر دیا۔ ”مہر! بڑی محبت سے اسے

اپنے قریب لایا۔“ پاگل ہو تم بالکل۔“ وہ اس کے

ہاں بھلا رہا تھا۔ ”تم یہ کیوں نہیں سوچتیں کہ سب

تمہیں اتنا چاہتے ہیں اتنا چاہتے ہیں کہ تمہیں

پریشان نہیں دیکھ سکتے۔ تمہیں دھی نہیں کرنا چاہیے۔

جانتی ہو مہر! تم بڑی خوش نصیب ہو میں خود تو دنیا کی

ہر تکلیف برداشت کر سکتا ہوں لیکن تمہاری آنکھ میں

آنسو بھرتے برداشت نہیں ہوتے۔ یقین کرو اور پاپا

نے خود منع کیا تھا کہ مہر بہت نازک ہے۔ اسے

میرے متعلق کچھ نہ بتانا وہ بہ نہیں سکے گی۔ سب کو

تمہارا خیال ہے کہ ہر دھندہ خود پر ہتھ پڑتا ہے تمہیں خوش

دیکھنا چاہتے ہیں۔“

”ہاں عمر! یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔“ وہ خیال

انداز میں بولی۔

”اور پاپا کی وفات کے بعد جی مہر مجھے تمہاری

ضرورت تھی تمہارے لفظوں کی۔“ اس کی بجائے مجھے

سہارا دینے کے تم نے سب کو تصور وار ٹھہرایا اور خود

ساختہ خود ترسی میں مبتلا ہو گئیں۔“ وہ اسے اس کی بے

وقوفی بتا رہا تھا۔

”آئی ایم سوری عمر! ریلوے سوری لیکن تم

انداز نہیں کر سکتے میں کس قدر ندامت محسوس کر رہی

تھی۔“ وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

”میں جانتا تھا اسی لیے تمہیں سنبھلنے کا موقع دینا

چاہتا تھا۔“ عمر نے اس کے کندھے پر ہاتھ پھیلا دیا۔

”تمہیں پتا ہے مہر! میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔“

وہ اسی پڑا اثر لہجے میں بولا۔

”ہاں عمر! پہلے مجھے پتا نہیں تھا لیکن اب مجھے

یقین ہے۔“

”کیا واقعی تمہیں یقین ہے؟“ وہ اسی انداز میں

کہہ رہا تھا۔

”ہاں مہر! آئی ایم شیور!“ وہ اپنی ہی رو میں تھی۔

”یہ بات ٹھیک نہیں مہر! تمہیں یہ یقین آچکا ہے

کہ میں ہر بار تم سے کتنی کتنی کتنی کتنی کتنی کتنی

پھر بھی تم نے قدر نہیں کی۔ ویسے ہی امانی اسٹری

رنگی ہو؟“ عمر کا انداز شرارتی ہو گیا۔ مہر اس سے

ایکانت بدلنے پر کھبرا کر اٹھی لیکن عمر دراز نے ایسا

کرتے نہ دیا۔ ”ایسے نہیں اوسدہ کرو اب کبھی بھی اس

طرح کا اتنا سیدھا نہیں سوچو گی۔ تمہیں پتا ہے مہر!

محبت سے زیادہ اعتبار ضروری ہوتا ہے۔ مجھے بھی بے

اعتبار مت کرنا۔“ سرکوشی میں کہتے ہوئے اس نے مہر

کو اپنے حصار میں لیا۔ مہر کی سانسیں رکنے لگیں۔

”عمر پلیز!“ اس کے حلق سے پھنسی پھنسی

آواز نکلی۔

”انتظار کا موسم بڑا گیا اعتبار کا موسم آچکا مہر! اب

یہ ٹریز باجواز ہے۔“ اس نے بڑی نرمی سے کہتے

ہوئے مہر کی پیشانی کو چھوا۔

”ہاں واقعی اعتبار کا موسم آچکا ہے۔“ مہر نے

گہری طمانیت سے سوچا اور عمر کے کندھے پر رکھ کر

آنکھیں موند لیں۔ اب اسی اطمینان اور اعتبار کے

ساتھ زندگی کا سفر بہت سہل نہ رہتا تھا۔



صباحِ دلجو

اریشہ غزل

اسی خیال میں گزری ہے شام دردِ اکثر
کہ دردِ حد سے بڑھے گا تو مسکرا دوں گا

تو آسمان کی صورت ہے گر پڑے گا کبھی
زمین ہوں میں بھی مگر تجھ کو آسرا دوں گا

الگ تھیں پھر ان کی حفاظت کرتے پھر وہ اس کا موڈ
خراب ہو چکا تھا۔

”آپ کانوں میں روئی ڈالے بیٹھے ہیں کچھ
بولتے ہی نہیں۔“ شمرہ نے ایک بار پھر انہیں ٹوکا تھا جو
بظاہر کتاب پڑھنے میں مصروف لگ رہا تھا۔ یہ اس کی
پرانی عادت تھی۔ سونے سے پہلے کچھ نہ کچھ پڑھا کرتا تھا
اور یہ عادت اس وقت بھی کام آتی تھی جب شمرہ غصے میں
ہوتی تھی اور وہ اس سے بحث سے بچنا چاہتا تھا۔ اس
وقت بھی اسے اندازہ تھا کہ وہ برہم ہے اس لیے کتاب
سے بظاہر بے نیاز بناتا بیٹھا تھا جب اس نے اچانک ٹیبل
کی طرح چھپٹا مار کر اس سے کتاب چھینی تھی۔

”کیا ہے..... بولتے کیوں نہیں؟ کب سے کہہ
رہی ہوں مگر مجال ہے جو مسئلے کا حل ڈھونڈ سکیں۔ میری
جان پر مسئلے ہی برساتے رہتے ہیں۔ اب بتائیں ہوگا
کیا؟“ دو ناراض نظروں سے اسے گھور رہی تھی۔

”بھئی میں انہیں منع تو نہیں کر سکتا..... آخر ان کا بیٹا
ہوں ان کا حق ہے مجھ پر.....“ ایاز نے کھنکار کر کہنا چاہا۔
”واہ بھئی واہ۔ حق کی بات خوب کہی۔ ہمارے حق تو
بڑے پورے ہو رہے ہیں جو ان کا حق یاد آ رہا ہے
وہ لمحوں میں گیلی لکڑی کی طرح سلگ اٹھی تھی۔“

”آپ بھی کمال کرتے ہیں ایاز۔ اماں بی کورہنے
کے لیے ہم ہی نظر آئے ان کے تین بڑے بیٹوں کی
موجودگی کے باوجود..... پھر تین کمرے کے اس مختصر
سے فلیٹ میں وہ رہیں گی کہاں؟ ایک ہمارا کمرہ ہے
ایک بچوں کا اور تیسرا لاؤنج..... جہاں سب مل کر بیوی
دیکھتے ہیں۔ اب آپ ہی بتائیں وہ اگر آ بھی گئیں تو
رہیں گی کہاں؟“ شمرہ کے ہاتھوں کی طرح اس کی زبان
بھی خوب چل رہی تھی۔ جب سے آفس سے آکر ایاز
نے اماں بی کے آنے کی اطلاع دی تھی۔ اسے سوچ
سوچ کر ہول اٹھ رہے تھے۔ آئندہ کے تفکرات پریشان
کر رہے تھے۔ اماں بی کے وہاں رہنے کی صورت میں
ان کی دونوں بیٹیاں بھی یقیناً مبینے میں دو بار صرف
صورت دکھائیں بمعہ بچوں کے۔ رابی تو مصروفیت
ہونے کے بہانے وہ اکثر ان کے گھر آنا مال جاتی تھیں
مگر اب..... تو لازماً انہیں ماں کی محبت کی خاطر آنا پڑے
گا اور پھر ان کی خاطر دریاں الگ کر دیا اور دل چاہے نہ
چاہے مسکرا کر ان سے ملنا پڑے گا پھر ان کے شرارتی
بچوں کی حرکتیں الگ برداشت کرنی پڑیں گی۔ ایاز تو یہ
سب سمجھتے ہی نہیں ہیں۔ ابھی تو کتنی مشکل سے کیٹیاں
ڈال کر نیا کارپٹ ڈلوایا تھا۔ گھر کی آرائش کی چیزیں

چاہتے۔ "وہ اتنے دھم سے میں بھی باز نہ کرتی تھیں۔
"میں میں بھی چاہتی ہوں! اب آپ خوش
رہیں مجھے آپ کی بات میں چاہیے۔" یازدہ برس تھے
اور وہ روز سے چھپنے والی نمرہ کے اندر جیسے آگ لگ
رہی تھی۔

"میری خوش! کچھ چاہتے ہیں۔ ان کی خوشی کے
لئے میں اپنی خوشیوں کو قربان کر دیتی ہوں۔" وہ
بڑبڑاتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی کی ٹون کی تیل کی تو
اس نے بیزارگی کے ساتھ فون اٹھایا تھا۔ حالانکہ اس
وقت اس کا کسی سے بات کرنے کا موڈ نہیں تھا۔ سر
لیٹ کر پڑ جائے۔ دل ایسا ہی ہو رہا تھا۔

"بھابی! میں مریم بات کر رہی ہوں۔ فیاض بھائی
نے بتایا تھا کہ اماں آپ کی طرف آئی ہیں۔" سلام دعا
کے بعد مریم پوچھ رہی تھی۔

"سچ سنا ہے۔ اب فیاض بھائی تو ہمیشہ سے ہی
بدلتا نظر آ رہے ہیں مگر تمہارے بھائی کو تو ہشتوں کی شرم و حیا
اور پاسداری رکھنی تھی اس لیے وہ اماں کو لے آئے
ہیں۔" وہ لہجے میں تنفر بھر کر کہہ رہی تھی۔ اس کے ذرا
لفظوں سے اس کے موڈ کا اندازہ ہو رہا تھا۔ دوسری
طرف مریم اس کے لہجے پر گھبرائی۔

"اچھا تو پھر میں کسی دن اماں سے ملنے آؤں گی۔
میری طرف سے انہیں سلام کہیے گا اور بھائی کو بھی۔ اس
نے کہتے ہوئے رابطہ منقطع کیا تھا۔

"میرا سلام کہیے گا۔" اس نے گردن جھنجھکی تھی۔
"چینی مسیت۔" یہ بات ان کی آمد کا سالہ بھی شروع
ہو جائے گا۔ وہ جھنجھکتے ہوئے لیٹی تھی تب ہی ایاز
کمرے میں آئے تھے۔

"رانی صاحبہ کا موڈ خراب لگ رہا ہے۔" ایاز اس
کے پاس آ بیٹھے تھے۔

"بات نہیں کریں مجھ سے۔۔۔۔۔ آپ نے وہی کیا جو
آپ کا دل چاہا۔ دوسرے بھائیوں سے سبق حاصل
کرتے تو بھی اماں کو ساتھ لے کر نہ آتے۔ مینے بھائی

بات اور تھی اور اب مستقل رہنے کی۔۔۔۔۔ اب ان کی
ساری ذمہ داریاں ہمارے سر پر پڑ جائیں گی۔ آپ کی
تخواہ پہلے ہی کون سی زیادہ ہے۔۔۔۔۔ اوپر سے ان کی دوا کا
خرچہ اور ہر کے ہزار اخراجات۔۔۔۔۔ وہ بڑبڑاتی تھی۔

"پہلی بات تو یہ کہ اماں بیمار نہیں ہیں اور نہ ہی کوئی
دعا دیتی ہیں۔ دوسرے ان کے اخراجات بھی نہ ہونے
کے برابر ہیں جس کا تم دوسرے بھائیوں سے
تیسرا خرچہ میں نہ رہا ہوں! انواروں کا اور نہ ہی
بوجھ پڑا تو۔۔۔۔۔ تم کیوں فکر مند ہو رہی ہو۔" ایاز نے
نرمی سے اسے سمجھایا۔

"پھر بھی یہ تو زیادتی والی بات ہے۔ قینوں پر
غیش سے رہیں اور ہم خواہ مخواہ مصیبت پیشیں۔۔۔۔۔ وہ
ایک سی رٹ لگائے بیٹھی تھی۔

"دیکھو شمرہ! زیادتی کی بات کرتی ہو تو وہ تمہارے
ساتھ نہیں بلکہ ان آگے جانے والوں کے ساتھ کی ہے۔
انہیں نہ رکھ کر۔۔۔۔۔ ان کی حیات و موت تمہارے ہاتھ
دکھا کر۔۔۔۔۔ تم کیا کرتی ہو! اس وقت ان کے لیے
بائیں۔۔۔۔۔ رہنا چاہیں یہ وہ انداز ہے جس سے وہ
بے حال ہو جائیں گی۔ اور ایک چور کے ہاتھ سے ان کا
بے رحم مزید اس کی موت دکھانا۔ ایسا بھی ان کو کھاتے
ہوں کو پسند نہیں آتا۔ ان ہماری کسی گل نہ بنے ہمیں
اس سماعت میں ملے تم انہیں بائیں۔۔۔۔۔ وہ کہتے
کہتے اداس ہو گئے اور ان کے پیچھے موڑ کر سینے پر ایک
لمحے کے لیے شمرہ کو افسوس ہوا۔ وہ اپنی ہی سوچ رہی تھی۔
لڑتی جھگڑتی نہ جانے کب سو گئی اسے خبر ہی نہ ہوئی

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

وہ سمجھتی تھی فائقہ بیگم کے آنے سے کام میں اضافہ
ہوگا مگر غیر معمولی طور پر انہوں نے اس کے کام بانٹ
لیے تھے۔ صبح میں بچوں کو ایاز اسکول چھوڑتے ہوئے
آفس جاتے تھے۔ دوپہر میں شمرہ کو اپنے کام چھوڑ کر
انہیں۔ نا پڑتا تھا مگر اب فائقہ بیگم انہیں۔۔۔۔۔ انہیں
اور بچوں کا دل بھی ان سے لگا رہتا تھا۔ پہلے ماں کا گھیراؤ

کیے وہ اس کے کان کھاتے رہتے تھے اب فائقہ بیگم کی
صورت میں انہیں بہتر دوست اور ساتھی میسر آ گیا تھا۔
دوا کی کے ساتھ وہ گھر سے قریبی پارک جایا کرتے تھے۔
اس کے علاوہ سودا سلف بھی وہی لادیتی تھیں۔ شروع
میں شمرہ نے انہیں منع کرنا چاہا پھر ان کے صرار پر یہ
ذمہ داریاں ان پر ڈال کر بھول گئی۔

"بھئی اپنے ساتھ اپنی ساس کو بھی لے آیا کرو۔"
شمرہ کی ماں سے کہتے ہوئے بولیں۔

"امی! گھر میں تو برداشت کرتی ہوں۔ کیا اب
ہر جگہ انہیں کائے پھروں۔؟" اس نے سر جھنجھکتے
ہوئے بتایا۔

"شمرہ! وہ تمہاری ماں کے برابر ہیں بیٹا۔ بولتے
ہوئے سوچ گیا کرو کیہ کہہ رہی ہو؟" انہوں نے اسے
تنبیہ کی۔

"امی! موڈ آف نہ کریں۔ اتنے دنوں کے بعد آتی
ہوں۔ آپ کو میرے بجائے میری ساس کی فکر ستا رہی
ہے۔۔۔۔۔؟ اپنی باتیں کریں نا۔۔۔۔۔ یہ بتائیں نمرہ کے
سسرال سے کوئی آیا تاریخ لینے۔۔۔۔۔؟ اب تو اسے بی۔
اے کرے بھی سال بھر ہونے کو آ رہا ہے۔"

"فرز کی بڑی دو بہنیں بیٹھی ہیں۔ پہلے ان کا کہیں
ہو جائے تو پھر سوچیں گے وہ لوگ۔" انہوں نے اصل
بات بتائی۔

"اس طرح تو کوئی بات یا شرط انہوں نے منطقی
کرنے سے پہلے نہیں رکھی تھی۔ اب اس قسم کی باتوں
کا کیا جواز ہے؟ ایک سال بعد انہیں یہ یاد آ رہا ہے کہ
ان کی دونوں بیٹیاں سنواری بیٹھی ہیں؟" شمرہ نے
پریشانی سے کہا۔

"کیا کہہ سکتے ہیں بیٹا! اب تو جو وہ نہیں گے وہی
ماننا ہوگا۔" وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولیں۔

"امی! ایک تو آپ سیدھی بہت ہیں جو انہوں نے
کہا آپ نے سن لیا۔ ذرا غصہ دکھانا تھا۔" وہ انہیں مشورہ
دے رہی تھی۔

"بیٹا ایسے معاملوں میں گرما گرمی اچھی نہیں ہوتی۔
سعید بھی ان سے بات کرنا چاہتا تھا مگر میں نے اسے منع
کر دیا۔ ابھی کون سی نمرہ کی عمر نکلتی جا رہی ہے۔ اچھا ہے
وہ کوئی کمپیوٹر کورس کر لے گی۔ سال بھر میں ہو سکتا ہے
فرز کی بہنوں کے بھی نصیب مل جائیں۔" وہ اپنی کہہ
رہی تھیں۔

"بھئی! کہیں ہیں۔ اتنی دیر ہو گئی ہے مجھے آئے
ہوئے۔ کیا کمرے میں سونا منار ہی ہیں؟" وہ طنز سے
بولی تھی۔

"شمرہ! خدیجہ بیگم نے اسے ٹوکا تھا۔" بیٹا وہ صبح
سے اٹھتی ہوئی ہے۔ نہیں پتہ ہے سعید کے آفس کا راستہ
بالکل الٹ ہے اور بچوں کا اسکول باطل الٹ راستہ پر
ہے۔ اس لیے وہی بے حیا کی پٹ سب کو ناشتا کرتی
ہے پھر بچوں کو اسکول چھوڑتی ہے۔ سودا سلف بھی خود ہی
لاٹی ہے۔ میرے تو جب سے جوڑ درد کرنے لگے ہیں
کچھ کیا ہی نہیں جاتا۔ بیٹھ جاؤں تو کھڑا نہیں ہو جاتا اور
اگر کوشش کر کے کھڑی ہو جاؤں تو پھر بیٹھا ہی نہیں
جاتا۔" وہ اپنا حال سنارہی تھیں۔

"یہ لیں باجی! اگر ما گرم چائے اور سموئے لے۔۔۔۔۔" نمرہ
ٹرے اٹھائے کمرے میں آئی تھی۔

"سموت کس سے ملکا۔ بہت ٹھیک ہیں؟"
شمرہ نے کھاتے ہوئے تعریف کی۔

"کل بھابی نے بنا کے دیے۔ آپ کو پتا ہے انہیں
کو کنگ کا کتنا شوق ہے۔ سموئے اور رول تو وہ گھر میں
ہی بنا کر پختی ہیں۔ کوئی آئے تو فوراً تیل سرد کر دو۔"
نمرہ بتا رہی تھی۔

"یہ تو ہے۔ ہماری بھابی ہیں بہت سکھڑ۔۔۔۔۔ شوہر
کے ساتھ ساس کو بھی مٹھی میں کیے بیٹھی ہیں۔" وہ طنز سے
کہہ رہی تھی۔

"بیٹا! کبھی بیٹھا بھی بول لیتے ہیں۔" خدیجہ بیگم کو
اس کی اس سوچ پر افسوس ہوا۔

"باجی! آپ بچوں کو ساتھ کیوں نہیں لائیں؟" نمرہ

نے اس کا دھیان بیٹایا۔

”بھئی وہ اپنی وادی کے ساتھ مصروف تے۔ وہ انہیں اپنے ساتھ میرے جیٹھ کی طرف لے کر گئی ہیں۔ میں نے سوچا یہ لوگ اصرار کرتے ہیں میں یہاں ہر آؤں۔“ اس نے وضاحت دی۔

”اور ویسے بھی مجھے امی سے تمہارے سلسلے میں بات کرنی تھی مگر یہاں خاموشی حاوی ہے۔ سب کچھ لڑکے و لڑکیوں پر چھڑ رہا ہے۔“ وہ اپنی ذاتی رائے دے رہی تھی۔ لمحوں میں عمرہ کا چہرہ پھیکا پڑا تھا۔

”تم کیا چاہتی ہو؟“ یہی پرسی پر سرسوں جھالوں؟ کبھی کبھار جلد بازی سارے معاملات خراب کر دیتی ہے اور پھر فراز اچھا لڑکا ہے۔ محنتی اور شریف بھی۔ میں بلا وجہ کی جلد بازی کی خاطر اتنا اچھا رشتہ نہیں گنونا چاہتی۔ انہوں نے ایک سال اور مانگا ہے۔ سال بھر اور سہی۔ اتنے میں نمبر جو کورس کرنا چاہتی ہے وہ کر لے گی۔“ وہ دھیمے لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

”تم کب آئیں شمرہ اور بچے کہاں ہیں؟“
بھائی کی آمد نے ماحول کو بالکل بدل دیا تھا۔

”مجھے آئے تو کافی دیر ہو گئی۔ آپ شاید ساری
تھیں۔“ وہ مبہم سا مسکرائی۔

”ہاں۔ بچوں کو یوشن بھیج کر میں ذرا اپنی نیند چوری کر لیتی ہوں۔ تم سناؤ بڑی دہلی لگ رہی ہو۔ کیا ڈانٹنگ شروع کر رکھی ہے؟“ وہ نمبرہ کی نکالی چائے کا گگ ہاتھ میں لیتے ہوئے تنقیدی نظروں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے بولیں۔

”ڈائمنگ کی کیا ضرورت ہے۔۔ کلنے کے لیے اور بہت سے معاملات ہیں۔“ وہ سوچ کر رہ گئی مگر پولی صرف اتنا ہی۔ ”ڈائمنگ کہاں؟ ہماری ساس مستقل آگئی ہیں بس ان کے خوف نے مسلم کر رکھا ہے۔“

”وہ تو بڑے نرم مزاج کی مالک ہیں۔ تم کیوں ان سے اتنی خوفزدہ رہتی ہو بلکہ میرا تو خیال ہے وہ تم سے رہتی ہوں گی؟“ وہ ہنس کر مزاحیہ انداز میں اس کا دل جلا

رہی تھیں۔

”خیر! اب ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ اس کے
چہرے پر تاؤ کی کیفیت صاف دیکھائی۔

”وہن! آج رات کھانے میں تھوڑا اہتمام کر لینا۔
شرہ اور ایاز یہیں کھانا کھائیں گے۔“ خدیجہ بیگم نے
ماحول کے تناؤ کو کم کرنا چاہا۔

”اُمی! میں آپ کو یہی بتانے کو آئی تھی کہ سعید کے ساتھ جہ جاتا ہے۔ اُمی کا فون آیا تھا۔ بہن بات کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔ وہ بہت یاد دہا رہے ہیں۔ آپ کہیں تو چلی جاؤں.....؟“ وہ اپنے طور پر جانے کے ساتھ اجازت بھی مانگ رہی تھیں۔ شمرہ نے ان کی چالاکی کو بغور نوٹ کیا۔ اسے اچھی طرح اندازہ تھا اپنی اکتوتی بہن کی بات کے رویے۔ اس کی آمد کے ساتھ ہی انہیں کہیں نہ کہیں جانا یاد آ جایا کرتا تھا اور مجال ہے جو اُمی اور بھائی انہیں روک سکیں۔ آئے دن تذکرہ اس کر رہیں۔ ان کی ایسی ہی زیادتیوں پر اس وقت جتنا تھا، روزِ بیکر وہی ہو جاتی تھی۔

میں نے جبکہ اس ایسے کوئی پوچھتا رہا ہے
میں نے صرف سے یہی سہاویں طبیعت یہ چاہیے
سہاویں سے بہت زیادہ ہے۔

”جی ضرور“ وہ ہوا۔ اس نے کہا کہ میں نے
 ”شر دے تو کوئی پتہ نہیں دے گا۔“ میں نے کہا کہ
 میں ایک بار تو آئی ہی ہو۔“ وہ جھٹکتے ہوئے
 کہیں۔ ان کے کمرے سے اُٹتے ہی تو وہ یہاں
 سے اُٹ رہی تھیں۔

آپ کی لاڈلی بیوی جیم کو: "اس کا موڈ خراب ہو چکا تھا۔

”بیٹا! بری بات ہے۔ تمہاری یہی طنز کرنے کی عادت اسے اچھی نہیں لگتی اور مجھے بھی۔“ وہ نرمی سے

اے ٹوکتے ہوئے بولیں تو شمرہ باقاعدہ ناراض ہو گئی۔
 ”میں ہی پاگل ہوں جو ہر دفعے اپنی مصروفیت میں
 سے وقت نکال کر یہاں چلی آتی ہوں مگر یہاں قدرتی
 نہیں ہے۔ نہ ماں کو اور نہ ہی کسی اور کو۔۔۔۔۔“ وہ خفگی سے
 بہہ رہی تھی۔

”...باجی! آپ کیوں اتنی سی بات کو دل سے لگا رہی ہیں؟ بھابی کو جانے دیں۔ میں آپ کے لیے اہتمام کروں گی! آخر کو کنگ کا کورس کر رہی ہوں۔ کچھ تو جوہر نکالتے کا موقع ملے گا ورنہ بھابی ہی پکائی ہیں۔“ نمرہ نے اس کا موڈ ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

”اگر بس رہے دو۔ میں ابھی ایاز کو فون کر کے
باتی ہوں۔ مجھے نہیں رکنا یہاں شرم تک۔“ وہ ہنوز
خفا سی۔

”تجائے تم کیوں اتنی عجالت پسند اور طنز مزاج ہوئی جا
ری ہو۔ شادی سے پہلے تک تو اچھی بھلی تھیں۔ اب میں
کہہ رہی ہوں۔ آرام سے بیٹھو۔“ خدیجہ یکدم گونسنے
لا۔ ان کی ٹانگیں لپک رہی تھیں۔ ”بیٹا کیا ہوتا جا رہا
ہے تمہیں؟“ ”کیوں اتنی ناراض رہتے ہو زندگی
سے۔“ ”وہاں سے“ ”وہاں کونساں سے اس سے
کو چھو رہی نہیں۔“

اور اسی بات پر مزاج خراب ہو جاتا ہے۔ آپ کو معلوم ہی ہے ایاز کے والد کے انتقال کے بعد وراثت میں سے جو حصہ ایاز کو ملا تھا وہ انہوں نے کاروبار میں لگا لیا تھا مگر وہ ناکام رہا اور سارا روپیہ ڈوب گیا۔ لوٹ کر انہیں پھر نوکری مل گئی اور آج کل نوکری سے اتنی رقم نہیں ہو پاتی کہ ہم کھل کر اخراجات کر سکیں۔ بچوں کو اچھے اسکول میں تعلیم دلوا سکیں۔ اچھا پہن سکیں یا کم از کم سینڈ ہیڈ کار بنی لے سکیں۔ یہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہیں جو میرے اندر اڑتی رہتی ہیں۔ ان کے بڑے تینوں بھائی کاروبار میں پیسہ لگا کر کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ چاہے تو یہ تھا کہ وہ ایاز سے بڑھ کر اپنی ماں کا خیال رکھتے مگر انہوں

نے یہ اضافی ذمے داری بھی ایاز پر ڈال دی ہے۔ میں اس بات سے بھی بہت پریشان رہتی ہوں۔“ وہ اپنے دکھ انہیں سنارہی تھیں۔

”تمہاری ساس بہت اچھی عورت ہیں۔ ایسے نرم مزاج لوگ بہت حساس ہوتے ہیں۔ تمہاری سسکی تمہارے ساتھ۔ ان کا خیال رکھا کرو اور انہیں ایاز کی نہیں بلکہ اپنی ماں سمجھو گی تو کبھی ان کا وجود اضافی ذمے داری نہیں لگے گا۔ جب کوئی نیا بندہ گھر میں اضافہ کرتا ہے تو اس کا رزق اللہ پہلے سے ہی اتار دیتا ہے۔ انسان تو صرف بہانہ ہوتا ہے اسے ملنے کا۔ تو سکتا ہے ایاز کی جی جی پر مشن ہو جائے پھر سب بندے وہ تو اوپر بیٹھا ہے۔ تم دیکھنا ان کی پیشہ ورانہ زندگی میں اللہ برکت ڈالے گا۔ بزرگوں کا وجود باعث رحمت و برکت ہوتا ہے۔ ان سے پیار کی، اکتھٹ کا اظہار کر کے اللہ کی تسکین کو نہ دینا۔“ وہ اس کی کوتاہیوں کا احساس برقرار رہی تھیں۔

”کیا کروں امی! مجھے معلوم ہے میرا رویہ غلط ہے، نامناسب ہے مگر نا آسودہ خواہشوں کے ساتھ تنگی کا احساس روئے کے ساتھ انسان کو بھی کڑوا بنا دیتا ہے۔ ایک وقت مؤرخ ہوتا ہے تو دوسرے وقت کسی چیز کے نہ ہونے کا احساس دل دکھا رہا ہوتا ہے۔ میں کیا کروں؟“ وہ الجھی ہوئی تھی۔

”تب ہی کہتے ہیں اپنے سے نیچے والوں کو دیکھنا چاہیے تاکہ انسان ہر حال میں شکر ادا کر سکے کہ ہم اس سے بہتر ہیں۔ اپنے سے اوپر والوں کو دیکھتے رہو گی تو کبھی قناعت و شکر کی دولت نصیب نہیں ہوگی۔“ وہ اسے سمجھا رہی تھیں، بہلا رہی تھیں اور کم از کم اس وقت ان کے سمجھانے کا اثر تھا یا بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ کئی روز اس کا موڈ اچھا رہا اور یہ بھی ایذا کئی دنوں سے نوٹ کر رہے تھے کہ وہ ذرا ذرا سی بات پر بھڑک نہیں رہی تھی اور نہ ہی ان کی زبان کو خوش و غفلت گونے ہوتے تھے حتیٰ کہ مریم ایک دن رہ کر چلی گئی اس پر بھی اس نے چیخ چیخ

۵۲۰۱۱

ج: بعد نماز عشاء پڑھتی رہیں۔ جب تک مسئلہ حل نہ ہو جائے۔

انتہا کر رہیں کہ یہ رشتہ چھوڑنے کا کہ نہیں۔

بعد یہ بدشگونی

ج: آپ اپنے شوہر کے ساتھ ہی رہیں۔

جب گھر میں چینی آئے اس پر تین مرتبہ سورہ منزل اول و آخر تین تین مرتبہ درود شریف کے ساتھ پڑھ کر دم کر دیں اور وہ چینی سب گھر والوں کے استعمال میں آئے۔ ان شاء اللہ ربی جنت خلدی ہو جائیں گے۔

شیخ عبدالرحمن

ج: بھابی یہ اثرات ہیں اور بھائی کے کام یہ بھی بندش ہے۔ بھابی ہر نماز کے بعد گیارہ مرتبہ آیت الکرسی پڑھ کر اپنے اوپر دم کریں۔

درد و بار کے لیے بھائی "یا رزاق یا فلاح" کا ورد کریں۔ عشاء کی نماز کے بعد تین سو تیرہ مرتبہ اول و آخر درود شریف گیارہ گیارہ مرتبہ۔ پورا دن ورد رہیں۔

فرخندہ..... بہاول پور

ج: بعد نماز فجر سورہ الفرقان کی آیت نمبر 74۔ مرتبہ پڑھیں۔ اول و آخر گیارہ گیارہ مرتبہ درود شریف۔ فرخندہ خود یہ وظیفہ پڑھیں و مانجیں کریں۔

فرزانہ حبیب اکبر..... لاہور

ج: جب بھی دیکھیں یا پیسے رکھیں۔ "بسم اللہ الرحمن الرحیم" پڑھ کر رکھیں۔ ان شاء اللہ چوری نہیں ہوگی۔ فجر و مغرب میں تین تین مرتبہ آیت الکرسی اور چار قل پڑھ کر دم کریں۔ اپنے اوپر اول و آخر تین تین مرتبہ

درود شریف کے ساتھ۔

سعدیہ قمر..... لاہور

ج: صبح و شام (99) بار سورہ النہل سورہ انعام پڑھ کر پانی پر دم کر کے سب کو پلائیں۔

"یا حکیم" 90 مرتبہ بعد نماز ظہر اول و آخر گیارہ گیارہ مرتبہ درود شریف روزانہ پانی پر پڑھ کر ان کو پلائیں۔ روزانہ یہ عمل کریں تمہاری نماز کے بعد۔ پڑھتے وقت والدین کے لیے ان کے دل میں محبت پیدا ہو۔ مسلمان تین ماہ کرنا تب۔ بغیر نادمہ۔

صباء حسن..... سیالکوٹ

ج: سورہ طحہ کی پہلی پانچ آیات۔ گیارہ بار پڑھیں۔ پانی پہ پھونک مار کر دن میں پانچ بار پیئیں۔ ان شاء اللہ بیماری میں افاقہ ہوگا۔



نوٹ

جن مسائل کے جوابات دیئے گئے ہیں وہ صرف انہی لوگوں کے لیے ہیں جنہوں نے سوالات کیے ہیں۔ عام انسان بغیر اجازت ان پر عمل نہ کریں۔ عمل کرنے کی صورت میں ادارہ کی صورت ذمہ دار نہیں ہوگا۔ ای میل صرف بیرون ملک مقیم افراد کے لیے ہے۔ ronanimasail@gmail.com

روحانی مسائل کا حل کوپن دسمبر 2011ء

گھر کا مکمل پتا

مدد کا نام

گھر کے کون سے حصے میں رہائش پزیر ہیں

آپ کی شخصیت

اے ایس صدیقی

ہماری زندگیوں میں تنقید کے تجربے لازمی ہوتے ہیں۔

تنقید کے ضمن میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہم یہ جانیں کہ کون سی تنقید Valid ہے اور کون سی Invalid (ناجائز) ہے۔

نقطہ تنقید ہماری خود اعتمادی کو نقصان پہنچاتی ہے۔ جب کہ تنقید ہماری خود اعتمادی میں اضافہ کرتی ہے۔

آدمی پر تنقید ہوتی ہے تو اس کے اندر تشویش ابھرتی ہے۔

آپ پر تنقید ہو تو آپ کو کیسا لگتا ہے؟ اس بارے میں تین باتوں پر توجہ دینی ہوتی ہے۔

۱:- خود تنقید پر۔

۲:- تنقید کرنے والے کے رویے پر۔

۳:- آپ کے اپنے رد عمل پر۔

پہلے تنقید کے بات۔

۱:- غور سے سنیں کیا کہا گیا ہے۔ کیا اس میں کوئی سچائی ہے؟

۲:- طے کریں کہ تنقید کیوں کی گئی ہے۔

۳:- اگر سمجھ میں نہ آئے تو وضاحت طلب کریں۔

۴:- سچائی کے بارے میں طے کرتے ہوئے تھوڑا سا وقت لیں اور طے کریں۔

۵:- کیا ساری بات سچی ہے؟

۲:- کیا صرف تھوڑی سی سچائی ہے؟

۳:- کیا سب غلط ہے؟

۵:- اگر آپ کو شبہ ہو تو دوسرے لوگوں سے بھی پوچھیں۔

۶:- اگر ضرورت ہو تو اپنی روش بدلیں۔

اب دوسری بات تنقید کرنے والے کی روش۔

۱:- کیا یہ جارحانہ انداز میں تھی۔

۲:- جس طرح تنقید کی گئی اس کو آپ نے کس طرح محسوس کیا۔

۳:- طے کریں کہ تنقید پر آپ کا عمل پر اثر انداز آیا ہوگا۔

۴:- اگر تنقید درست ہے تو اس سے متفق ہو جائیں۔ (آپ نے درست کہا)۔

اپنے محسوسات بتائیں (مجھے افسوس ہے اس پر)۔

اگر تنقید جزوی طور پر درست ہے۔ صرف ضروری حصہ سے متفق ہو جائیں۔ (ہاں ایک بات درست ہے)۔

اپنے محسوسات بتائیں۔ (مجھے آپ کے خیالات سے مایوسی ہوئی)۔

واضح طور پر بتادیں کہ باقی تنقید غلط ہے۔ (ایک بات کے سوا کوئی بات درست نہیں)۔

اگر تنقید بالکل غلط ہو اسے مسترد کر دیں (ایسی کوئی بات نہیں)۔

اپنے مثبت خیالات ظاہر کر دیں۔ (میں ذمہ دار آدمی ہوں ایسی کوئی حرکت نہیں کر سکتا)۔

وضاحت طلب کریں۔ (آپ نے ایسی بات کیوں سوچی)۔

تنقید کے باب میں کرنے والی باتیں۔ اس سے نمٹیں۔

۱:- طے کریں کہ اس تجربے سے آپ کیا سیکھ سکتے ہیں۔
Agressive (جارجیت آمیز) ہونا چاہیے اور نہ Passive یعنی انفعالی۔

۲:- طے کریں کہ روش بدلنا ہے۔
۳:- اس کے بعد اسے ذہن سے نکال دیں۔
اس پر مسلسل سوچنے کی ضرورت نہیں۔
جس طرح تنقید کرنے کے بارے میں بتایا گیا اسی طرح تنقید کرنے کے طریقے ہوتے ہیں۔
تنقید کو مثبت تعمیر بنایا جائے۔ تاکہ چیزیں درست ہوسکیں۔

تاکہ لوگوں کی روش بدلی جاسکے۔
اچھی تنقید فائدہ بخش ہوتی ہے۔
تنقید کس طرح کریں۔
۱:- طے کر لیں کیا نیت ہے اور کیا کہنا ہے۔
۲:- صرف ان باتوں پر تنقید کریں۔
۳:- اس کے لیے صحیح وقت اور صحیح جگہ طے کریں۔

۴:- مناسب الفاظ طے کریں۔
۵:- زور حرکت پر ہو فرد پر نہیں۔
۶:- بتائیں آپ کے محسوسات کیا ہیں۔
۷:- بتائیں آپ کیا تبدیلی چاہتے ہیں۔
۸:- ان باتوں کا غلبہ حق رہتا ہے چاہے تنقید مانے یا نہ مانے۔
۹:- کہیں کہ آپ اس پر بحث کے لیے تیار ہیں۔

مناسب انداز سے تنقید کرنے کا فن آتا ہو تو آپ مشکل قسم کے لوگوں سے معاملات کر سکتے ہیں۔

تنقید کرنی ہو یا تنقید سننا ہو دونوں میں آپ کا رویہ Assertive ہونا چاہیے۔ یعنی زور دار اور پر اثر اسے کسی بھی صورت میں نہ تو

ایک حس

ہومیوڈاکٹر محمد ہاشم مرزا

کنول ڈیرہ غازی سے لکھتی ہیں کہ چہرے پر تل ہیں میں انہیں ختم کرنا چاہتی ہوں۔

محترمہ آپ THUJA-Q کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین روزانہ پیا کریں پانی میں ڈال کر تین مرتبہ روزانہ پیا کریں اور اسی روز انہیں پر لگایا کریں۔

۱۴۰۰ روپے مئی آرڈر کریں۔ آپ کو APHRODITE پہنچ جائے گا اس پر شک کی ضرورت نہیں ہے۔

محترمہ آپ MERCURIO 6 کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پیا کریں۔

مرآۃ العین صندرا آباد سے لکھتی ہیں کہ کئی سال سے چھینکوں کے ساتھ زکام لگا ہوا ہے۔ نظر بھی کمزور ہوگئی ہے۔ چہرے پر مہاسے بہت نکلتے ہیں۔ نشان چھوڑ جاتے ہیں۔

محترمہ آپ AELLUMCEPA 30 کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پیا کریں۔ GRAPHITES 200 کے پانچ قطرے آٹھویں دن ایک بار لیں۔ CINERARIADROPS آنکھوں میں ڈالا کریں۔

شائع کیے بغیر علاج بتا دیں۔

محترمہ آپ BORAX 30 کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پیا کریں۔ یہ دوا کسی بھی ہومیو پیتھک اسٹور سے حاصل کریں۔

نازیہ فوزیہ نادیہ گاؤں ہائی سے لکھتی ہیں کہ ہم تینوں بہنوں کے چہرے پر بہت بال ہیں۔ جیسے مردوں کے ہوتے ہیں۔

آپ OLIMUMJACC 30 کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پیا کریں

اور میرے کلینک کے نام پتے پر 700 روپے فی کورس کے حساب سے رقم منسی آرڈر کریں آپ کو APHRODITE ارسال کر دیا جائے گا ان شاء اللہ بال ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں گے۔

نہجرات سے لکھتی ہیں کہ میرا وزن بڑھتا جا رہا ہے اور چہرے پر بال بھی ہیں۔ بہن کے سارے جسم پر تل ہیں۔ وہ کمزور بھی ہے اس کے چہرے پر بھی بال ہیں۔

محترمہ آپ PHYTOLACCA-Q کے دس قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پیا کریں چہرے کے بال ختم کرنے کے لیے دو کورس کے 1400 روپے مئی آرڈر کریں۔ آپ کو APHRODITE پہنچ جائے گا اس پر شک کی ضرورت نہیں ہے۔

محترمہ آپ VACCINIUM FLOUR 6X کی چار گولی تین وقت روزانہ کھائیں۔ آٹھویں دن آدھا کپ پانی میں ڈال کر پیا کریں۔ والدہ کی دوا کے لیے 700 روپے میرے کلینک کے نام پتے پر ارسال کریں بہن کو THUJA-Q کے پانچ قطرے تین وقت روزانہ دیں اور انہی کو تلوں پر لگائیں۔

چھوٹی کو CALCIUM PHOS 6X کی چار گولی تین وقت روزانہ کھائیں اور BARIUM CARB 200 کے پانچ قطرے پھر آٹھویں دن ایک بار دیں۔

مہوش نہجرات سے لکھتی ہیں کہ میرا مسئلہ شائع کیے بغیر علاج تجویز کریں۔

محترمہ آپ SABALSERULATA-Q کے دس قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پیا کریں اور میرے کلینک کے نام پتے پر 550 روپے کا منسی آرڈر کریں۔ آپ کو دوا ارسال کر دی جائے گی۔ منسی آرڈر فارم کے آخری کوپن پر مطلوبہ دوا کا نام B. BEAUTY ضرور لکھیں۔

محترمہ آپ SABALSERULATA-Q کے دس قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پیا کریں اور میرے کلینک کے نام پتے پر 550 روپے کا منسی آرڈر کریں۔ آپ کو دوا ارسال کر دی جائے گی۔ منسی آرڈر فارم کے آخری کوپن پر مطلوبہ دوا کا نام B. BEAUTY ضرور لکھیں۔

محترمہ آپ SABALSERULATA-Q کے دس قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پیا کریں اور میرے کلینک کے نام پتے پر 550 روپے کا منسی آرڈر کریں۔ آپ کو دوا ارسال کر دی جائے گی۔ منسی آرڈر فارم کے آخری کوپن پر مطلوبہ دوا کا نام B. BEAUTY ضرور لکھیں۔

محترمہ آپ SABALSERULATA-Q کے دس قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پیا کریں اور میرے کلینک کے نام پتے پر 550 روپے کا منسی آرڈر کریں۔ آپ کو دوا ارسال کر دی جائے گی۔ منسی آرڈر فارم کے آخری کوپن پر مطلوبہ دوا کا نام B. BEAUTY ضرور لکھیں۔

محترمہ آپ SABALSERULATA-Q کے دس قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پیا کریں اور میرے کلینک کے نام پتے پر 550 روپے کا منسی آرڈر کریں۔ آپ کو دوا ارسال کر دی جائے گی۔ منسی آرڈر فارم کے آخری کوپن پر مطلوبہ دوا کا نام B. BEAUTY ضرور لکھیں۔

محترمہ آپ SABALSERULATA-Q کے دس قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پیا کریں اور میرے کلینک کے نام پتے پر 550 روپے کا منسی آرڈر کریں۔ آپ کو دوا ارسال کر دی جائے گی۔ منسی آرڈر فارم کے آخری کوپن پر مطلوبہ دوا کا نام B. BEAUTY ضرور لکھیں۔

محترمہ آپ SABALSERULATA-Q کے دس قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پیا کریں اور میرے کلینک کے نام پتے پر 550 روپے کا منسی آرڈر کریں۔ آپ کو دوا ارسال کر دی جائے گی۔ منسی آرڈر فارم کے آخری کوپن پر مطلوبہ دوا کا نام B. BEAUTY ضرور لکھیں۔

حتمہ نور تلہ گنگ سے لکھتی ہیں کہ والدہ کو چکر بہت آتے ہیں معدہ کی تکلیف رہتی ہے اور میرا مسئلہ یہ ہے کہ ماہانہ اخراج کی کمی ہے جسم کی وجہ سے پیٹ کو لپے پھیل رہے ہیں۔ آپ نے ایسڈ فلور 30 بتائی تھی۔ یہاں ایسڈ مائڈرولورک 200 ٹی ہے۔

محترمہ اپنی والدہ کو 6 CARBOVEG کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت کھانے سے پہلے لیں اور آپ خود PITUITRIN 30 کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ لیں۔

اصغر علی لاہور سے لکھتے ہیں کہ بڑی مدت کی وجہ سے ازدواجی زندگی گزارنے کے قابل نہیں رہا۔

محترم آپ 30 STAPHISGARIA کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پیا کریں۔ ان حسن یہ لکھتے ہیں کہ مجھے سخت قسم کا قیض ہے۔

محترمہ آپ 30 BRYONIA کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پیا کریں۔ محمد ارمان شغلات جہلم سے لکھتے ہیں کہ میری نظر کمزور ہو رہی ہے اور ایک مسئلہ ہے علاج بتائیں۔

محترمہ آپ 3X ACID PHOS کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پیا کریں CINERARIA DROPS آنکھوں میں ڈالیں۔

کران لکھتی ہیں کہ میرے پورے جسم پر ہل ہیں۔ کوئی مناسب علاج بتائیں۔

محترمہ آپ 30 OLIVUMGACC کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پیا کریں اور مبلغ 700 روپے کا منی آرڈر میرے کلینک کے نام پتے پر ارسال کر دیں۔ آپ کو APRODITE ارسال کر دیا جائے گا۔

حورین احمد فیصل آباد سے لکھتی ہیں کہ بہن کو پڑھنے سے چکراتے ہیں۔ نظر کا کام نہیں کر سکتی اس کی پڑھائی متاثر ہو رہی ہے۔ دوسرا مسئلہ ماہانہ اخراج خراب ہے تھی وہ

بعد ہوتا ہے۔

محترمہ آپ 30 RUTA کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ دیں اور آپ 30 SENEIO کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پیا کریں۔

عمران کا کڑوہ سے لکھتے ہیں کہ میرا مسئلہ شائع کے بغیر دوا تجویز کر دیں اور یہ بھی بتا دیں دوا کہاں سے ملتی ہے۔

محترمہ آپ 30 AGNUSCAST کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پیا کریں ان شاء اللہ آپ کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ یہ دوا اپنے شہر کے کسی بھی ڈومیسٹک سٹور سے جرنی کی اپنی بولی خرید لیں۔

صوفیہ فیصل آباد سے لکھتی ہیں کہ آپ کا کام بہت اچھا ہے۔ میرے جیسے بہت سے لوگ اس وجہ سے آپ سے خریدتے ہیں مسئلہ بہت اہم ہے جواب ضرور دیجیے گا۔

محترمہ آپ 6X FIVE PHOS کی چار گولی تین وقت روزانہ کھائیں اور 200 GNATIA کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر ہر آٹھویں دن پیا کریں۔

ایمان فاطمہ آزاد کشمیر سے لکھتی ہیں کہ میرے دو مسے ہیں عمر 20 سال ہے چھ ماہ سے لگتے ہیں اور نشان پھوڑا ہوا ہے۔ دوسرا مسئلہ یہاں بہت بڑا ہوا ہے کوئی علاج بتائیں۔

محترمہ آپ 6X CALCIUM FLOUR کی چار چار گولی تین وقت روزانہ کھائیں اور 200 GRAPHITES کے پانچ قطرے ہر آٹھویں دن ایک بار پیا کریں۔

ظہور احمد اسکر دو سے لکھتے ہیں کہ میرا مسئلہ شائع کے بغیر علاج تجویز کر دیں۔

محترمہ آپ 3X ACID PHOS کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پیا کریں۔

س دل تہ گنگ سے لکھتی ہیں کہ میرا بھائی چھوٹا

پیشاب ڈبلیو سی کے اندر کے بجائے ہاتھ روم کی دیوار پر کرتا ہے۔ پیشاب میں سخت قسم کی بو ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں نے لمبی دم والے کپڑے ہاتھ روم پر پہنائے۔ سرہ میں دیکھتے ہیں یہ کیسے ہے۔

محترمہ آپ بھائی کو 30 ACID BENZ کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ کھلائیں کیڑوں والا معاملہ سمجھ میں نہیں آتا۔

ماہستہ تول پٹواں سے لکھتی ہیں کہ میرے پندرہ برس شائع کیے بغیر علاج بتائیں۔

محترمہ آپ 30 SEPIA کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پیا کریں آپ کے مسئلے حل ہوں گے۔

محترمہ ہوں فوراً کہ میرے مسئلے سے لکھتی ہیں کہ میرا مسئلہ شائع کیے بغیر علاج بتائیں۔

محترمہ آپ 30 SEPIA اور 30 OPIUM کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پیا کریں۔

ایمان فاطمہ آزاد کشمیر سے لکھتی ہیں کہ میرے بال باریک وشنی اور مین سے کٹ جاتے ہیں۔ گھنچا پن پیدا ہو رہا ہے دوسرے یہ دوا انت مزہ سے بتائی ہے لکھتے ہوئے بھول جاتی ہو۔ دوا کے پیسے بھیج رہی ہوں۔ دوا ارسال کر دیں۔

محترمہ آپ 30 ANACARDIUM کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پیا کریں اور آپ 30 SEPIA کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پیا کریں۔

کران ایمان بیہوش سے لکھتی ہیں کہ میں نے گناہ کا مرض ہے چہرے پر دانے ہیں بہت کمزور ہوئی ہوں۔

محترمہ آپ 30 SEPIA کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پیا کریں اور 600 روپے کلینک کے نام پتے پر منی آرڈر کر دیں آپ کو HAIR GROWER گھر بھیج دیا جائے گا۔ ہاتھ منہ نہ دھوئے ہوں گے گھنچا پن ختم

ہو جائے گا۔ مسز احسان لکھتی ہیں کہ بچوں کی پیدائش کے بعد جسم پھول گیا ہے پیٹ اور گولے زیادہ بھاری ہو گئے ہیں۔ دوسرے بچوں کو دودھ پلانے کی وجہ سے بریسٹ لوز ہو گئے ہیں۔

محترمہ آپ 6X CALCIUM FLOUR کی چار گولی تین وقت روزانہ کھائیں۔ 200 CALCIUM CARB کے پانچ قطرے آٹھویں دن لیں۔ 550 روپے کا منی آرڈر میرے کلینک کے نام پتے پر ارسال کر دیں اپنا پتہ مکمل لکھیں اور منی آرڈر فارم کے آخری کوپن پر مطلوبہ دوا کا نام BREAST BEAUTY لکھیں یہ دوا آپ کے مسئلے کو حل کرے گی۔ اس کے استعمال سے ان شاء اللہ قدرتی سن سولی ہو جائے گی۔

ڈشمن ہاں شیم سے لکھتی ہیں کہ BREAST BEAUTY کی بڑی تحریف کی ہے آپ V.P. کر دیں۔

محترمہ آپ 550 روپے کا منی آرڈر کلینک کے نام پتے پر ارسال کر دیں آپ کو مطلوبہ دوا بھیج دیا جائے گا۔ V.P. لکھیں یہ باتی۔

صبا فرزند قلعہ دیدار سنگھ سے لکھتی ہیں کہ مجھے ماہانہ اخراج بہت زیادہ ہوتا ہے اس کی وجہ سے میرے سر کے بال بہت کم ہو گئے ہیں۔

محترمہ آپ 30 SBINA کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ لیں اور 600 روپے کلینک کے نام پتے پر منی آرڈر کر دیں۔ آپ کو HAIR GROWER بھیج دیا جائے گا۔ اس کے بعد سے گھنچا پن ختم ہوگا۔ نئے بال مضبوط پیدا ہوں گے۔

ماہستہ خان جھالپور سے لکھتی ہیں کہ مسئلہ شائع کیے بغیر علاج بتائیں۔

محترمہ دونوں مسئلے قدرتی ہیں ان کا کوئی دوا ایسا ملان ممکن نہیں ہے۔ کران کے مسئلے میں آپ پریشان ہو سکتا ہے۔

شہناز لاہور سے لکھتی ہیں کہ ماہانہ منام خراب ہے

بہت پریشان ہوں کوئی علاج بتائیں۔

محترمہ آپ SENEIOAUR کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پیا کریں۔

مقدس طاہرہ وزیر آباد سے لکھتی ہیں کہ میرا خط توجہ سے پڑھنا میری بیماریوں کی لسٹ پڑھ کر تنگ نہیں ہونا کیونکہ میں 13 سال سے ان بیماریوں کو جھگرت رہی ہوں۔

محترمہ اتنی کراٹک بیماریوں کا علاج اس طرح ممکن نہیں ہے جب تک مرلیش سامنے نہ ہو لہذا مقامی ہومیو ڈاکٹر سے رجوع کریں۔

ایم والی خان واہ کینٹ سے لکھتی ہیں کہ میرے جسم کے مختلف جوڑوں میں درد ہے۔ صبح اٹھتے وقت بہت ہوتا ہے چلتے پھرتے نہیں ہوتا۔

محترمہ آپ 30 RIUSTOX کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پیا کریں۔

سعدیہ جزائوالہ سے لکھتی ہیں کہ میرا قد چھوٹا ہے۔ اس کی دوا بتائیں کیا قد بڑھانے والی ادویات کے منفی اثرات بھی ہوتے ہیں۔

محترمہ آپ 6X CALCIUM PHOS کی چار چار گولی تین وقت روزانہ کھائیں اور BARIUM 200 کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر آٹھویں دن ایک بار لیں۔ ہومیو پیتھک ادویات کے منفی اثرات نہیں ہوتے۔

زارہہ گجرات سے لکھتی ہیں کہ میرا مسئلہ شائع کیے بغیر دوا تجویز کر دیں۔

محترمہ آپ 30 OLIMUMJACC کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پیا کریں اور میرے ٹینک کے نام پر 700 روپے کا مٹی آرڈر کر دیں۔ آپ کو لگانے کی دوا گھر پہنچ جائے گی۔

عالیہ بتول گجرات سے لکھتی ہیں کہ میرے چہرہ پر مسلسل دانے نکلتے ہیں اور نشان چھوڑ جاتے ہیں دوسرے میرا قد چھوٹا ہے کوئی علاج بتائیں۔

محترمہ آپ 6X CALCIUM PHOS کی چار گولی تین وقت روزانہ کھائیں اور BARIUM 200 کے پانچ قطرے آٹھویں دن ایک بار لیں اس کے علاوہ 200 GRAPHITES کے پانچ قطرے بھی آٹھویں دن ایک بار لیا کریں۔

خاندانہ منڈی بہاؤالدین سے لکھتی ہیں کہ میں ایک بہت ہی پیچیدہ مسئلہ میں مبتلا ہوں۔ جس کی وجہ سے میری صحت خراب ہوتی جا رہی ہے۔

محترمہ آپ 30 SALIXNIGRA کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین مرتبہ روزانہ پیا کریں۔

الوینہ جہلم سے لکھتی ہیں کہ میرا سینہ بہت بھاری اور دردناک ہے۔ بہت پریشان ہوں مانتا نہیں۔

محترمہ آپ 30 CHIMAPHILA کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پیا کریں۔ میرے ٹینک سے BEAUTY منگالیں۔ قدرتی حسن بحال ہوگا۔

فرحانہ ناز گڑھا موڑ سے لکھتی ہیں کہ بہت دن سے موڈی مرض میں گرفتار ہوں مجھے اس سے نجات دلائیں۔

محترمہ آپ 30 BOROX کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پیا کریں یہ دوا اس بھی ہومیو پیتھک اسٹور سے جرمنی کی بنی ہوئی سیل بند خرید لیں۔

معائنہ اور باقاعدہ علاج کے لیے تشریف لائیں۔ صبح 10 بجے شام 6 بجے۔

فون: 021-36997059
ہومیو ڈاکٹر ہاشم مرزا ٹینک اکان 5 KDA'C
فینس فیز 4 شادمان ٹاؤن 2- سیکٹر B-14 تارھ کراچی 75850

خط لکھنے کا پتا: آپ کی صحت ماہنامہ ”آئینل“ پوسٹ بکس 75 کراچی۔



کٹش مقابلہ

طلعت آغا

شہابی ٹکڑے

اجزاء:

ڈبل روٹی

دودھ

1 پکٹ

ڈیزل ٹکڑے



1/2 چھنا ٹک

1/2 چٹنی

حسب پسند

1 چھنا ٹک

4 چار بڑے پیچ

8 عدد

پتہ

زعفران

شکر

بادام کی گری

کیوڑہ

چھوٹی الائچی

ترکیب:-

ڈبل روٹی کے پیسے لے کر انہیں چاروں طرف سے کاٹ لیں۔ بادام کی گری کو گرم پانی میں جھونکر چھیل کر کاٹ لیں۔ زعفران کو کیوڑہ میں جھونکیں اور سل پر باریک پیس لیں۔ پستہ باریک کاٹ میں اب دودھ کو اتنا پکا میں کھل دھارہ جائے پھر اس میں شکر ملا دیں۔ فرانی پین میں بھی ڈال کر ڈبل روٹی کے ٹکڑے تلتے جائیں۔ ٹوسٹ بالکل بادامی رنگ کے ہونے چاہیے۔ اب ٹکڑے دودھ میں ڈال کر اتنا

پکائیں کہ ٹکڑے گداز ہو جائیں لیکن ٹوٹنے نہ پائیں اور دودھ تقریباً خشک ہو جائے پھر یہ ڈش میں نکالیں اور اوپر زعفران ڈال دیں ٹھنڈا ہونے پر پستہ اور بادام چھڑک دیں۔ شاہی ٹکڑے تیار ہیں۔

طیبہ نذیر شادیوال گجرات
لذیذ کوٹنے

اجزاء:-

قیمہ: ایک پسا ہوا

1/2 کلو دھوکریانی نتھار لیں

1 عدد چوپ کر لیں

1/2 چائے کا چمچ

1 عدد

1/2 کپ کٹ لیں

حسب ذائقہ

1 کھانے کا چمچ

1 کھانے کا چمچ

1 کھانے کا چمچ

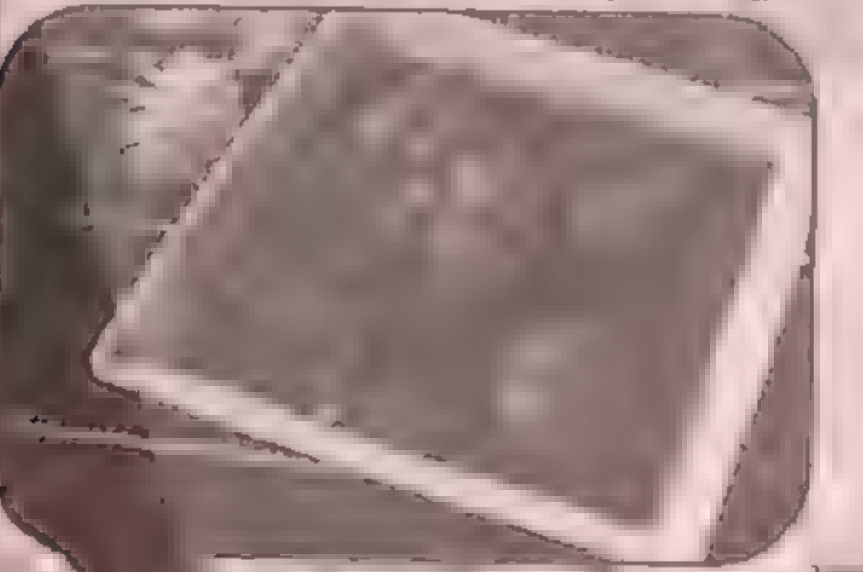
حسب ذائقہ

1 کھنٹی

حسب ضرورت

ترکیب:-

ایک پیالے میں قیمہ ڈال کر اس میں پیاز اور ریگانو پاؤڈر انڈا نمک سویا سوس ووسٹر سائرسوس چائیز نمک سیاہ مرچ پاؤڈر اور پارسے ڈال کر مکس کریں گیلے ہاتھوں سے اس مکچر کے چھوٹے سائز

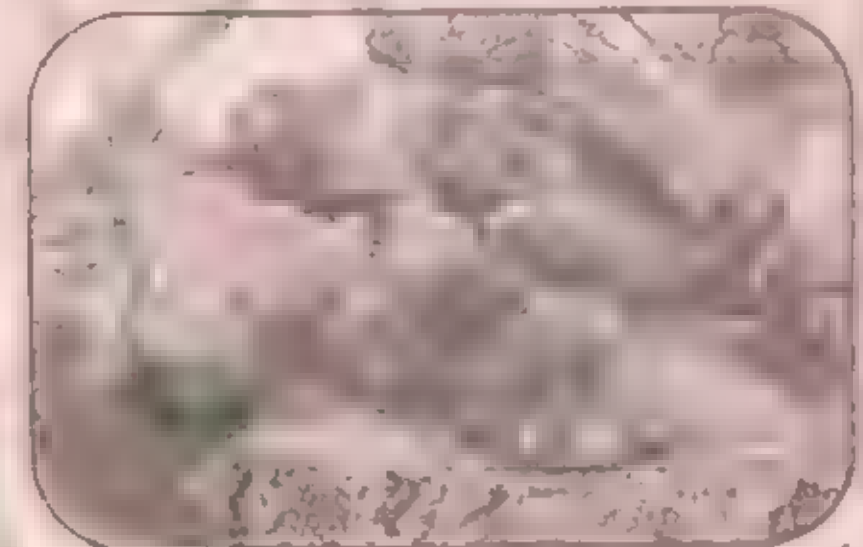


کے کوٹے بنالیں۔ ایک پلیٹ میں کارن فیلس ڈالیں۔ تیار کیے ہوئے کوٹوں کو اس سے کوٹ کریں۔ نان اسٹک فرائنگ پین میں تیل گرم کریں اور اس میں کوٹے ڈال کر درمیانی آنچ پر گولڈن براؤن ہونے تک فرائی کریں۔ اس کے بعد سرونگ ڈش میں نکالیں۔ لذیذ کوٹے تیار ہیں۔ فریج فرائیز اور چلی گارک سوس کے ساتھ پیش کریں۔ دناؤں میں یاد رکھیے گا۔

نوشین اقبال نوشی گاؤں بدرمرجان
مٹن چانپ باربی کیو

اجزاء:-

چانپیں
لال مرچ پس ہوئی
ایک کاو
حسب ذائقہ



گرم مسالا
سوکھا دھنیا
دہی
لہسن اور کپا ہوا
نمک
پیاز پس ہوئی
سفید زیرہ
1 چائے کا چمچ
2 عدد
1 چمچ
چنیوں پر گانے کے لیے

ترکیب:-

چانپیں دھو کر ایک چھانی میں ڈال کر خشک کر لیں، پھر ابال لیں، اب پیاز، لہسن، اور کپا دہی، نمک، گرم

مسالا دھنیا اور زیرہ سب مد کر باریک پیس میں اور چانپیں ایک کھلے برتن میں نکالیں اور یہ سب اجزاء چانپوں پر لگائیں۔ پھر ڈیڑھ گھنٹے کے لیے فریج میں رکھ دیں۔ سینوں پر لگا کر تھوڑا تھوڑا اٹھی نکالیں اور بھون لیں۔ سرخ ہو جائے تو پودینے کی چٹنی کے ساتھ سلا بھی سرو کریں۔

فرخندہ فیض سنگ چٹن
چھوہارے کا حلوہ

اجزاء:-

چھوہارے
شکر
دودھ
پانی
اخروت
آدھا کاو
ایک پاؤ
ایک کاو
ایک کاو
ایک چھٹا تک
آدھا پاؤ
ایک چھٹا تک
ایک پاؤ

ترکیب:-

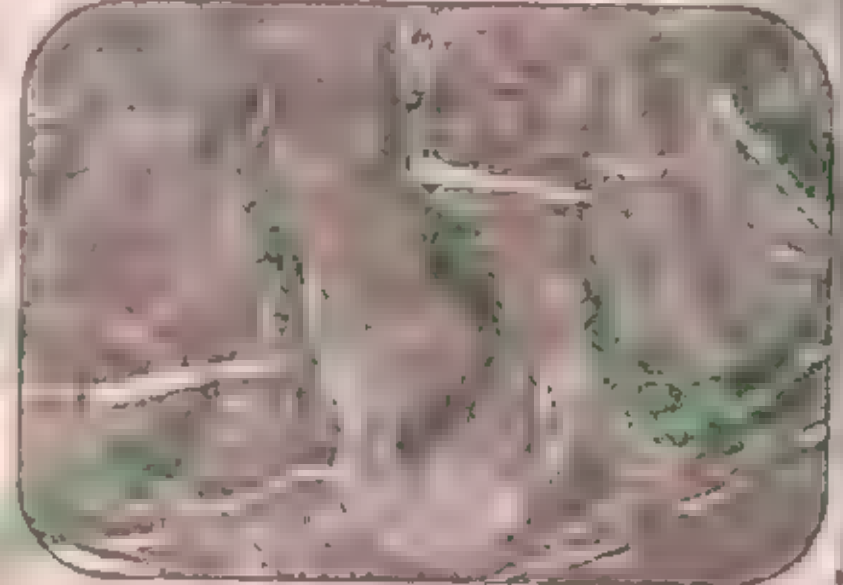
چھوہارے ایک گھنٹے کے لیے پانی میں بھگو دیں اور گھٹلیاں نکال کر اچھی طرح صاف کر لیں۔ دودھ اور پانی میں چھوہارے ڈال کر بواں کر لیں جب چھوہارے گل جائیں تو چھوہاروں کو پیس لیں۔ آٹا کل گرم کریں اس میں پسے ہوئے چھوہارے اور شکر ڈال کر اچھی طرح بھونیں۔ حلوے کا پانی خشک ہو جائے اور آٹا کل نظر آنے لگے تو اخروت، شمش



بادام ڈال کر مکس کر لیں۔ مزید ار حلوہ تیار ہے۔
عائشہ سلیم فیصل آباد
قورمہ کھڑا مسالا

اجزاء:-

گوشت
پیاز
دہی
1 کلو
3 عدد
1 پاؤ



ثابت کرم مسالا
دھنیا پاؤڈر
سرخ مرچ پاؤڈر
نمک
تیل / آٹھی
1/2 چھٹا تک
1 چائے کا چمچ
حسب ذائقہ
حسب ذائقہ
حسب ضرورت

ترکیب:-

پیاز باریک کاٹ لیں اور گوشت کو دھولیں۔ پھر ایک دیگی میں گوشت، پیاز، گرم مسالا، نمک، مرچ ڈال کر چولہے پر رکھیں اور وہی پھینٹ کر مسالے کے اوپر ڈال دیں۔ گوشت گلانے کے لیے پانی نہ ڈالیں بلکہ دہی کے پانی سے گوشت کو ملانے کے لیے پانی نہ دیں۔ جب دہی خشک ہو جائے تو آٹھی ڈال کر خوب بھونیں لیکن آٹھ ہلکی رہتی چاہیے۔ جب آٹھی نظر آنے لگے تو اتار لیں۔ ہر ادھنیا ڈال کر سرو کریں۔

سمیرا مشتاق ملک اسلام آباد
پیر کے کباب

اجزاء:-

پیر کدو کش کیا ہوا
آلو (ابال لیں)
بادام (کوٹ لیں)
1 کپ
1 عدد
12 عدد

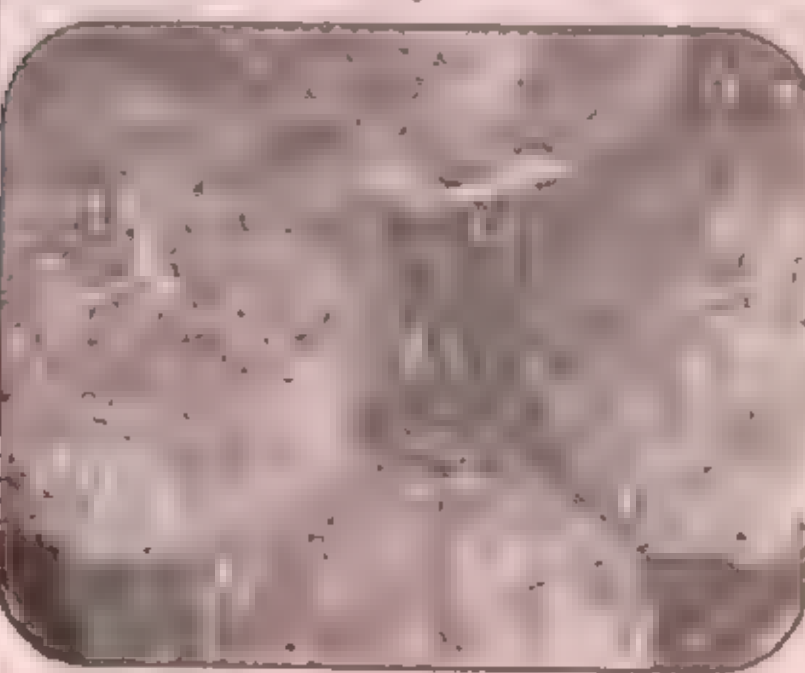
ہری پیاز
ہر ادھنیا چوپ کیا ہوا
ساہ مرچ پاؤڈر
نمک
1 عدد چوپ کر لیں
1 کھانے کا چمچ
1 چائے کا چمچ
حسب ذائقہ

ہری مرچیں
انڈا
بریکر کریمز
تیل
2 عدد (باریک چوپ کر لیں)
1 تلنے کے لیے
حسب ضرورت
حسب ضرورت

ترکیب:-

پیر میں آلو، نمک، سیاہ مرچ پاؤڈر، بادام، ہر ادھنیا، ہری مرچیں، ہری پیاز ملا کر مکس کر لیں اور کباب بنائیں۔ ایک پیالے میں انڈا پھینٹ لیں، اب کباب کو پہلے انڈے میں ڈبوئیں اس کے بعد کریمز لگائیں اور گرم تیل میں فرائی کریں اور کچپ کے ساتھ پیش کریں۔

پروین افضل شاہین بہاولنگر



بیوٹیکائیڈ

روبین احمد

موسم سرما اور جلد:-

موسم سرما کی آمد کے ساتھ ہی فضا کی قدرتی نمی میں کمی آ جاتی ہے سرد اور خشک ہوا میں ناصاف چہرے بکے ہاتھوں اور پیروں کو بھی بری طرح متاثر کرتی ہیں۔

موسم سرما کے آغاز کے ساتھ ہی کولڈ کریم چھینے لوشن یا جیلاٹن اور گلیسرین کی خریداری کریں۔ صبح و شام ہوتے



ہی منہ دھونے کے بعد تھنی سی کولڈ کریم یا لوشن چہرے پر لگائیں۔ موسم سرما میں خصوصاً منہ دھونے کے بعد کی بھی قسم کی کریم چہرے پر لگانا ایک عادت بنائیں۔ دوپہر کے وقت چہرے اور ہاتھوں پیروں میں جیلاٹن کا مساج کریں زائد چکنائی ٹشو پیپر سے صاف کریں اور سو جائیں۔ شام کے وقت منہ دھونے کے بعد ہلکا سا لوشن لگائیں اور رات میں جب سب کاموں سے فارغ ہو جائیں تو لیموں، گلیسرین اور عرق گلاب ہم وزن لے کر چہرے اور ہاتھوں پیروں میں اچھی طرح لگائیں۔ اس آمیزے کو صرف رات کے وقت استعمال کریں۔

غذا اور موسم سرما:-

جلد کو سرد اور خشک ہواؤں سے محفوظ رکھنے کے لیے بیرونی طریقوں کے ساتھ ساتھ آپ کو اپنی غذا کی طرف بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ موسم سرما میں پھل، خیز، مکھن، بالائی دہی اور دودھ کا استعمال بڑھانے سے جلد

خشکی کا شکار نہیں ہوگی۔ اپنی غذا میں توازن پیدا کرنے سے آپ کو ہمیشہ خوش گوار نتائج ملیں گے۔

خشک ہوا کے باعث جلد پھٹ جائے تو ٹھنڈا دودھ چہرے پر ملیں۔ خشک جلد کے لیے نرم اور کریمی صابن استعمال کریں۔

(جویریہ ضیاء.....ملیر کراچی)

خشک جلد کے لیے ماسک:-

۱:- ایک کھانے کا چمچ زیتون کے تیل میں دو چمچ تازہ کریم ملا کر دس منٹ تک چہرے پر لگائیں اور گرم پانی میں بھیکے ہوئے روٹی کے پیڑے کے ساتھ صاف کر لیں۔

۲:- ایک کھانے کا چمچ شہد پندرہ قطرے سنترے کا رس ایک کھانے کا چمچ ملٹانی مٹی اور ایک چمچ عرق گلاب کو اچھی طرح ملا کر چہرے پر لپ کریں۔ دس پندرہ منٹ بعد چہرہ دھو لیں۔

۳:- ایک کھانے کا چمچ کارن فلور ایک با دام پسا ہوا زیتون کا تیل تازہ کریم میں اچھی طرح کس کر کے چہرے پر لگائیں۔ دس منٹ بعد چہرہ دھو لیں۔

۴:- شہد اور خویاں کا ماسک چہرے کے باؤں کو جڑوں سے تھوڑا کرتا ہے اور بالآخر چند مرتبہ کے استعمال سے یہ بال تر جاتے ہیں۔ یہ ماسک جلد کو غذائیت مہیا کرتا ہے۔ جلد کو خشک نہیں دیتا اور نرم و سادگم بناتا ہے۔

۵:- سمندری جڑی بوٹیوں کا ماسک متبادل موچر ازلنگ ٹریٹمنٹ ہے۔ خصوصاً آنکھوں کے ارد گرد نازک بانٹوں کی حفاظت کے لیے بہترین ماسک سمجھا جاتا ہے۔ یہ ماسک

جلد کو ضروری نمکیات فراہم کرتا ہے۔ جھریاں نہیں بننے دیتا خون کی گردش کو بہتر کرتا ہے۔ سمندری جڑی



بوٹیوں کے ماسک سے روکی اور خشک جلد کو بے پناہ فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

چہرے پر کافے والے تمام ماسک دہرائے ہاتھوں کے لیے بھی مفید ہوتے ہیں خویاں اور شہد سے بنی کریم غذائیت بخش ہے۔ جھریوں کو روکتی ہے۔ جھد کو نرم بناتی ہے۔ ہر روزی اور خراب جلد کو کم وقت میں خشک کرنے کے لیے، انفرمڈ ریش کریم کا تین اور دس دن کے لیے استعمال کیا جائے۔

خشک جلد کے مسائل اور گھریلو ٹوٹکے:-

سرایوں میں جلد خشک ہو جاتی ہے اور اگر بروقت اس کی حفاظت نہ کی جائے تو سردیاں ختم ہونے سے پہلے چہرے اور ہاتھوں خصوصاً پیروں کی ایذاں خراب رہتی ہیں۔ ایسے میں بازار کی کریمیں اور چکنائی والے ماسک بہت مفید ہوتے ہیں۔ یہ بات یہ کہ جب جلد خشک ہو جائے تو جراثیم کش صابن مت استعمال کریں۔ پانی ہوئی ایڑیوں



کو پیلے جھانویں سے رگڑیں پھر ان پر گلیسرین اور عرق گلاب لگائیں۔ آریڑیوں کی جلد زیادہ خراب ہو جائے تو سرسوں کا تیل تین چمچ اور بالائی دہی دو چمچ ملا کر مخلوط بنا لیں۔ اس کاڑھے لپ کو رات سوتے وقت پاؤں پر کا کر جراثیم پہن لیں۔ چہرے کو نرم رکھنے کے لیے عرق گلاب اور گلیسرین استعمال کی جاسکتی ہے۔ چہرے کا بھی کبھار فیشل کرنا بھی بہتر ہوتا ہے۔

سردی کے موسم میں خواتین کی جلد میں تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ اس کے لیے اپنی جلد کی حفاظت پر خواتین کو خصوصی توجہ دینا چاہیے۔ کیونکہ سرد موسم کے اثرات

خواتین کی نرم و نازک جلد پر جلد نمایاں ہو جاتے ہیں۔ اس لیے سرد ہواؤں میں باہر نکلنے سے احتیاط برتیں۔ منہ ہاتھ دھونے کے لیے نیم گرم پانی کا استعمال کریں۔ چہرے اور ہاتھوں پر کولڈ کریم یا وٹسلین کا زیادہ استعمال کریں۔ سرد موسم میں غذا پر بھی خصوصی توجہ دیں اور صبح کے ناشتے میں چکنائی والی اشیاء استعمال کریں یعنی پائے مکھن، انڈے کا استعمال زیادہ کریں آریاں کی جلد چکنائی ہے تو آپ کو اپنے چہرہ و ہاتھوں میں کی مرتبہ کسی بھی اچھے صابن سے دھونا چاہیے۔ سرد موسم کا اثر چکنائی جلد پر بھی پڑتا ہے۔ انہیں خصوصی طور پر اپنے چہرے پر توجہ دینی چاہیے اور فیشل ہر ماہ پابندی سے کرنے سے اگر ان کے چہرے پر اٹنی کے اثرات نمایاں ہو رہے ہیں تو وہ بھی ختم ہو جائیں گے۔

خواتین کے ہاتھوں کی حفاظت کے لیے خواتین نے ہر اپری سے اتنے زیادہ پتے ڈونے ہیں جیسے پیر میں کوئی زخم ہو۔ اس کے باوجود خواتین پیروں پر توجہ نہیں دیتی ہیں۔ آج کل ہر اچھے بیوٹی پارلر میں پیڈی کیور مشین کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ خواتین کو سردی کے موسم میں تقریباً ہر تین دن بعد مشین پر پیڈی کیور ضرور کروانا چاہیے۔ ایسی خواتین جو بیوٹی پارلر کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتی ہیں وہ خواتین یہ عمل گھر میں بھی کر سکتی ہیں۔ نیم گرم پانی کریں اس میں ٹھنڈا سا ڈیٹول اور نمک ملا کر پیروں کو دس منٹ ڈبوئے رکھیں۔ پھر جھانویں سے رگڑ کر صابن لگائیں اور نیم گرم پانی سے دھو لیں۔ پیر خشک کر کے کولڈ کریم یا وٹسلین استعمال کریں اور پیروں پر موز پھین لیں۔ موسم سرما میں خواتین یہ عمل مسلسل جاری رکھیں آپ کے پاؤں نرم اور نازک ہو جائیں گے۔

(تعبیر جہاں.....جلال پور پیر والہ)



تم کہاں کھو گئے
(فرحت آپا کے نام)

چاند تنہا بھٹکتا رہا فٹک پر نہیں
اور تارے بھی تھک کر جی سو گئے
تم کہاں کھو گئے؟

سال بیتا یہ غم ہم بھلا نہ سکے
خوصلے درد کا زمانہ سکا
چل دیے روٹھ کر تم تو سب سے کہیں
ہم تیرے دکھ سے دامن چھڑانہ سکے
نظریں خالی ہوئیں دل بھی ویراں ہوئے
تم کہاں کھو گئے؟

تخلیس ہو گئی ہیں ویراں کس قدر
کتنی آنکھیں ہیں پر غم تمہیں کیا خبر!
چاند تاراں کے تم تو نہیں ہو گئے
تم کہاں کھو گئے؟

سوئی سوئی فضا میں تمہارے بنا
کتنی پر غم ہوا میں تمہارے بنا
دکھ بھلانے سے بھی اب تو جاتا نہیں
صبر ہوتا نہیں جین آتا نہیں
سارے ارمان دل کے کہیں سو گئے!
تم کہاں کھو گئے؟

شاعرہ: نازیہ کنول نازی..... ہارون آباد

یادیں
(فرحت آپا کے نام)

زندگی کے راستوں پر
چلتے چلتے
قدم جب لڑکھڑاتے ہیں
کچھ اپنے یاد آتے ہیں

بہت تکلیف ہوتی ہے
یہ یادیں دل دکھاتی ہیں
جب اپنے یاد آتے ہیں
جو ہم سے دور رہ کر بھی
ہمیشہ دل میں رہتے ہیں
چھڑ کر ہم سے نہ جانے
وہ کیسے دیں جاتے ہیں
جہاں ستا نہیں سکتے
انہیں کیسے بھلا میں ہم!

جو اکثر یاد آتے ہیں
ہمیں بے حد رلاتے ہیں
ہوں چاہے دور یاں کتنی
بھلے مجبور یاں کتنی
جہاں پر بھی وہ رہتے ہوں
وہ ہم سے مل نہیں سکتے
نظر وہ آنکھیں سکتے
لیکن!

نظر سے دور ہو کر بھی
نہاں یادوں میں بیٹے ہیں
تو دل میں رہتے ہیں

(نرہت جیس غیا..... کراچی)
آظر

(راج دلاری فرحت باجو کے نام)

اے شفیق ہستی!
نرم نرم لہجہ والی
زخموں پر مرہم رکھنے والی
ہمارے درد کا درماں
دلوں کا دلاسا

امید کا دیا
اک ٹھنڈی میٹھی چھایا۔

جیسے دھوپ میں سایا
خدا کا خاص بندہ
دلوں پر راج کرتا
گر توں کو سہارا دیتا
لفظوں کی چاشنی بانٹتا
خوشبو میں پھیرتا

ہمیشہ دلوں میں زندہ رہے گا
یادوں میں
رات کی تنہائیوں میں
اداس لمحوں میں
جب آپ یاد آؤ گی
بہت رلاؤ گی

طاہت رانا

چمچہ وطنی
دسمبر
زمین سر ز شہر قی رات
ٹھیلی چاندنی میں
دُستد میں کٹی
تمہاری یاد کی سرسراتی چادر
جب میرے شانوں سے ڈھکنے لگی
تو اس بل!

گھر میں لپٹی
سر دھم اور بے لباس ہوا
کہنے لگی
اے اب لوٹ آنا چاہیے
ہاں اب تو ات
لوٹ آنا چاہیے

قصیدہ صف خان
ماکان

(پیری آئی فرحت آراء کے نام)
میں کچھ کہنے کو جوں بکھلوں تو
صرف اتنا ہی کہہ سکوں گی
کہ

یہ لہو میں جگر میں
یہ سہ دل میں نظر میں
یہ بی ہستی میں گدہ میں
یہ شام و سحر میں
میری دھڑکی میں امیر میں
میری سوچوں کے بھنور میں
یہ بی ذات کے نظر میں
میرے سہنوں کے عمر میں
میرے دل کے شیر میں
میری منزل کے سفر میں

تیری یادوں کے اجالے ہیں
میری دھڑکن میری سانس ہیں
خود کو تیرے نام کر رہی ہیں
اور میری تمام زندگی
تیری عشقیتوں کو سلام کر رہی ہے

شائلا اکرام..... فیصل آباد

غزل

جہاں دیکھتا ہوں نظر خالی خالی
سنان جنگل شجر خالی خالی
چھڑ جانے والے کہاں تم چلے ہو؟
مری زندگی کا سفر خالی خالی
جہاں میری ممتا کا سایہ تھا سر پر



بدلتے لمحے ڈھلتی شامیں چڑھتے دن
یہ پیراں سمندریہ بہتی ندیاں
یہ گلستاں میں پھولوں کا جوین
نہیں دیتے رشتہ کی بھری بہانیاں
تیرے غیظ و غضب کے منظر
اُترے ہر شہر کی شانیاں
تیری اس بزم میں تو ہی درخش ہے
تیری ہی عبادت دل کا دریا ہے
تو ہی نفس مضمون تو ہی عنوان ہے
ہزار ہا دھندوں میں مشغول انسان
نہ فراغت مناجات نہ وقت عبادت
گلن کا نہیں مومن مگر جنت کی است
عمیس اند جملہ صدر
نعت

تیری پیروی کا حق یوں ادا ہو
جہاں قدم رکھوں تیرا نقش پا ہو
بج تیرے نہ کوئی رہنما ہو
جب سانس کی ڈوری ٹوٹے
اور جب کشتی میری ڈوبے
میرے لب پہ تیری ثناء ہو
تیری ہو جائے جو نظر شفقت
نہ رہے مجھے کسی اور کی حاجت
خدا کے سامنے بھی تیرا آسرا ہو

ہو جائے میرا حائی شافع منشر
کہ کرتا ہوں میں دلوں کو متور
میرے شاعر خدائی آب بتا
نہیں اند جملہ صدر

قبول کریں

خجانی کا یہ بے باقی سے شاعرانی سے
چاہیے۔ (سورجی اللہ علیہ وسلم)
نہیں کہیں قرب اپنا نہایت
ہے۔ (ارشد)
ایک نعت کی خوش سحر حریفوں کے
تھکا ہوا ہوتا ہے۔ (شعاعی)
سب سے بڑی جہالت یہ ہے کہ انسان
اپنے آپ کو دوسروں سے بہتر سمجھے۔ (امام غزالی)
نہیں کہ انسان کی زندگی پر رشک آتا ہے
جو موات کے بغیر بھی خوش رہتا ہے۔ (خوش سال
خان جنگ)
نہیں کہ ہم کو ہر قسم رتبہ میں بھی کی جائے
مبادت کی نہ ایک نسل ہے۔ (عامر اقبال)
نہیں کہ حریص اور حسد بھی نہیں پاسکتے۔
(حضرت رابعہ بصری)

رانی اسلام گوجرانوالہ

سہرے حروف
اگر کسی کے ساتھ وفا کرنی ہو تو ساحل سے لگی
کھاس کی طرح آرو۔ جب بھی کوئی ڈوبتا ہو اس کا
سہارا لے تو وہ اس کو بچا لیتی ہے یا خود بھی کنارے
سے تاتا توڑ کر ساتھ ڈوب جاتی ہے۔
(شاہ عبداللطیف بھٹائی)

سہلی فہیم گل لاہور

گوہر نایاب
نہیں کہ محبت دلوں میں مستقل رہے

جائے تو اندھی دیواروں جیسی ہو جاتی ہے۔ باقی عمر
ان سے رہائی نہیں ملتی۔
نہیں کہ اکثر اتنے اچھے نہیں ہوتے جتنا وہ محبت
ہمیں اچھا کر دیتی ہے جو ہمارے دلوں میں اپنے
پیارے سے بن جاتی ہے۔

نہیں کہ کتابوں سے محبت چاہے بنا نہیں
ہوتی۔ جیسے نیکی کی توفیق بنا طلب کے نہیں ملتی۔
نہیں کہ محبت چیزوں سے نہیں دلوں اور رگوں
سے کی جاتی ہے۔ چہرے روپ بدل سکتے ہیں مگر
دلوں وہ نہیں بدلتے۔
نہیں کہ دل میں زیادہ دیر رہے بہت لمبی
دشمن دیتی ہے اور بدگمانی غایبوں کا باعث بنتی ہے۔
نہیں کہ اعتدال بہترین راہ ہے کیونکہ پاؤں آگ
کے الاؤ میں ہوں یا برف کی سل پر دونوں صورتوں
میں تپش ہمارا مقدر بنتی ہے۔
نہیں کہ خوشی میں کوئی دوست شامل ہو تو خوشی بڑھ
جاتی ہے اور غم میں اگر دوست ساتھ دے تو غم گھٹ
جاتا ہے۔

نوشین قبول نیش کاؤں بد مر جان
بہترین ہنر

بچہ دنیا میں صرف ایک ہنر لے کر آتا ہے اور وہ
ہے رونا! اس کے علاوہ اسے کچھ نہیں آتا۔ اس ایک
ہنر سے وہ اپنی ماں سے ہر بات منوالیتا ہے یعنی "رو"
رو کر اس لیے اپنے رب کے سامنے رونا سیکھو اور
اپنے رب کو منالو جو ستر ماؤں سے بھی زیادہ پیار
کرنے والا ہے۔

کرن فرح کراچی

نظم
خوشبو کی پوشاک پہن کر
کون کون میں آیا ہے

کیسا یہ پیغام رساں ہے
کیا کیا خبریں آیا ہے
کھڑکی کھول کے باہر دیکھو
موسم میرے دل کی باتیں
تم سے کہنا آیا ہے!!

ناہید شہیرا ناہید شہیرا

..... خوشبو کی بات.....
دلوں کو مقدروالے ہوتے ہیں ایک وہ جنہیں وفا
دار دوست ملتا ہے اور دوسرا وہ جن کے ساتھ ماں کی
دسامیں ہوتی ہیں۔

سب اس گل رحیم رحمان
پتہ باتیں اکتے دلوں کی
نہیں کہ یادت دارا نہ منت و شقت سر بلندی
نہیں کہ (فلو لینڈ)
نہیں کہ ایسی شناسائی جو فوراً ہو جائے پچھتاوے کا
نہیں کہ منت بنتی ہے۔ (تہا سن فاری)
نہیں کہ غم کا بہترین ملان مسعودیت
ہے۔ (بارن)

نہیں کہ اگر لگن ہو تو ذرا کھل جاتے ہیں اور اگر نہ ملیں
تو آدمی خود پیدا کر لیتا ہے۔ (چین فنگ)
نہیں کہ خدا ہمارے مقدر میں پتھر لیے راستے لکھتا ہے تو
ہمیں مضبوط جوتے بھی بخشتا ہے۔ (یٹھے بون)
اپنے خیالات کو اپنی جیل نہ بناؤ۔ (خلیل جبران)
مابدہ شہیرا شہیرا

الکینڈر ویزا
بے قراروں کے دل کا قرار ہے ویزا!
لاکھوں دلوں کی پکار ہے ویزا
ملکوں کے سچ دیوار ہے ویزا
شادی کا دارودار ہے ویزا
ملے اس نے ایسا کسی کو سہارا

اس دیرا نے کتنے گھروں کو سنوارا
کتنے لوگوں کا کھیل اس نے بگاڑا
سپنوں کے گلشن کو اس نے لتاڑا
درخشاں بنی چونالہ

مہکتی ملیاں

..... ہٹ دھرمی پھیکے مشروب کی طرح ہوتی
ہے یہ ناپ کو پتہ نہ دے اور نہ دہلے کو۔

..... پتہ ستائیں باتوں سے تو ہوتی ہیں
جبکہ کچھ باتیں کتابوں میں ہی اچھی لگتی ہیں انہیں سچ
ثابت کرنے میں وقت ضائع مت کریں۔

..... برے وقت کو اپنے وقت پر ہی گزرنا
ہے۔ آپ کے چیتے چائے کا کوئی فائدہ نہیں اور نہ
ہی کوئی فرق پڑے گا۔

..... غلطی قابل معافی ہو سکتی ہے لیکن اگر
اس غلطی پر اڑا اور اترا یا جائے تو اسے معاف نہیں کیا
جاسکتا۔

..... مزا تو تب ہے جب شام ڈھل رہی ہو
اور آپ کے اندر سورج طلوع ہو رہا ہو۔

..... طیبہ شیریں کوری خدا بخش
دوستی

ایک بچے کا دوست سمندر میں ڈوب کر مر گیا۔ وہ
روز سمندر کنارے جاتا اور کھڑا ہو جاتا۔ ہر آہ میں
اور اس کے پاؤں بھگو کر چلتی جاتیں اور وہ روتے
روتے سمندر سے کہتا۔

”کتنے بھی پاؤں چھولو! مگر میں تمہیں کبھی معاف
نہیں کروں گا“

ایس عطار یہ بارہ قطعہ

FOREVER ہوتم

میرادل جگر LIVER KIDNEY ہوتم
وقت بے وقت جو ہو جائے وہ FEVER ہوتم

ڈوب کر مر جاؤں جس میں RIVER ہوتم
میرے جیون میں اب تو FOREVER ہوتم
مہر گل کراچی

اچھی بات

تکلیفوں سے مت گھبراؤ کہ تکلیفیں انسان کو
سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔ سوچنے سے انسان انسان بناتا
ہے اور انکی انسان کو جینے کے قابل بناتی ہے۔
(جان پیٹرک)

..... دعا زبدا ما بائمی فی سما با
..... اور جدید

..... مہنوں نے نیلی سے تے کے بے
ہستاری کے بھیج میں جانا کیسور دیا ہے کیونکہ اب وہ
اپنا موبائل استعمال کرتا ہے۔

..... رانجھے نے بھینس چرانا چھوڑ دی ہیں
یونکہ اب بیلے نے ملک چیک کا استعمال کرنا
شروع کر دیا ہے۔

..... بچوں نے آسن کی خاطر ترقی میں
جانا پڑ دیا ہے یونکہ اب وہ بھولی جہاز سے غمگین
ہے۔

..... سوتنی نے ہینڈوال سے تے کے بے
گھرے پر بیٹھ کر جانا چھوڑ دیا ہے کیونکہ اب اس
کے باپ نے موبائل خرید کر دی ہے۔

..... فریاد نے شیریں کی خاطر پہاڑ کاٹنا
چھوڑ دیا ہے کیونکہ اب وہ یہ کام بلڈوزر اور بلاسٹنگ
کی مدد سے کر لیا کرتا ہے۔

درخشاں بنی چونالہ

اچھی باتیں

..... پسند محبت اور عشق میں بہت فرق ہوتا
ہے۔ پسند بدلتی رہتی ہے، موڈ کے حساب سے محبت
بہت سی چیزوں سے ہو جاتی ہے مگر عشق صرف ایک

..... دوستی سے ہو سکتا ہے نہ ایک سے نہیں۔
..... یادیں انسان کی بہترین دوست ہیں
..... دنیا کی کوئی طاقت انہیں جدا نہیں کر سکتی۔

..... کسی کے دل پر زبان سے زخم لگانے
سے پہلے سوچ لیں ہو سکتا ہے ان کا درد ساری عمر دور
نہ ہو سکے۔

..... جو شخص برائی کا نقصان نہیں جانتا وہ
اس کے واقع ہونے سے نہیں بچ سکتا۔

..... فتنہ انگیز سچائی سے مصحت آمیز جھوٹ
بہتر ہے۔

..... فرح بہ قریشی ملتان
نعمتین غزلیں

..... مصروف رہتے ہیں دن رات اوکاڑہ والے
کرتے ہیں دلوں پہ راج اوکاڑہ والے
بے تابی دل کا اندازہ کسی اور کو ہوتا ہی نہیں
سمجھتے ہیں دلوں کے جذبات اوکاڑہ والے
قاتل ہے عشق یہ جانتے ہوئے بھی
کرتے ہیں اس پہ اعتبار اوکاڑہ والے
دنیا لاکھ مطلب کی سہی پھر بھی
یاروں کے ہیں یار اوکاڑہ والے
بے وفا ہے دنیا تو بے وفا ہی سہی
مدتوں سے ہیں وفا دار اوکاڑہ والے
راشدہ شریف چوہدری اوکاڑہ

..... ہائے رے سادلی!
جب جوتے بچنے والے کی تنخواہ ٹیچر کی تنخواہ سے
زیادہ ہوگی تو سمجھ لو کہ اس قوم کو تعلیم کی نہیں جوتوں کی
ضرورت ہے۔

(پروف۔ دتا موچی ایم ایس سی جوتیا لوجی)
زمین احسن زین فیصل آباد
چاند

..... بڑا فریب دیتا ہے!
..... نمدی کا پانی.....!
..... اس میں عکس اترتا ہے!
..... پوندکا!

..... اور چاند ہی تو تیرا چہرہ ہے!
..... صغیرہ وقار..... مقام نامعلوم
..... دوستی

..... انسانیت نے ہزاروں برس پہلے
پہاڑوں کی بلندی..... لہروں کا ترنم..... پہلوں
کا تبسم..... کلیوں کی معصومیت..... فشتوں کی
پائین کی اور..... دنیا کے خلوص کو تجا کر کے جس
مقدس رشتے کو جنم دیا اس کا نام ہے دوستی!

..... فرید شہیر شاہ مندر

..... اقتبان

..... اپنی آنکھوں میں وہ خواب کی صورت بن گئی
..... پرانے دن کی امید نہ ہو اور جو ٹوٹ کر لڑھکیوں کی
..... طرح تمہارے دل کو لہو لہیان کر دیں اگر بھی ایسے
..... خواب سچا بھی لو تو ان کو فوراً تعبیر کی شکل دے دو کیونکہ
..... تعبیر ملنے کے بعد اتنا دکھ نہیں ہوتا جتنا تعبیر ملنے سے
..... پہلے خوابوں کے ٹوٹ جانے کا.....!

..... میر ب چونالہ

..... عید کا دن

..... میرے وطن میرے بچن کے نصیب میں
..... اے میرے رت دو جہاں
..... عید کے دن میں لکھو
..... خوشی امن محبت اخوت
..... اور خوش حالی.....!!

..... شگفتہ خان..... بھلاوال

..... شگفتہ خان..... بھلاوال

..... شگفتہ خان..... بھلاوال

..... شگفتہ خان..... بھلاوال

..... شگفتہ خان..... بھلاوال

لیکن آخر کار مل ہی گیا۔ ٹائٹل رول کچھ خاص پسند نہ آئی۔ ”حمد و نعت“ سے استفادہ کر رہے تھے کہ زویا خان اور مسز شہزاد نے روک لیا تو ملیوہ ساحر اور غزالہ زکریا نے کہا اوروے جناب ہم بھی ہیں۔ سب کا تعارف بہت اچھا تھا۔ میرا شریف طور کا تو نام دیکھ کے ہی دل خوش ہو گیا۔ کہانی بہت اچھی جا رہی ہے۔ تفصیلی تبصرہ قسط کے اختتام پہ کروں گی۔ سلسلہ وار ناول اچھے جارہے ہیں۔ فیس نے اور ناول بھی پسند آئے۔ ”بیاض دل“ میں غزل ملک بشری باجوہ طیبہ نذیر اسرار سے عرفان، گل ہما خواجہ عرفانہ کا انتخاب پسند آیا۔ ”یادگار لکھنے“ کو شہسپاں بشری ملک صدف سلیمان ازینب احسن، تمیزہ کوثر نے یادگار بنالیا۔ آسرا گل کی پسند لا جواب تھی بقیہ سب لکھنے والوں نے بھی ”آج کل چاند“ کو ستاروں سے بھر دیا۔ میری پریوں کو یعنی سمیرا شریف طوطہ سدرہ اسلم ندائلمر امید پودری، سومیا شہنشاہ کو سائبرہ مبارک ہو۔ اوکے اب اپنی پیاری سی دوست کو اجازت دیں خدا حافظ۔

طیبہ سعیدی، سیالکوٹ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! کبھی ہیں شہنا آپی اینڈ دیگر اشاف! امید کرتی ہوں آپ سب کے سب اچھے ہوں گے یعنی ٹھیک ہوں گے۔ آج کل میں ان شاء اللہ عزوجل باقاعدگی سے شرکت کرتی ہی رہوں گی اور بہت جلد فسانہ بھی تھکواؤں گی ان شاء اللہ عزوجل انارز یہ کول نازی لی! آپ کی والدہ محترمہ کیسی ہیں؟ اللہ عزوجل انہیں صحت کاملہ عطا فرمائے آمین ثم آمین۔ اب آتی ہوں میں آج کل کی طرف! آج کل کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ آج کل تنہائی میں ایک بہت ایسا سا تھی ہے۔ سب سے پہلے اپنا خط پڑھا، شاعری ڈھونڈی لیکن آپ نے شائع ہی نہیں کی کیوں جی؟ آپ سب کو دیگر اشاف اور ذبیہ قرین کو بہت بہت عید مبارک ہو خوشیوں اور دعاؤں بھری۔ اتراتی آپ نے تو بہت کمال سردیاں میں تو پچھلی دفعہ پریشان ہی ہوئی کہ طفعل کے منہ سے جھاگ کیسے؟ اس کے بعد ”نا کوثر کو پڑھا۔ وہ بھی زبردست تھا۔ پھر نازی جی کو پڑھا انہوں نے تو کمال ہی کر دیا ہاں! بہت اچھا نازی جی! ”در پہچان دھوپ چھلکوں۔“ وغیرہ۔ ”جی“ تحریریں بہت اچھی تھیں۔ مجھے آج کل کی یہ بات بہت اچھی لگتی ہے کہ اس میں معیاری کہانیاں ہوتی ہیں۔ سمیرا شریف حور کا ناول کچھ خاص پسند نہیں آیا۔ بس سوسوی تھا۔ چودھری باقی سب سلسلہ بھی زبردست تھے۔ اب اجازت دیں اگلے وقت تک کے لیے۔ اللہ عزوجل آج کل اور اس سے وابستہ لوگوں کو ذبیہ ساری کامیابی و کامرانی عطا فرمائے آمین ثم آمین خدا حافظ!

صائمہ شاہ سرگودھا۔ تمام آج کل اشاف کو محبت بھرا سلام۔ اس محفل میں پہلی بار شرکت کر رہی ہوں مایوس مت کیجیے گا۔ نومبر کا شمارہ 27 تاریخ کو ملا۔ سروسق مجھے خاص پسند نہیں آیا جہاں تک کہانیوں کی بات ہے تو وہ ساری ہی زبردست ہوتی ہیں لیکن مجھے سب سے زیادہ ”اور پھر خواب“ پسند ہے۔ مجھے لگ رہا ہے کہ اپنا کچھ لکھنے ضرور امین کی ممانعت آتی ہیں اب میرا اندازہ کس حد تک درست ہے یہ تو اگلے مہینے ہی بتا پتہ کا۔ باقی کا سارا آج کل بھی زبردست تھا۔ اب اجازت دیں اللہ حافظ۔

تاخیر سے موصول ہونے والے خط:-

راہجہ تاکہ لاہور۔ شہنشاہ سلیم کراچی۔ محمد عظمیٰ عذر اشرقی ڈی جی خان۔ نادیہ یا مین قریشی۔ عابدہ نسیم چیچہ وطنی۔ حرا فاطمہ چیچہ وطنی۔ صبا الیاس چوکن نوالی۔ نجم انجم کراچی۔ گل زمان گل مان۔ طیبہ نذیر شاہ یوال۔ جرات۔ سیدہ نازی زین منڈی بہاؤالدین۔ انجم خان بری پور ہزارہ۔ سیدہ فرست کاظمی قصبہ نکائی۔ طیبہ حیرہ کاؤں حیدر۔ دہ باغی فیصل آباد۔ جانا چکوال۔ صوفیہ صدیق چیچہ وطنی۔ اقرا انصاف ڈیپال پور۔ پروین انصاف شہین بہاول نگر۔ ناکملہ اشفاق کوٹ ٹانہ۔ محمد ذریعہ رول فیصل آباد۔ تمیزہ نذیر دیشنی۔ فریحہ شمیر شاہ تلہ زر زنیہ وہ۔ س۔ نگر۔ صدف سلیمان شہر کوٹ۔



حسرت کا پہلا آنے

ہما احمد

dkp@aanchal.com.pk

بہت پیاری قارئین اور مصنفین کے نام ذبیہ قرین اور مصنفین! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! امید ہے آپ سب اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے خیر و عافیت کے ساتھ رہیں گی۔ میرے ناولٹ ”گہر ہونے تک“ کو پسند کرنے پر آپ تمام بہنوں کا بے حد شکریہ خاص طور پر علیزہ حیدر راجہ اکرم انجم خان، نبیلہ خان، مون ماریہ اقران، شائلہ یا سمین، ثمرین، ثناء و قار اور فریحہ شمیر کا جن کے خوب صورت الفاظ نے میرا سروں خون بڑھایا۔ مجھے ایک مرتبہ پھر اللہ کی خصوصی رحمت اور محبت کا شدت سے احساس دلایا۔

میری پہلی کتاب ”دیار عشق“ کی اشاعت پر جب کئی نام دروازہ نے انتہائی فراخ دلی کے ساتھ میری تحریر کی تعریف کی تو میں حیرانی سے سوچتی تھی کہ میری تحریر میں تو کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے کہ اس کی اس قدر تعریف کی جائے اور میں آج بھی حیرانی سے یہی سوچ رہی ہوں کہ میری تحریر اتنی تعریفوں کی اہل کب تھی؟ جس قدر تعریف و توصیف سے آپ لوگوں نے نوازا ہے۔ ڈیر راجہ اکرام اور انجم خان آپ کی دعاؤں نے تو ممنون کر دیا ہے۔ بلکہ مقروض جی ہاں۔ میرے خیال میں دعا سب سے اہم چیز ہے جو ایک انسان دوسرے کو دیتا ہے۔ آئندہ بھی دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ آپ سب کو دنیا و آخرت کی لا تعداد کامیابیوں سے نوازیں۔ جو چیز ہم دوسروں کو دیتے ہیں وہ اس سے کہیں زیادہ ہمیں اللہ کے خزانوں سے ملتی ہے اس لیے دوسروں کو خوشیاں اور آسائیاں دیں تاکہ آپ کو بھی یہ چیزیں فراوانی سے ملیں۔ ڈیر سمیرا شریف طوطا آپ کو میرے خط اور کتابوں نے خوشی دی میرا مقصد پورا ہو گیا۔ آپ یقین کریں گی میں آپ کے لیے بہت فکر مند رہی اور دعا گو بھی

کیونکہ میرے لیٹر کے جواب میں کوئی کال یا ایس ایم ایس بھی موصول نہیں ہوا اور ڈائجسٹ سے بھی غائب تھیں آپ۔ اللہ کا شکر ہے کہ آپ ٹھیک ہیں معذرت کے ساتھ ایک بات کہنا چاہوں گی کہ قارئین کی ڈھیروں محبتوں اور دعاؤں کے جواب میں آپ کے خط کا یہ جملہ ”مجھے نہیں پتا کہ اپریل میں لکھے خط میں ایسا کون سا ہم بلا سٹ ہوا تھا کہ قارئین کا رد عمل اس قدر شدید حیران کن تھا۔“ اور پھر خط کا مجموعی تاثر عجیب سا لگا۔ قارئین کو تو جانے محسوس ہوا یا نہیں لیکن سچ میں مجھے تو ایک لمحے کے لیے یوں محسوس ہوا جیسے ہم سب بوقوف تھے جو آپ کے لیے فکر مند تھے۔ ورنہ بقول آپ کہ آپ کے خط میں تو ایسی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ شاید ایسا ہی ہو۔ خطی اس لیے لکھی ہو کہ بہت سارے لوگوں کے لیے نیکیاں لکھی تھیں۔ ہمیشہ خوش رہیں اور خوشیاں پھیلا لیں۔ نازیہ کنول نازی! آپ کی والدہ کی صحت کاملہ کے لیے دل کی گہرائیوں سے دعا گو ہوں اور امید کرتی ہوں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے فضل و کرم سے اب و آخرت یاب ہوئی ہوں گی۔

آج کل فرینڈز کے نام السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! دعا ہے کہ آپ سب خیر و عافیت سے ہوں آمین۔ پیاری نادیہ فاطمہ رضوی! ہم آپ کو بھولے نہیں ہیں۔ دعاؤں میں ہمیشہ یاد رکھتے ہیں۔ بس کاغذ قلم سے ناطا آج کل تقریباً ختم سا ہو کر رہ گیا ہے۔ آپ بھی دعاؤں میں ہمیں یاد رکھا کیجیے اور ہاں ہمارے تمام ”آج کل“ فرینڈز اور قارئین کو ہم بتاتے چلیں کہ نئی زندگی کے لیے ہمیں آپ سب کی ڈھیروں دعاؤں کی ضرورت ہے پلیز ہمیں اچھی صحت اور اچھے مستقبل کی دعا ضرور دیجیے گا جزاک اللہ۔

دوسری خبر یہ ہے کہ ہماری پانچویں کتاب ناول کی ”چلو چاہت بھائیں ہم“ اگست میں مارکیٹ میں آگئی ہے خریدیں پڑھیں اور اپنی آراء سے نوازیں مزید دو کتابیں بھی ان شاء اللہ جلد مارکیٹ میں دستیاب ہوں گی۔ ڈیر سویت رومان ملک دھڑکن بلوچ مسز نازیہ عابد ظلم

میں نے سوچا تھا عید آئے گی
زندگی کی اداس راہوں میں
میں بھی خوشیوں کے گیت گاؤں گی
آرزو کے دیئے جلاؤں گی
اور جی بھر کے مسکراؤں گی
عید آئی بھی اور چلی بھی گئی!
میں تو خوشیوں کے گیت گانہ سکی
آرزو کے دیئے جلاؤں گی
اور پھسکی سی اک انہی کے سوا
میں بالکل بھی مسکرا نہ سکی
میں نے سوچا تھا عید آئے گی

قل چھتے تھے کبھی سنگ کی دیوار کے بیچ
اب تو ٹھٹھلنے لگے مقتل بھرے بازار کے بیچ
اپنی پوشاک کے چھن جانے پہ افسوس نہ کر!
مرسلات نہیں رہتے یہاں دستار کے بیچ
سرخیاں امن کی تلپٹیں میں مصروف رہیں
حرف بارود اگلنے رہے اخبار کے بیچ
جس کی چوٹی پر بسایا تھا قبیلہ میں نے
زلزلے جاگ پڑے ہیں اسی گہسار کے بیچ
کاش اس خواب کو تعبیر کی مہلت نہ ملے
شعلے جلتے مجھے نظر آئے ہیں گلزار کے بیچ
ڈھلتے سورج کی تمازت نے بکھر کر دیکھا
سرکشیدہ میرا سایہ صدف اشجار کے بیچ

رزق ملبوس مکان سانس مرض قرض دوا
منقسم ہو گیا انسان انہی افکار کے بیچ
دیکھے جاتے تھے نہ آنسو میرے جس سے محسن
آج ہنستے ہوئے اسے دیکھا ہے اغیار کے بیچ
سیدہ نسبت زہرا کی پسند..... کمرہ ڈپکا

ایسے چپ ہیں کہ یہ منزل بھی کڑی ہو جیسے
تیرا ملنا بھی جدائی کی گھڑی ہو جیسے
اپنے ہی سائے سے ہر گام لرز جاتا ہوں
راستے میں کوئی دیوار کھڑی ہو جیسے
کتنے ناداں ہیں تیرے بھولنے والے کہ تجھے
یاد کرنے کے لیے عمر پڑی ہو جیسے
تیرے ماتھے کی شکن پہلے بھی دیکھی تھی مگر
یہ گرہ اب کے میرے دل میں پڑی ہو جیسے
منزلیں دور بھی ہیں منزلیں نزدیک بھی ہیں
اپنے ہی پاؤں میں زنجیر پڑی ہو جیسے
آج دل کھول کے روئے ہیں تو یوں خوش ہیں فراز
چند لمحوں کی یہ راحت بھی بڑی ہو جیسے
اربیہ شاہ کی پسند..... بہاولپور

تم ہر گریزاں ہو
میں صحرا کی مانند ہوں
دوبوند جو برسو گے بے کار میں برسو گے
ہے خشک بہت مٹی ہر سمت بگولے ہیں
صحرا کے بگولوں سے اٹھتے بھی تو شعلے ہیں
تم کھل کے اگر برسو تو صحرا میں گلستاں ہو
بریم سے کہیں کیسے تم لہ گر پزاں ہو
جل تھل جو اگر کردو تن من میں کی بھر دو
ہے خشک بہت مٹی پوری جو کی کردو
پھر تم کو بتاؤں گی تم میری محبت ہو
فریدہ جاوید فری کی پسند..... لاہور

کبھی اس طرح مجھے پیار دو
دل مضطرب کو قرار دو
جو دبے دبے جذبات ہیں

انہیں لفظ دو اظہار دو
تیرے خواب سے نہ ہو سرخرو
میری آنکھ کو وہ خار دو
میرے کاندھے پر سر رکھ کے تم
ہر بوجھ دل کا اتار دو
تیری زندگی میں رہوں سدا
چاہے جیت دو چاہے ہار دو
تیرے بن غزل کی اوقات کیا
اگر چھوڑنا ہے تو مار دو
زیب احسن زینبی کی پسند..... فیصل آباد

کوئی ہم نہیں ایسا ملے
میرے درد کی جو دوا کرے
نہ ہو مجھے تلاش کسی اور کی
نہ وہ رہ سکے سوائے میرے
میری آنکھ میں ہے تیرا عکس
شب چاند میں یہ کہا کرے
میرا چاند جب میرے ساتھ ہو
تو وہ شب کبھی نہ ڈھلا کرے
میری زندگی میرا عکس ٹو
تیری ہر نظر یہ کہا کرے
تیرے بن نا مجھ کو نصیب ہو
وہ سانس جو جفا کرے
مریم جبین کی پسند..... نکال

کب ہوئی پیار کی برسات ہمیں یاد نہیں
خوف میں ڈوبی ملاقات ہمیں یاد نہیں
ہم تو مدہوش تھے اتنا اس کی چاہت میں
اس نے کب چھوڑ دیا ساتھ ہمیں یاد نہیں
زندگی جبر مسلسل کی طرح کالی ہے
جانے کس جرم کی پانی ہے سزا یاد نہیں
میں نے پلکوں سے دریا پر دستک دی ہے
میں وہ ساحل ہوں جسے کوئی صدا یاد نہیں
آؤ اک سجدہ کریں عالم مدہوشی میں

لوگ کہتے ہیں کہ ساگر کو خدا یاد نہیں
کرن وفا کی پسند..... کراچی

"دسمبر"

اسے کہنا دسمبر لوٹ آیا ہے

ہوا میں سرو ہیں اور.....!

وادیاں بھی ڈھند میں گم ہیں

پہاڑوں نے برف کی شال پھر سے

اوڑھ رکھی ہے!

کبھی راستے تمہاری یاد میں پر غم

سے لگتے ہیں

جنہیں شرف مسافت تھا

وہ سانس کا رُز و رُف تو وہ چھوٹی سی ڈائری

وہ چائے جو ہم نے ساتھ میں پی تھی

تمہاری یاد دلاتی ہے

تمہیں دلاس دلاتی ہے

اسے کہنا کہ دسمبر لوٹ آیا ہے

"دسمبر" لوٹ آیا ہے

تم بھی لوٹ آؤ نا

تہینہ کوثر کی پسند..... ملایانی

تیری یادوں کے سہارے دسمبر گزر گیا
لگے یار نہ ہم کنارے دسمبر گزر گیا
تمہاری نگاہوں کی تپش نہیں ملی
اکیلے ہی ٹھہرتے دسمبر گزر گیا
اس سال بھی دکھوں کا بھر پور ساتھ رہا
انہی دکھوں کو سمیٹتے دسمبر گزر گیا
کئی ساتھ چھوٹے اب کے برس
کئی گھروں کو بکھیرتے دسمبر گزر گیا
لفظ ایک دسمبر میں تیرا ساتھ چلا
اسی کو دہراتے دسمبر گزر گیا
اب ایسے بھی نکٹیں گے صائم کئی سال
جیسے سفر میں دسمبر گزر گیا

کتنے چھلکے

شاملہ کاشف

فرخندہ فیض..... گنگ چن

س: کیا زندگی میں سنبھلنے کے لیے ٹھوکر کھانا ضروری ہے؟

ج: بعض کو ٹھوکریں کھا کر ہی عقل آتی ہے

کوئی پتھر تو سر راہ پڑا رہے دو

س: آپ! اکثر حسیناؤں کے شوہر حضرات گنجے کیوں ہوتے ہیں؟

ج: تم حسیناؤں کے شوہروں کو دیکھتی ہی کیوں ہو؟

س: ساس کو ماں کیسے بنایا جاسکتا ہے؟

ج: ماں کو دشمن سمجھنا شروع کرو۔

سمر! سمیرا! آمنہ..... کھڑیا نوالہ

س: آپ! بتائیے ذرا ہر ماہ کس چیز کا انتظار ہوتا ہے؟

ج: یا تو تنخواہ کا یا آنچل کا۔ ٹھیک ہے نا۔

س: شعر کا جواب شعر میں دیں۔

وہ کر رہے تھے اپنی وفاؤں کا تذکرہ

دیکھا ہمیں تو پہلو بدل کر رہ گئے

ج: ہم کو ان سے وفا کی ہے امید

جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

انعم خان..... ہری پور ہزارہ

س: شاملہ آپ! لوگوں کو پیا کی یاد آتی ہے۔ ذرا بتائیں تو بھی بھولے سے آپ کو میری یاد آتی؟

ج: تم سب ہمارے دل میں رہتی ہو اس لیے یاد کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

س: شاملہ آپ! لڑکیاں آپ سے پوچھتی رہتی ہیں کہ اگر دوست دھوکہ دے تو کیا کرنا چاہیے۔ مگر میرا سوال ہے کہ اگر دوست مخلص ہو اور ہم سے دھوکا کھا جائے تو ہمیں نہیں اُسے کیا کرنا چاہیے؟

ج: جب جرم تسلیم کر لیا تو اپنی سزا بھی خود ہی تجویز کرو۔

س: آپ! موت برحق ہے اور زندگی؟

ج: ایک جیتی جاگتی حقیقت۔

س: بھبر وڑ کو سنو ایک بات متاؤ اجازت دو کیا انگلی بار آنے کی اجازت ہے؟

ج: آپ سو بات آئیں۔ چشم مارو شن دل ماشاء۔

آسیا شرف..... گنگاپور

س: کیا زندگی واقعی درد میں ڈوبی ہوئی شہنائی ہے؟

ج: زندگی میں کوئی بھی دور مستقل نہیں رہتا۔ غم و خوشی کا امتزاج ہے زندگی۔

س: آپ! کیا ہر دکھ کا اظہار آنسو بہانے سے ہوتا ہے؟

ج: جو آنسو دل میں رہتے ہیں وہ آنکھوں میں نہیں رہتے

بہت سے لفظ ایسے ہیں جو لفظوں میں نہیں رہتے

س: ہمارے لیے دوسروں کو سمجھنا مشکل ہے۔ یا خود اپنے آپ کو؟

ج: کبھی کبھی دوسروں کو اور کبھی خود اپنے آپ کو۔

فضا یونس..... گنگاپور فیصل آباد

س: زندگی اور امید کا تعلق کتنا گہرا ہے؟

ج: امید زندگی کی روح ہے۔

س: زندگی میں خوشی کا عرصہ کم کیوں ہوتا ہے؟

ج: کسی دانش ور نے کہا ہے کہ خوشی دو غموں کے درمیان آنے والے وقفے کا نام ہے۔

اقصیٰ فوزیہ عربیلا..... فیصل آباد

س: اسلام ٹیکم! آپ! کیا حال ہے میرا؟

ج: ہم سے ہمارا حال پوچھا کرو۔ تمہارا حال تم خود جانو۔

س: آپ! اگر میں آپ کی بڑی بہن ہوتی تو؟

ج: تو ہم آپ کی چھوٹی بہن کہلاتے۔

س: آپ! ہم نے آنچل میں اپنا نام پڑھا۔ ہم اتنا اچھلیں اتنا اچھلیں پھر.....؟

ج: جھٹک کر بیٹھ گئیں ہے نا!

س: یونس افضل شاہین..... بہاول نگر

س: سرخ آنکھیں چلاتی زبان چلتا منہ اور گھن چکر قدموں کو روکنے کا کوئی طریقہ بتائیں؟

ج: دماغ کو ٹھنڈا رکھو۔ یہ سب غصہ کی علامتیں ہیں۔

طیبہ نذیر..... شاد یوال گجرات

س: آپ! مرد کے دل کا راستہ معدے سے ہو کر گزرتا ہے۔ عورت کے دل کا راستہ کہاں سے ہو کر گزرتا ہے؟

ج: مرد کی جیب سے۔

س: سب لوگ کہتے ہیں کہ جس کا کوئی دشمن نہیں اس کا کوئی دوست بھی نہیں ہو سکتا۔ کیا واقعی؟

ج: لوگ غلط کہتے ہیں۔ سب کو دوست رکھا کرو۔

س: آپ! جی! اچھی سی دعاؤں کے ساتھ رخصت کریں۔

ج: جیتی رہو خوش رہو آباد رہو۔

س: آپ! جانی! محبت کرنے والے کم نہ ہوں گے

لیکن.....؟

ج: آنچل کی محفل میں پھر بھی ہم ہی ہوں گے تم بے فکر رہو۔

س: آپ! سنا ہے لوگ اسے آنکھ بھر کے دیکھتے

ہیں بھلا کس کو؟

ج: گلی میں آنے والے سبزی فروش کو ہے نا!

س: چاروں موسم آئے گئے لیکن ہماری آنکھوں

میں بس ایک موسم ٹھہر کے رہ گیا ہے۔ بتائیے کون سا؟

ج: پانچواں موسم انتظار کا ٹھیک کہانا!

مہرین سجاد..... سکھر

س: آپ! محبت میں تیرے سر کی قسم ایسا ہی ہوتا ہے بھلا کیا؟

ج: شوہر اتوار کے اتوار گھر کے کپڑے دھوتا ہے۔

س: ایسا! آپ کی محفل میں اتنی سنگ باری ہے تب بھی آپ تروتازہ کیسے رہتی ہیں؟

ج: وہ سنگ باری نہیں محبت کے پھولوں کی برسات ہے۔ چشمے کا نمبر بدل کے دیکھو۔

س: ایسا اگر لوگوں میں منافقت نہ ہوتی تو کیا ہوتا؟

ج: ہم سب تجربات سے محروم رہتے۔ منفی رویے تو انسان کو سبق دیتے ہیں۔

س: ایسا! آپ کو کیسے لوگ اچھے لگتے ہیں؟

ج: صاف دل نیک سیرت محبت کرنے والے جیسی تم سب ہو۔

تعبیر جہاں..... جلال پور پیر والا

س: ایسا! چاند کو دیکھیں تو لگے ٹکس اسی کا بتائیں کس کا؟

ج: وہی جو ہر سال گرمیوں میں گنجے ہوتے ہیں۔

س: آپ! جی! جب دل اداس ہو تو کیا کرنا چاہیے؟

ج: دل کو ڈانٹو اور خوش رہا کرو۔

س: آپ! جی! اگر محبت بازار میں سیل پر لگ

جائے تو؟

ج: اف خدا! پھر تو لوگ منوں کے حساب سے خرید کر گھر لے لیں۔

س: ایسا جی! آپ چل کی ٹائٹل گرل ہمیں ہمیشہ آپ جیسی کیوں لگتی ہے؟

ج: آنکھوں پر محبت کی عینک لگا کر جو دیکھتی ہو۔ زندگی کڑیا..... پیروں وال

س: آپ جی شعر مکمل کریں۔ محبت اب نہیں ہوگی یہ کچھ دن بعد میں ہوگی۔

ج: گزر جائیں گے جب یہ دن یہ ان کی یاد میں ہوگی۔

س: اپنا جانی! صبر + شکر + توکل =؟

ج: خوش گوار خوب صورت زندگی۔ آپ جی! آپ کے بارے میں سوچوں تو دل شاد ہوتا ہے؟ سب مسکرا نے لگتے ہیں اور آنکھیں چمک اُٹتی ہیں؟

ج: اللہ تعالیٰ تمہیں ایسے ہی ہنستی مسکراتی رکھے۔ خوش رہو۔

س: اپنا! دل کے آنگن میں پت جھڑ کے بعد؟

ج: کچرا ہی کچرا نظر آتا ہے جناب۔ صائمہ اسحاق علی..... کراچی

س: آئی! زندگی اور دنیا آپ کی نظر میں کیا ہیں؟

ج: اللہ کی دی ہوئی نعمت اور دنیا ایک امتحان گاہ۔

س: آپ جی! مای شوہر اور ساس میں کیا چیز مشترک ہے؟

ج: تینوں ہی صبر کا امتحان لیتے ہیں۔

س: اپنا! اب ہم آپ کو کیسے بتائیں کہ ہمیں پھر ”وہ“ ہو گیا ہے بھلا کیا؟

ج: ڈسٹکی بخار جلدی سے علاج کرواؤ اور پچھروں سے دور رہو۔

جو یہ یہ ضیاء..... ملیر کراچی

س: السلام علیکم! پیاری آلی شائلہ کیسی ہیں آپ؟

ج: وعلیکم السلام! الحمد للہ بالکل ٹھیک۔

س: آپ جی میں تنہائی میں کسے یاد کرتی ہوں؟ اپنی دوستوں کو یا آپ چل کو؟

ج: آپ چل کو۔

س: آپ جی پھول سوگھنے کے لیے توڑتے ہیں دل کس لیے توڑتے ہیں؟

ج: دوبارہ جوڑنے کے لیے۔

س: اگر محبت بازار میں فروخت ہو تو انسان کتنی بار خریدے گا؟

ج: محبت دل میں ہوتی ہے بازار میں نہیں۔

فریش ایور..... عیسیٰ خیل

س: سلام آئی آپ کو پتا ہے میں نے اپنا ٹک فریش ایور کیوں رکھا؟

ج: وعلیکم السلام! نہیں۔

س: آئی ٹرک بھیج رہی ہوں ملتے ہی فوراً اس میں بیٹھ کر عیسیٰ خیل آ جانا۔ آپ سے ملنے کو دل کر رہا ہے؟

ج: راستے بند ہیں نہیں آ سکتے۔

س: جاری ہوں ارے ہمیشہ کے لیے نہیں پھر آؤں گی؟

ج: شکر ہے گئیں۔

ج: شکر ہے گئیں۔

کاکے باتیں

حنان احمد

آزمودہ ٹوٹکے

☆ مکھن میں ٹھنڈا اور گرمی کے دنوں میں ایک خاص قسم کی ناگوار بو آ جاتی ہے اس سے بچنے کے لیے اس میں دھنیے کے چند پتے ڈال دیں۔ مکھن کو جب ابالیں یا پکھلائیں تو بعد میں اسے چھان لیں۔

☆ اچار کو تیار محفوظ رکھنے کے لیے ایک چھوٹی سی پلاسٹک کی تھیلی میں تھوڑی سی بینگ اچھی طرح بند کر کے جار کے اندر ڈال دیں اس طرح اچار خراب ہونے سے محفوظ رہے گا۔

☆ پنیر سے بنی ہوئی اشیاء میں اگر تھوڑا سا سرسوں شامل کر لیا جائے تو کھانے کی خوش بو میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔

☆ جوتے سے پاؤں میں پڑنے والے آبلوں پر اگر انڈے کی سفیدی لگائیں اور خشک کی تیز ہوا میں اسے فوراً خشک کر لیں تو یہ جلد ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ گلیسرین بھی مفید رہتی ہے۔

کچھ اچھے ٹوٹکے

☆ صابن کی ٹکیوں کے ریپر پھیکیں نہیں انہیں اپنے جوتوں کے ریک میں رکھ دیں۔ جوتوں اور موزوں کی بو سے گھر محفوظ ہو جائے گا۔

☆ باورچی خانے یا غسل خانے کے سنک یا واش بیسن کو چمک دار بنانے کے لیے اسے کھل طور پر پیپر ٹپکنس (ٹشو) سے ڈھک دیں اس پر کچھ بوندیں پانی کر ایک چمچہ پلچنگ پاؤڈر ڈال کر

آدھا گھنٹا چھوڑ دیں۔ اس کے بعد ٹشو پیپر سے واش بیسن کو گرٹیں۔ بیسن یا سنک چمک اٹھے گا۔

☆ اسٹین لیس اسٹیل کے برتنوں سے اسٹیکر نہ چھوٹ رہے ہوں تو اس حصے کو اندر کی طرف آگ کے شعلے پر رکھیں اور اسٹیکر کو چھیل کر نکال لیں۔ آسانی سے اسٹیکر نکل جائیں گے۔

☆ شہد جام یا مارملیڈ وغیرہ کی شیشیاں اگر کھل نہ رہی ہوں تو ان کے ڈھکن کو تھوڑا آگ پر گرم کریں آسانی سے کھل جائیں گے۔

☆ پنیر کو زیادہ عرصے محفوظ رکھنا ہو تو اسے ہلکے سر کے یا سرکہ ملے پانی میں بھیکے نیکپن میں لپیٹ کر رکھیں۔ عرصے تک تازہ رہے گا۔

☆ گندھے ہوئے آٹے کو محفوظ رکھنا ہو تو اسے دودھ کے صاف خالی پیکٹ میں رکھ کر فریج میں رکھیں۔ کافی دیر تک یہ آٹا روٹیاں بنانے کے کام آسکے گا۔

☆ ادنی کپڑے دھوتے وقت ایک چائے کا چمچ گلیسرین ڈال کر دھوئیں۔ کپڑے سکڑیں گے نہیں اور اپنی شکل برقرار رکھیں گے۔

☆ لباس میں مٹن ٹانگنے کے بعد دھاگوں پر ایک بے رنگ نیل پالش ٹکا دیں۔ مٹن آسانی سے ٹوٹیں گے نہیں۔ بچوں کے کپڑوں میں اس عمل کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔

☆ سردیوں میں اکثر ہونٹ پھٹ جاتے ہیں۔ تازہ کچا دودھ ہونٹوں پر روزانہ لگانے سے آرام آ جاتا ہے۔

☆ سردیوں میں پاؤں کی ابرٹیاں پھٹ جائیں تو گلیسرین میں دیسی صابن کے ٹکڑے ڈال کر پھٹی ہوئی جلد میں بھر دیں۔ سوئی جرابیں پہن کر رات کو سو جائیں۔ اگلے روز پاؤں دھولیں۔ کئی روز رات

کو یہ ٹوٹکا دہرائیں۔ پھٹی ہوئی ایڑیاں بالکل ملائم ہو جائیں گی۔

﴿ شہد میں اد رک ملا کر چبانے سے گلا ٹھیک ہو جاتا ہے اور بند آواز کھل جاتی ہے۔

﴿ پچلی آرہی ہو تو لوٹک کھالیں یا چٹکی بھرنمک کھالیں یا دوسیکٹ کے لیے سانس روک لیں۔

﴿ قبوہ میں لیموں نچوڑ کر پینے سے تھکاوٹ دور ہو جاتی ہے۔

﴿ دانت کے درد کے لیے درد کے مقام پر لوٹک رکھنا یا لوٹک کا تیل روئی پر لگا کر رکھنا بہت کارآمد نسخہ ہے۔

﴿ کارن فلور دودھ میں ملا کر پیسٹ بنالیں اور چہرے پر لگائیں۔ ہفتے میں دو بار یہ کرنے سے رنگ گورا ہونے لگے گا دھوپ سے جھلکی ہوئی جلد بھی ٹھیک ہو جائے گی۔

﴿ چاول اور دال اگر زیادہ لے کر اشاک کر لیے جائیں تو کیرا لگ جاتا ہے۔ اگر دو یا تین تیز پات ڈال دیں تو کیرا نہیں لگے گا۔

﴿ اکثر ٹیص دھلنے کے بعد اس کا کار پوری طرح صاف نہیں ہوتا۔ اس کے لیے ٹیص دھونے سے پہلے تھوڑا سا شیپو کار پر لگا کر گڑیں پھر ٹیص دھولیں کار بالکل صاف ہو جائے گا۔

﴿ اکثر لوگوں کو سفر کے دوران چکر اور مٹلی کی شکایت ہوتی ہے۔ اس سے بچنے کے لیے سفر شروع کرنے سے پہلے سوٹھ کا سفوف دو یا تین چٹکی لے کر پھانک لیں۔ اس شکایت میں یہ بہت مفید ہوتا ہے۔

﴿ اگر بچن کینٹ میں لال بیگ ہو جائیں تو تھوڑا سا سرف ایکسل ایک شاپر میں ڈال کر اور اس کا منہ کھلا چھوڑ کر کینٹ میں رکھ دیں دو تین

دن بعد تمام لال بیگ اس شاپر میں آرام فرماتے ملیں گے۔

﴿ کپڑوں پر اگر بال پوائنٹ کا دھبہ لگ جائے تو جہاں لگا ہو اس کپڑے کے نیچے اخبار رکھ کر دھبے پر تھنر روئی میں بھگو کر دیں۔ دھبہ پھیل کر اخبار میں جذب ہو جائے گا پھر کپڑے کو اچھی طرح دھولیں۔

﴿ اگر چھری جھج جھسی چیزوں پر زنگ لگ جائے تو میٹھا سوڈا سرکہ اور وم یا جس چیز سے بھی برتن دھوتے ہیں ان تینوں کا ملغوبہ ساینائیں اور برتنوں پر لگا کر ایک دو گھنٹے کے لیے چھوڑ دیں اور پھر پانی سے دھولیں۔ زنگ سے نجات مل جائے گی۔

﴿ شوگر کا مرض اب عام ہو گیا ہے۔ اس کے لیے ڈاکٹری نسخے کے ساتھ اگر ہفتے میں تین بار کھانے کے تین چمچے کریموں کا رس نکال کر پی لیا جائے تو اس عمل سے مریض کو کافی فائدہ ہوگا اور شوگر کنٹرول میں رہے گی۔

﴿ تازہ ترین خبر ہے کہ وہ مریض جو دل کے مرض میں مبتلا ہیں انہیں چاہیے کہ وہ سورج مکھی کا تیل باقاعدگی سے استعمال کریں یہ تیل خون میں کو لیسٹرول کی سطح کو کم کرنے کے لیے اہم کام سر انجام دیتا ہے۔

﴿ شیشے کے برتنوں میں چمک لانے کے لیے انہیں کسی بھی واشنگ پاؤڈر سے دھو کر جب کھنگالیں تو پانی میں دو چمچ سرکہ ملا لیں۔ اس طرح برتنوں میں چمک آ جائے گی۔



تندرستی صحت

لبا بہ احمد

خصوصی افراد..... خصوصی توجہ چاہتے ہیں

معذوری سے نبرد آزما ہونے کے لیے بڑے عزم و حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ لوگ جو خوش قسمتی سے خود کسی معذوری میں مبتلا نہیں ہیں معذور افراد کی پریشانیوں اور مسائل کا محض احساس ہی کر سکتے ہیں اندازہ نہیں۔ دوسری طرف معذور افراد کو بے کار سمجھنا بھی صریحاً غلط ہے کیونکہ اگر معذور افراد اپنی اہمیت اور قدر و قیمت کا انداز کر لیں تو اپنے آپ کو نہ صرف عام فرد کی طرح محسوس کریں گے بلکہ انہیں کسی قسم کا احساس کمتری بھی نہیں ہوگا۔ دنیا میں بے شمار ایسے افراد ہیں جنہوں نے اپنی معذوری کو مجبوری نہیں بننے دیا اور ایسے کام کر کے دکھائے کہ صدیوں بعد بھی ان کے موجود ہونے کی گواہی مل رہی ہے۔ ہیلن کیلر نے جو ایک نابینا خاتون تھیں۔ ”ریڈیم“ ایجاد کر کے دنیا کو حیران کر دیا۔ اسی طرح مشہور ایجاد کنندہ ایڈسین بھی بلب سمیت متعدد چیزوں کا موجد ہے حالانکہ ایڈسین بھی قوت سماعت سے محروم شخص تھا۔ یاد رہے وہ پیدائشی طور پر معذور نہیں تھا بلکہ ایک جھگڑے کے دوران قوت سماعت کھو بیٹھا تھا۔

معذور افراد کے ساتھ ہمارا رویہ ہمدردانہ اور دوستانہ ہونا چاہیے۔ ہمیں اپنے عمل سے ان کو یہ احساس نہیں دلانا چاہیے کہ وہ کسی طرح بھی ہم سے کم تر ہیں کیونکہ ایسے افراد عام لوگوں کے مقابلے میں زیادہ حساس ہوتے ہیں ذرا سی ٹھیس سے ان کے دل ٹوٹ جاتے ہیں اور وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ان پر ”تس“ کھایا جا رہا ہے لہذا ان کے ساتھ عمومی

نوعیت کا ہمدردانہ جذبہ رکھنا چاہیے جیسا کہ ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ روا رکھتا ہے۔ اس حوالے سے ایک اور المیہ یہ ہے کہ لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں کا معاملہ خاصا مختلف ہوتا ہے اگر لڑکیوں میں کسی قسم کی کوئی کمی یا نقص رہ جائے تو والدین اسے دوسروں سے حتی الامکان چھپاتے ہیں کہ مبادا بچی کی بیماری یا معذوری کا سن کر لوگ حد سے زیادہ ہاتھ نہ بنانے لگیں اور پھر پہلی فکر جو انہیں ہو جاتی ہے وہ یہ کہ کہیں آگے چل کر بچی کے رشتے میں شدید مشکلات نہ پیش آئیں۔ والدین کو اس قسم کا رویہ اپنا کر بچی کی جسمانی بیماری کے ساتھ ذہنی بیماری کو بھی مد نظر رکھتے ہوئے تمام کیفیات کو معالج کے سامنے رکھنا چاہیے تاکہ اگر کسی قسم کے بروقت علاج سے بچی کی بھرپور نگہداشت ممکن ہو تو ایسا کر لیا جائے۔

معذور افراد کی ذہنی اور جسمانی تربیت کے لیے ملک بھر میں خاصے ادارے کام کر رہے ہیں مگر ایسے اداروں کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے جو اپنے وسائل کے اندر رہتے ہوئے ممکنہ حد تک معذور افراد کی تربیت کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ ملک کے سب سے بڑے شہر کراچی کی مصروف شاہراہ پر واقع آئی ڈار یو (IDA-REIU) کا شمار بھی ایسے ہی ادارے میں کیا جاسکتا ہے جو جسمانی عوارض کے شکار افراد کی خلوص اور تندہی سے خدمات کی فراہمی میں مصروف ہیں۔ آئی ڈار یو کے قیام کے پس منظر میں جائیں تو پتا چلتا ہے کہ 1920ء کے عشرے میں ریوسندھ کے کمشنر تھے اور آئیڈا ان کی اہلیہ تھیں۔ آئیڈا سماجی خدمات انجام دینے والی خاتون تھیں اور غریبوں اور ناداروں کی بہت امداد کیا کرتی تھیں۔ بنیادی طور پر وہ ایک نرس تھیں۔ اس زمانے کا سندھ انتہائی پسماندہ تھا۔ ذرائع نقل و حمل میں اونٹ گاڑی، نیل گاڑی جب کہ سفر کے لیے گھوڑا گاڑی استعمال کی جاتی تھیں۔ آئیڈا 1921ء میں نواحی علاقے میں